
رنگا رنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ جریدہ
ماہنامہ
نئے افق
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ابتدائیہ

سچی کہانیاں

مغربی ادب سے انتخاب

مستقل سلسلے

021-35620771/2 — 74200 — 874
[illegible]

دستک

مشتاق احمد قریشی

سیاسی ہوا کا تازہ جھونکا.....!!

تحریک انصاف کی گڈی چڑھ رہی ہے۔ اہم شخصیات جن میں سابقہ وزراء اور بیوروکریٹس بھی شامل ہیں دھڑا دھڑ تحریک انصاف کا حصہ بن رہے ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ معروف، غیر معروف شخصیات کا ایک بڑا سیاسی میلہ لگ رہا ہے۔ کل کیا ہوگا؟ اللہ جانے" لیکن بظاہر آثار ایسے ہی نظر آرہے ہیں۔ جس تیزی سے عمران خان کی گڈی اونچی چڑھ رہی ہے ان کے مخالفین کی نیندیں حرام ہو رہی ہیں۔ وہ طرح طرح کی باتیں بنا رہے ہیں۔ کوئی کہہ رہا ہے یہ تمام مفاد پرست موقع پرست لوگ عمران خان کے جلسوں کو دیکھ دیکھ کر ان کی طرف دوڑ پڑے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی اس معیار پر پورا نہیں اترتا جس کا ڈھنڈورا عمران خان صاحب بجاتے پھر رہے ہیں۔ اگر غور کیا جائے اور سوچا جائے تو سیاست جس چڑیا کا نام ہے اس میں وہی لوگ کامیاب و کامران رہتے ہیں جو بھیڑ کو چیر کر آگے بڑھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جو وقت پر وقت کے مطابق فیصلے کرتے ہیں وقت کے مطابق چلتے ہیں اور جو لکیر کے فقیر بنے رہتے ہیں وہ لکیر ہی پیٹتے رہ جاتے ہیں اور سیاست تو نام ہی موقع پرستی کا ہے۔ سیاست کی اپنی اخلاقیات ہیں جس طرح کہتے ہیں کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے ایسے ہی کہہ سکتے ہیں کہ سیاست اور اقتدار میں سب جائز ہے پھر یہ کہ جو لوگ ماضی کو نظر انداز کرتے ہوئے حال بلکہ مستقبل پر نظر رکھتے ہیں وہی صاحب نظر سیاست میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اب پرانے سیاست دان یا سیاسی بازی گران جو آزمائے لوگوں پر طنز و تنقید کر رہے ہیں جو انہیں پیچھے چھوڑ کر ایک قدم آگے بڑھ کر عمران خان کے ہم جولی بن رہے ہیں۔ بقول ان کے نزدیک عمران خان کی جماعت میں شامل ہونے والے موقع پرست مفاد پرست ہوسکتے ہیں لیکن یقیناً وہ تمام لوگ ایسے باصلاحیت ضرور ہیں جو وقت کی نبض پہچانتے ہیں اور ہوا کے رخ پر چلنا جانتے ہیں۔ یقیناً ایسے ہی لوگ وقت کے ساتھ چلنا بھی جانتے ہوں گے۔ کہنے والی زبانیں کچھ کہتی رہیں جن کے ہاتھ اقتدار کے گھوڑے نہیں آتے وہ انہیں کھٹا ہی کہتے ہیں وہ کسی طرح مطمئن ہی نہیں ہوتے جب تک کہ خود اقتدار حاصل نہیں کر لیتے اور جب اقتدار حاصل کر لیتے ہیں تو وہ جس کرسی پر کرسی نشین ہوتے ہیں وہ ان سے پہلے جانے والوں کی ہی کرسی ہوتی ہے جو انہیں ورثے میں ملتی ہے اقتدار کی ہر کرسی کے اپنے اصول اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ جب کوئی کرسی نشین ہوتا ہے تو کرسی اسے اپنے پھندے میں جکڑ لیتی ہے۔ اس کے اپنے اصول اور طریقہ کار ہوتا ہے۔ یہ زبانی کلامی انقلاب لانے والا جب کرسی نشین ہوتا ہے تو وہ اپنی چوکڑی بھول جاتا ہے اور وہ وہی کرنے لگتا ہے جو اس کرسی کا تقاضہ ہوتا ہے کرپشن بدعنوانی تو اسے اس کرسی کے ساتھ ورثے میں ملی ہوتی ہے وہ کوئی نئی بات یا نیا کام نہیں کرتا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اب نئی جماعت جو نئے عزم و حوصلے کا اعلان ہی نہیں کر رہی اظہار بھی کر رہی ہے کیا کرتی ہے کیا کر کے دکھاتی ہے کہیں علی بابا چالیس چور والی کہانی نہ دہرائی جائے۔ کچھ بھی کسی سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والوں کا کہنا ہے کہ وطن عزیز میں جو سیاسی جمود جو سیاسی گھٹن طاری ہو چکی تھی تحریک انصاف اس گھٹن زدہ ماحول میں تازہ ہوا کا جھونکا محسوس ہو رہا ہے۔ ایک ایسے ماحول میں جب پرانے سیاسی شکاری ناکام و نامراد ہو رہے ہیں ایسی فضا میں اگر عمران خان نیا جال لے کر میدان میں اتر رہے ہیں تو ہوسکتا ہے کہ ملک کی واقعی تقدیر بدلنے والی ہو اور کوئی معجزہ رونما ہونے والا ہو کیونکہ اللہ مسبب الاسباب ہے جب وہ موسیٰ علیہ السلام کے جانی دشمن سے ان کی پرورش نگہداشت کرا سکتا ہے اور خود وطن عزیز میں ایک شراب کے رسیا سے شراب پر پابندی لگوا سکتا ہے تو اس رب کائنات کے لیے تو سب کچھ ممکن ہے وہ جو چاہے جس طرح چاہے کر سکتا ہے۔ وہ قادر مطلق ہے ہوسکتا ہے کہ اس قادر مطلق نے وطن عزیز کے لیے اب کوئی بہتری کا راستہ بھلائی و فلاح کا راستہ کھول دیا ہو۔ اللہ ہمارے وطن عزیز کی حفاظت فرمائے اور ہر قسم کی سیاسی اخلاقی مذہبی گندگی سے وطن عزیز کو پاک صاف فرمائے آمین۔ ہوسکتا ہے کہ عمران خان کی جماعت تحریک انصاف سیاسی ہوا کا تازہ جھونکا ہی ثابت ہو۔

گفتگو

عمران احمد

> **حدیث نبوی ﷺ**
>
> [illegible]

عزیزانِ محترم —— سلامت باشد!

نئے سال کا دوسرا شمارہ حاضرِ مطالعہ ہے۔ امید ہے آپ کے معیار پر پورا اترے گا۔

آج کل ہر طرف مہنگائی کا دور دورہ ہے۔ [illegible] کسی زمانے میں موت سستی [illegible]

[illegible]

محمد ارشاد قریشی —— اسلام آباد [illegible]

[illegible]

محمد فائق عباسی —— سنجرپور [illegible]

[illegible]

[illegible] 0308-2677737 [illegible]

وسلمی بٹ —— از حسن ابدال [illegible]

[illegible]

محمد اسلم جاوید —— فیصل آباد [illegible]

عبدالحکیم ساجد —— منچن آباد [illegible]

WWW.PAKSOCIETY.COM

[illegible]

سید عبد اللہ شاھد — حیدرآباد

[illegible]

[illegible]

WWW.PAKSOCIETY.COM

[illegible]

[illegible]

محبت اقبال عین — منگلا ڈیم

[illegible]

جاوید اقبال وڑک ۔۔۔ سرگودھا جناب ایڈیٹر صاحب سے دل فرق کرتی۔ السلام علیکم امید ہے کہ بخیریت ہوں گے۔ آپ کا ادارہ ہر کی دقت بہت اچھا ہوتا ہے اور بڑے اخلاق سے آپ جواب دیتے ہیں اب وجاہت بخش دی۔ اس کی تحریری کے لیے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ (۱) کہانی کا سب کا آغاز کیا ہوا اس میں ان مثالی کی عمران سیریز کو ناول ہر ماہ شائع ہوتا تھا۔ قارئین بہت ذوق شوق سے پڑھتے تھے لیکن اب عرصہ دراز سے یہ سلسلہ ختم کر دیا گیا ہے۔ آپ ہر ماہ ابن صفی کا عمران سیریز کا مکمل ناول شائع کریں تاکہ قارئین پہلے کی طرح بھی اور یقین کریں کہ صرف اس سے آپ کے رسالے کی سرکولیشن بہت بڑھ جائے گی۔ (۲) ہر ماہ پاکستان کے کسی مشہور مقام یا جگہ یا کسی سلسلے کو منتخب کر کے اس کی تفصیل دیا کریں تاکہ قارئین کو معلومات ہو سکیں۔ (۳) کوئی ایک سلسلہ مزاحیہ بھی ہو۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ کے اس رسالے میں قارئین کی دلچسپی میں بہت اضافہ ہوگا۔ خاص کر ابن صفی کا ناول ہر ماہ ضرور دیا کریں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس رسالے کو دن دگنی رات چوگنی ترقی دے۔

نذیر محمد بخش لنگاہ ہمراہ حسنین و ثقلین صابر لنگاہ ۔۔۔ خانیوال رقم طراز ہیں: عزیزی عمران احمد، ایڈیٹر اور قریشی صاحب خدا کرے آپ سب خیریت سے ہوں اور دعا ہے کہ اللہ آپ کو ترقی دے۔ آمین۔ نئے سال 2012ء کا شمارہ جب ہاتھ میں آیا تو بڑی خوشی ہوئی۔ دعا کرتے ہیں کہ آپ اپنے اخلاق اور پیارے مصطفین کو اللہ پاک اپنی امان میں رکھے۔ کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ تمام لکھنے والوں کو مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ گفتگو کا آغاز عمران صاحب نے کیا اور پھر خطوط کے آغاز میں جن کی پسند کو شرف حاصل کیا۔ محترم عبید اللہ صاحب نے صادق آباد سے بہت خوب صورت انداز میں تبصرہ کیا۔ آپ کی جانب سے دل خوش کر دیا۔ سلام محبت۔ اور محترم آپ کو بھی، پیارے ہر چیز اچھی لگی۔ اللہ آپ کو بھی دعا کی ہدایت دے۔ صاحب نے اچھا تبصرہ کیا، محمد ادریس صاحب، بہت اچھا لکھا اور آپ کی حاضری بھی ہمارے دل خوش ہوا۔ محترم ارشد قریشی صاحب بہت ہی اچھا تبصرہ کیا۔ صاحب نے اپنی محفل میں اچھا لکھا۔ صاحب آپ کی محفل میں اور شعر بھی خوب تھے۔ اس وقت سامنے کوئی نظر آتی ہے تو ہر محفل ہمیں اچھی لگی۔ حسین قمر صاحب نے دل خوش کر دیا اپنی محبت سے۔ اللہ پاک آپ کو اور تمام اہل قلم کو خوش رکھے۔ اقتباس اور خطوط کے علاوہ سبھی کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ ہم قارئین کی اشاعت کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ "گفتگو" اور "خوشبو" سبھی بہت اچھے لگے۔ اللہ آپ کو مزید ترقی دے۔ سلسلہ وار کہانیاں بھی بہت خوب رہیں۔ کہانی بہت دلچسپ رہی، ہم سب کو دلی سلام اور دعائیں قبول ہوں۔ آخر میں آپ سب کے لیے دعا گو ہیں۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔ آمین۔

سے پیش کرتے آ رہے ہیں۔ جلیلہ جہاں صاحبہ کی تحریر نے دل خوش کر دیا۔ بزرگ اقبال بھائی جناب ابن اقبال صاحب اور عبدالحق صاحب کے منظوم کلام نے محفل میں خوب رنگ جمایا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مزید ترقی عطا فرمائے۔ "بیت المقدس" کی تیسری قسط بہت اچھی لگی۔ محترم آپ کی تحریر بہت پسند آئی۔ آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ تمام کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی خوب رہا۔ محترم مشتاق خالق صاحب کے قلم سے بھی کہانی بہت اچھی لگی۔ گفتگو میں کی گئی بات ہمیں پسند آئی۔ سلام و آداب۔

محمد عبید اللہ عاطر ۔۔۔ منگلا کینٹ محترم جناب عمران قریشی صاحب سلام مسنون امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو صحت و تندرستی عطا فرمائے۔ جیسے حالات ہیں ویسا ہی لکھا ہے۔ پہلے صفحات پر ہی گفتگو میں بہت خوب صورت انداز میں لکھا گیا۔ بہت سے دوستوں نے بہت اچھا لکھا۔ "قرآن" میں احادیث کا بیان بہت اچھا تھا۔ ہماری مشرقی روایات کے متعلق تحریر بہت خوب تھی۔ کہانیاں سب کی سب اچھی تھیں۔ اقبال کے شاعری کے حوالے سے بات ہو رہی ہے۔ "کوثر" کی تحریر خوب صورت تھی۔ آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے اور آپ سب کے لیے دعا ہے۔

شمیم جمال ۔۔۔ لطیف آباد ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔ اس سے پہلے میں نے تحریر ارسال کی تھی مگر شائع نہیں ہوئی۔ کہانی بہت اچھی تھی۔ اس شمارے میں شامل ہوتی ہے۔ اس ماہ میں نے اپنے ساتھ گزرے ہوئے واقعے کی تفصیل اور سچی کہانی ارسال کی ہے۔ اس کے علاوہ ایک غزل بھی بھیج رہی ہوں۔ امید ہے کہ شائع کریں گے۔ میں 2 جنوری 2011 کی رات اپنے گھر سے گزری تھی جس کے نتیجے میں بہت نقصان ہوا۔ جس کی وجہ سے میں بیمار رہی اور مجھے تکلیف بھی ہوئی۔ اب میں ٹھیک ہوں اور آپ سے گزارش ہے کہ میری کہانی اور غزل شائع کر دیں۔ محترم مسلم صاحب اور تمام ساتھیوں کا بہت شکریہ۔ آپ سب کی محبت اور دعاؤں کی وجہ سے میں اس قابل ہوئی۔ "بیت المقدس" کے علاوہ سبھی کہانیاں اچھی تھیں۔ تمام قارئین کو سلام، اور دعا ہے کہ اللہ آپ سب کو اپنی امان میں رکھے۔ آمین۔

[illegible]

ترتیب: طاہر قریشی

ایفائے وعدہ اور وعدہ خلافی:۔

وعدہ کرکے پورا کرنا درحقیقت سچائی ہی کی ایک عملی قسم ہے اور وعدہ خلافی ایک طرح کا عملی جھوٹ ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اخلاقی تعلیم میں وعدہ خلافی سے بچنے اور ہمیشہ وعدہ پورا کرنے کی بھی سخت تاکید فرمائی ہے۔

پہلے وہ حدیث گزر چکی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند اچھے اخلاق کا ذکر کرکے فرمایا کہ:۔ جو شخص ان باتوں کی پابندی کی ذمہ داری لے میں اس کے لیے جنت کا ذمہ لیتا ہوں۔ اور ان میں آپ نے ایفائے وعدہ کو بھی گنایا۔

اور "کتاب الایمان" میں "شعب الایمان" کے حوالے سے حضرت انسؓ کی وہ حدیث گزر چکی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ:۔ جو شخص اپنے کیے عہد کا پابند نہیں اس کا دین میں کوئی حصہ نہیں ۔۔۔ اب چند حدیثیں اس سلسلے کی یہاں اور بھی درج کی جاتی ہیں۔

(۲۱۳)

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔ منافق کی تین نشانیاں ہیں:۔ جب بات کرے تو جھوٹ بولے وعدہ کرے تو اس کو پورا نہ کرے اور جب اس کو کسی چیز کا امین بنا دیا جائے تو خیانت کرے۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) قریب قریب اسی مضمون کی ایک حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے "کتاب الایمان" میں بھی گزر چکی ہے اور وہاں پوری تفصیل سے بتایا جا چکا ہے کہ ان باتوں کے منافق کی نشانی ہونے کا کیا مطلب ہے ۔۔۔ وہاں کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ جھوٹ، خیانت اور وعدہ خلافی دراصل یہ منافقوں کے اخلاق ہیں اور جس شخص میں یہ بری عادتیں موجود ہوں وہ خواہ عقیدہ کا منافق نہ ہو لیکن عمل اور سیرت میں منافق ہی ہے۔

اسی حدیث کی صحیح مسلم کی روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں۔ "ان صلی وصام وزعم انہ مسلم" یعنی وہ آدمی اگرچہ نماز پڑھتا ہو اور روزہ رکھتا ہو اور اپنے کو مسلمان بھی کہتا اور سمجھتا ہو پھر بھی ان بداخلاقیوں کی وجہ سے وہ ایک قسم کا منافق ہی ہے۔

بہرحال اس حدیث میں وعدہ خلافی کو نفاق کی نشانی اور ایک منافقانہ خصلت بتلایا گیا ہے۔

(۲۱۴)

(ترجمہ) حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:۔ وعدہ بھی ایک طرح کا قرض ہے۔ (لہٰذا اس کو ادا کرنا چاہیے۔)

(معجم اوسط للطبرانی)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کو کچھ دینے کا یا اس کے ساتھ کوئی سلوک کرنے کا یا اسی طرح کا کوئی اور وعدہ کیا گیا ہے تو وعدہ کرنے والے کو چاہیے کہ وہ اس کو اپنے پر قرض سمجھے اور اس کو پورا کرنے کی فکر کرے ۔۔۔ لیکن اگر بالفرض کسی برے کام میں ساتھ دینے کا یا کسی اور ایسے کام کے کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے جو شرعاً صحیح نہیں ہے یا اس سے کسی دوسرے کی حق تلفی ہوتی ہے تو اس وعدہ کا پورا کرنا ضروری نہ ہوگا بلکہ اس کے خلاف ہی کرنا ضروری ہوگا اور اس وعدہ خلافی میں کوئی گناہ نہ ہوگا۔ بلکہ اتباع شریعت کا ثواب ہوگا۔

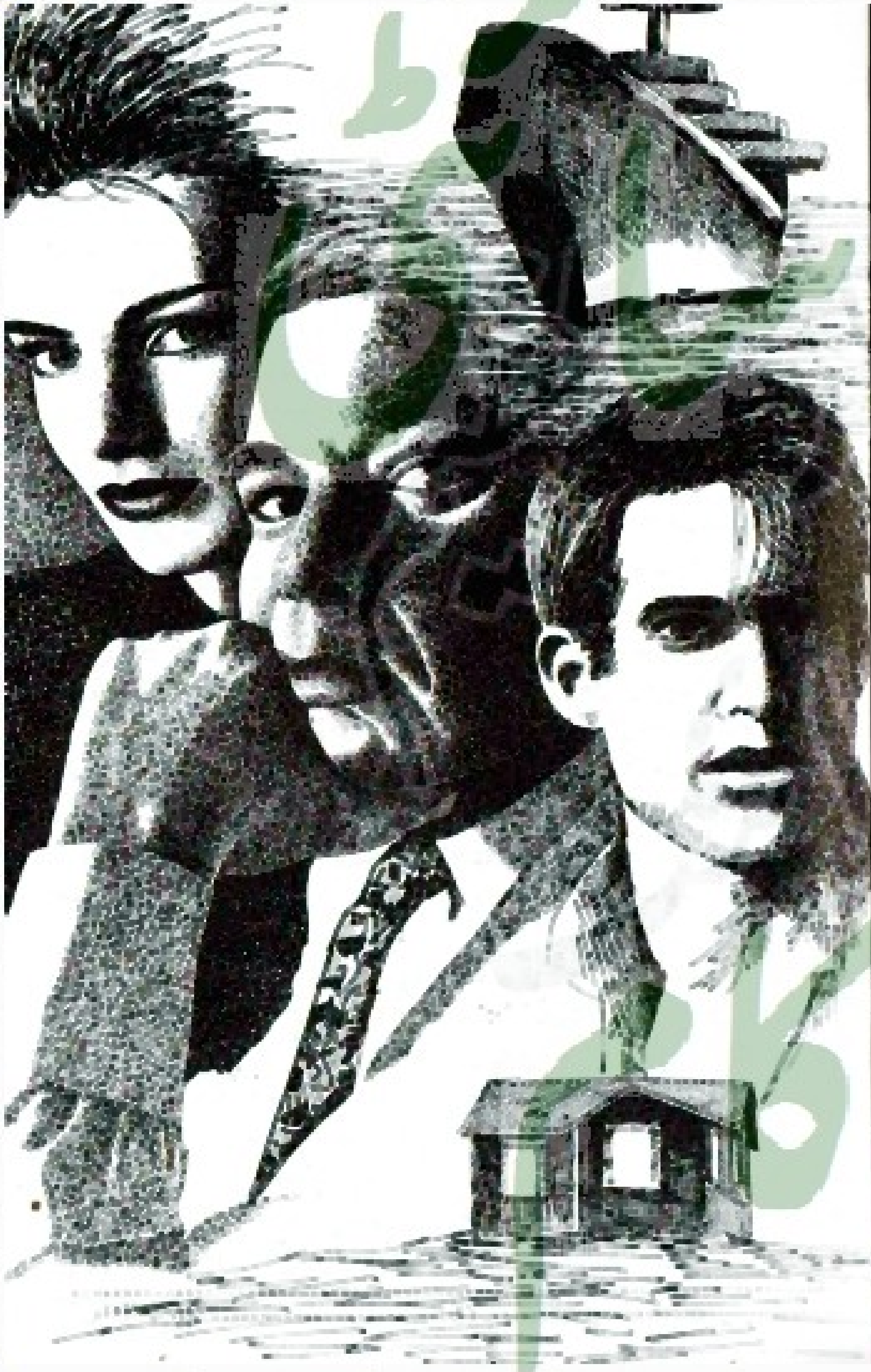
(۲۱۵)

(ترجمہ) عبداللہ بن ابی الحمساء سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے (یعنی آپ کے نبی ہونے سے پہلے) آپ سے خرید و فروخت کا ایک معاملہ کیا (جس کی بنا پر مجھے دینا تھا) اس کا کچھ حصہ تو میں نے وہیں دے دیا اور کچھ ادا کرنا باقی رہ گیا تو میں نے آپ سے وعدہ کیا کہ میں اسی جگہ لے کر آتا ہوں پھر میں بھول گیا اور تین دن کے بعد مجھے یاد آیا (میں اسی وقت لے کر پہنچا) تو دیکھا کہ آپ اسی جگہ موجود ہیں آپ نے فرمایا کہ:۔ تم نے مجھے بڑی مشکل میں ڈالا اور بڑی زحمت دی میں تمہارے انتظار میں تین دن سے یہیں ہوں۔

(سنن ابی داؤد)

(تشریح) گویا نبی ہونے سے پہلے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وعدہ کی ایسی پابندی فرماتے تھے کہ تین دن تک ایک جگہ رہ کر ایک شخص کا انتظار فرماتے رہے ۔۔۔ واضح رہے کہ وعدہ کی اس حد تک پابندی کرنا شرعاً ضروری نہیں ہے (جیسا کہ اس کے بعد والی حدیث سے معلوم بھی ہو جائے گا) لیکن اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرت میں جو "خلق عظیم" ودیعت فرمایا تھا اس کا تقاضا یہی تھا۔

(بشکریہ معارف الحدیث از مولانا محمد منظور نعمانی)



بیت المقدس

الماس ایم اے

بیت المقدس مسلمانوں کا قبلہ اول اور وہ شہر ہے جہاں سے مولائے کائنات پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرش بریں کا سفر کیا۔ وہ شہر جو مسلمانوں کو مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے بعد سب سے زیادہ عزیز ہے۔ وہ شہر جو صدیوں سے یہودیوں کے زیر تسلط ہے۔ جہاں کلمہ گو مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا ہے۔ جہاں یہودیوں کے مظالم پر دنیا نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ وہ شہر جہاں مسجد اقصیٰ واقع ہے، جہاں متعدد پیغمبروں اور صحابہ کرام کے مزارات واقع ہیں۔ یہ شہر آج بھی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور کسی صلاح الدین ایوبی کا منتظر ہے۔ یہ شہر کیسے فتح ہوا اور کس طرح اس کا سقوط ہوا آئیے اسی معتبر مورخ اور ادیب الماس ایم اے کی نظر سے دیکھیں۔

[illegible]

نہر سوئز کے متعلق مصر اور برطانیہ میں معاہدہ ہو گیا۔ جس میں برطانیہ نے ۱۹۵۶ء میں مصر سے اپنی فوجیں نکالنے کا معاہدہ کیا۔ اب ملک میں ایک مضبوط حکومت قائم تھی۔ ۱۹۶۷ء میں امریکہ اور برطانیہ کی شہ پر اسرائیل نے مصر پر حملہ کر دیا۔ اردن کو بھی اسرائیل نے نشانہ بنایا۔ پھر اقوام متحدہ کی کوششوں سے جنگ بندی ہوئی۔

مصر کی مشہور شخصیات میں نجیب محفوظ ڈرامہ نویس، مفتی محمد عبدہ، ڈاکٹر طٰہٰ حسین مشہور عالم اسلام کے نام قابل ذکر ہیں۔

۴۔ سوڈان:

انیسویں صدی کے اختتام پر سوڈان میں انگریزوں اور مصریوں کی مشترکہ حکومت قائم ہو گئی۔ ۱۷ نومبر ۱۹۵۸ء تک سوڈان میں پارلیمانی نظام حکومت قائم رہا۔ مگر اسی دن جنرل عبود کی قیادت میں فوجی انقلاب برپا ہوا۔ جنرل نے فوجی حکومت بنا لی جو چھ سال تک قائم رہی۔ پھر چھ سال بعد عوام کی متحدہ کوششوں سے ایک انقلاب برپا ہوا۔ جس نے فوجی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ پھر ۱۹۶۵ء میں امہ پارٹی نے حکومت بنائی اور اسلامی شریعت کو قانون سازی کا اساسی مصدر قرار دیا۔

پھر ۱۹۶۹ء میں یہاں فوجی انقلاب آیا اور جملہ اختیارات انقلابی کونسل نے سنبھال لیے۔ سوڈان نے ۱۹۷۳ء میں تین جنوبی صوبوں کو علاقائی خود مختاری دے دی۔

۵۔ لیبیا:

طرابلس یا لیبیا سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ تھا۔ اٹلی نے ۱۹۱۱ء میں اس پر قبضہ کر لیا۔ دوسری عالمگیر جنگ میں اتحادیوں نے یہ ملک فتح کر لیا اور اس کی قسمت کا فیصلہ اقوام متحدہ پر چھوڑ دیا گیا۔ 1951ء میں اس کے لیے ایک نظام مرتب ہوا جس کی رو سے لیبیا کا نظام موروثی بادشاہت کے ساتھ وفاقی قرار پایا اور یہ ملک اقوام متحدہ کا ممبر بن گیا۔ آزادی کے وقت اس ملک میں دس لاکھ کی آبادی میں صرف چودہ گریجویٹ تھے۔ ۱۹۶۹ء میں کرنل قذافی بادشاہ ادریس کو تخت سے اتار کر خود برسر اقتدار آ گئے۔ انہوں نے برٹش پٹرولیم کمپنی کو قومی ملکیت قرار دیا۔ امریکہ اور برطانیہ کے فوجی اڈوں کا خاتمہ کر

دیا۔ یہ ملک قومی ملکیت بن گئے۔ اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت شروع کی گئی اور ۱۹۷۲ء میں لیبیا اور تیونس کو ملا کر اسلامی عرب جمہوریہ قائم ہو گئی۔ اس وقت یہ ملک اقوام متحدہ کا ممبر ہے۔

۶۔ تیونس:

یہ ملک دراصل سلطنت عثمانیہ کے مقبوضات کا حصہ تھا۔ ۱۸۸۱ء میں اس پر فرانس نے قبضہ کر لیا۔ یہاں کی تمام زرخیز زمینیں فرانسیسی زمینداروں نے آپس میں تقسیم کر لیں۔ دوسری جنگ عظیم میں محوری طاقتوں نے اسے فتح کر لیا۔ پھر جب محوریوں کو شکست ہوئی تو پھر فرانس کا حصہ بن گیا۔ فرانسیسیوں کو کمزور دیکھ کر امریکنوں اور برطانیہ والوں نے یہاں اپنے قدم جما لیے۔ جنگ کے بعد یہاں آزادی کی تحریک شروع ہوئی۔ فرانس نے تشدد کی پالیسی اختیار کی۔ آخر بڑی قربانیوں کے بعد ۱۹۵۶ء میں تیونس کو مکمل آزادی ملی اور اسی سال بادشاہت کا خاتمہ کر کے یہاں جمہوری حکومت قائم ہو گئی۔ پھر ۱۲ جنوری ۱۹۷۴ء کو لیبیا اور تیونس متحد ہو کر "اسلامی عرب جمہوریہ" بن گئے۔

عمار فرحت اور جلال بن عبداللہ تیونس کے مشہور مصور ہیں۔

۷۔ الجیریا:

اس ملک کو الجزائر بھی کہتے ہیں۔ یہاں زیادہ آبادی بربر قوم کی ہے۔ اس ملک پر ۱۸۳۰ء میں فرانس نے قبضہ کیا تھا۔ اس کی آبادی تقریباً ۱۲۵ لاکھ ہے جس میں دس لاکھ فرانسیسی اور پچپن لاکھ مسلمان ہیں۔

۵۷۔۱۹۵۶ء میں فرانسیسیوں اور الجیریا والوں میں بڑے خونریز معرکے ہوئے۔ ۱۹۴۳ء، جنرل ڈیگال نے ایک شاہی اعلان کے تحت الجزائر کو فرانس کا صوبہ قرار دے دیا مگر آزادی کی تحریک شروع ہو گئی۔ ۱۹۶۲ء کے الیکشن میں الجزائر کو ایک آزاد ریاست کا درجہ دے دیا گیا۔ ۱۹۶۳ء میں احمد بن بیلا یہاں کے صدر ہوئے مگر ۱۹۶۵ء میں فوجی انقلاب آیا۔ بن بیلا کو گرفتار کر لیا گیا اور نائب صدر بومدین نے اقتدار سنبھال لیا۔ ان میں سے "ہواری بومدین" ملک کے صدر بن گئے۔

۸۔ مراکش

۱۹۰۴ء میں یہ ملک دو حصوں میں تقسیم ہوا۔ ایک حصہ فرانسیسیوں کے زیر اثر اور دوسرا حصہ اسپین والوں کے زیر اثر تھا۔

۱۹۱۲ء میں اس ملک کے تین حصے ہوئے۔

۱۔ جرمنی ۲۔ برطانیہ ۳۔ فرانس

فرانسیسی مراکش میں ۱۹۳۶ء تک مارشل لاء وتی ریزیڈنٹ جنرل کی حیثیت سے مقیم رہے۔ انہوں نے گیارہ سو میل لمبی ریل کی پٹڑی، سڑکیں، بندرگاہیں اور ہوائی اڈے بنوائے۔ ریزیڈنٹ کے جانے کے بعد وہاں آزادی کی تحریک شروع ہو گئی۔ استقلال پارٹی پر فرانس جبر و تشدد پر اتر آیا تھا۔ یکم مارچ ۱۹۶۲ء کو نیا آئین نافذ ہوا۔

۱۹۷۵ء میں ۳۱ مجرموں کو عام معافی دینے کا اعلان ہوا۔

اس وقت مراکش عرب لیگ، افریقی اتحاد کا ادارہ، اسلامی سیکرٹریٹ اور اقوام متحدہ کا ممبر ہے۔

ملک کی مشہور شخصیتوں میں شاہ حسین اور عبدالکریم خطابی قابل ذکر ہیں۔ خطابی نے فرانسیسی اور ہسپانوی فوجوں کی مزاحمت کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

۹۔ نائجیریا

سترہویں اور اٹھارویں صدی عیسوی میں پرتگیزیوں، انگریزوں اور دیگر یورپی اقوام نے اس اسلامی مملکت میں تجارتی اڈے قائم کیے مگر انیسویں

صدی کے آخر میں برطانیہ نے اس ملک پر یونین جیک لہرایا اور مسلمانوں کی طاقت ختم کرنے کے بعد برطانیہ نے اس ملک میں اپنے انتظامی ادارے قائم کر دیے۔ اب نائجیریا کی وفاقی مملکت تین انتظامی حصوں میں تقسیم ہے۔

موجودہ وقت میں وفاقی جمہوریہ نائجیریا کی ریاست میں تقریباً چھ کروڑ انسان آباد ہیں۔ ملک کی اس آبادی میں ۴۸ فیصد مسلمان ہیں۔ صدر مقام لاگوس ہے۔ اس وقت نائجیریا دولت مشترکہ، افریقی یونین، عالمی قوموں کی انجمن کا ممبر ہے۔

۱۰۔ جبوتی:

۱۸۶۲ء میں فرانسیسیوں نے جبوتی کی سرزمین پر قدم رکھا۔ عفر قبیلے کے سلطان احمد ابوبکر کو معزول کرنے کے بعد انہوں نے اوبوک کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح مشرقی افریقہ میں پہلی فرانسیسی نو آبادی قائم ہوئی۔ وہاں فرانس نے جنوب مشرقی ایشیا کی طرف بحری جہازوں کی روانگی کا مرکز بنایا۔ اٹلی اور برطانیہ کی سیاسی سرگرمیوں کے پیش نظر فرانس نے بہت جلد اوبوک کے علاوہ تاجورہ، خلیج تاجورہ اور دیگر بڑے بڑے شہروں پر قبضہ کر لیا۔

اس ملک کا دارالحکومت جبوتی ہے۔ یہاں سیاسی [illegible] وسائل رکھتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں عوام جھونپڑیوں میں رہتے ہیں جن کا معیار زندگی پست ہے۔ یہ لوگ جاہل اور مفلوک الحال ہیں ان میں انتہائی زندگی بسر کرنے کے آثار نہیں پائے جاتے۔ ان سب کے باوجود یہ لوگ کٹر دیندار مسلمان، سنی اور محب وطن ہیں۔ صحرائی علاقہ ہونے کی وجہ سے ان کی اقتصادی زندگی کا انحصار بندرگاہوں پر ہے۔

جبوتی کے باشندے عیسیٰ اور عفر قبیلوں میں تقسیم ہیں۔ ان میں عیسیٰ ساٹھ فیصد اور عفر چالیس فیصد ہیں۔ ان میں قبائلی عصبیت زوروں پر ہے۔ دونوں قبیلے ملک کے الگ الگ حصوں میں رہتے ہیں۔ یہ لوگ سال میں ایک ہفتہ جشن مناتے ہیں۔ ان دنوں میں یہ ہر قسم کا کھانا کھاتے اور پیتے ہیں۔ ان ایام میں ہر قسم کی کاروباری سرگرمیاں بند کر دی جاتی ہیں۔ ان میں کافی لوگ سرمایہ دار ہیں۔

پایہ تخت جبوتی میں کوکاکولا کی فیکٹری اور آئس فیکٹری کے مالکان ملک کے امیر ترین لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ سربراہ مملکت علی عارف کے خاندان والے بھی کافی مالدار ہیں۔

۱۱۔ صومالیہ:

اس ریاست کا علاقہ بحر ہند اور خلیج عدن کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا ہے۔ اس کا رقبہ ۲۴۶۰۰۰ مربع میل ہے۔ اور آبادی ۳۳ لاکھ ہے۔ یہاں کے لوگوں کا مذہب اسلام ہے اور قومی زبان صومالی ہے۔ مگر تعلیم عربی، انگریزی اور اطالوی زبانوں میں دی جاتی ہے۔ اس ریاست کی آب و ہوا گرم خشک ہے۔ بارش کا اوسط دس انچ ہے۔ زرعی پیداوار مکئی، چاول اور کیلے پر منحصر ہے۔ اور معدنیات میں قلعی اور نمک ہیں۔ ۱۹۵۰ء تک اس ریاست کا نظم و نسق برطانیہ کے ہاتھ میں رہا۔ اس کے بعد دس سال تک اقوام متحدہ اور اٹلی کی زیر نگرانی رہا۔ پھر ۱۹۶۰ء میں جمہوریہ صومالیہ کے نام سے دنیا کے نقشے پر ابھرا۔ جون ۱۹۶۱ء میں یہاں جدید آئین نافذ ہوا۔ پھر جنرل محمد سعید باری فوجی کمانڈر و پچیس ممبروں پر مشتمل انقلابی کونسل کا چیئرمین بنایا گیا۔ ۱۹۷۵ء میں یہاں سوشلزم نافذ کرنے کی کوشش کی گئی۔ ایک قانون پاس ہوا جس کی رو سے سرکاری ملازمین ایک سے زیادہ مکان نہیں رکھ سکتے تھے۔ ڈاکٹروں کو پرائیویٹ پریکٹس سے منع کر دیا گیا۔

اس ملک کا دارالسلطنت "موگادیشو" ہے۔ اس وقت صومالیہ اسلامی سیکرٹریٹ، اقوام متحدہ اور افریقی اتحاد کے ادارے کا ممبر ہے۔

۱۲۔ تنزانیہ:

مشرقی افریقہ کا یہ اسلامی ملک متحدہ جمہوریہ تنزانیہ کے نام سے مشہور ہے۔ رقبہ ۳۶۳۹۵۰ مربع میل ہے اور آبادی ایک کروڑ چالیس لاکھ ہے۔ ملک کی سرکاری زبانیں انگریزی اور سواحلی ہیں۔ ان کے علاوہ دوسری ہندوستانی زبانیں بھی بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ ریاست کا مذہب اسلام اور پایہ تخت "ڈوڈوما" ہے۔

اس ریاست کے تجارتی تعلقات زمانہ قدیم سے ہندوستان اور عرب ممالک سے چلے آرہے ہیں۔ اہل عرب نے یہاں اسلام کی خوب اشاعت کی اور اسلامی حکومت قائم کرلی۔ سولہویں صدی عیسوی میں پرتگیزیوں نے اس ملک سے عربوں کا تسلط ختم کر دیا۔ پھر تھوڑے عرصے کے بعد اہل عرب نے پھر اپنی حکومت بحال کرلی۔ انیسویں صدی میں یہاں جرمنوں کا زور بڑھ گیا اور ۱۸۸۵ء میں اسے جرمنوں کا زیر تحفظ علاقہ قرار دیا گیا۔

پھر ۱۹۱۴ء میں یعنی پہلی جنگ عظیم میں برطانیہ نے یہ علاقہ جرمنوں سے چھین لیا۔ پھر ۱۹۳۶ء میں اس ملک نے اقوام متحدہ کے تولیتی علاقے کی صورت اختیار کرلی۔

اس وقت تنزانیہ دولت مشترکہ اور اقوام متحدہ کا ممبر ہے اور دن بدن ترقی کررہا ہے۔ اس کی مشہور پیداوار لونگ، کپاس اور چقندر ہیں۔ معدنیات میں ہیرے، سونا اور ٹین مشہور ہیں۔ یہاں جہاز سازی، پارچہ بافی، اور المونیم کے برتن وغیرہ کی صنعت ہے۔

۱۳۔ چاڈ:

یہ اسلامی ملک "ری پبلک ڈی چاڈ" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا رقبہ ۴۹۵۸۰۰ مربع میل ہے اور آبادی تقریباً چالیس لاکھ ہے۔ اس میں پچاسی فیصد مسلمان ہیں۔ یہاں کی سرکاری زبان فرانسیسی ہے۔ زرعی پیداوار چاول، کپاس، باجرہ وغیرہ پر مشتمل ہے اور سب سے بڑی معدنی دولت نمک ہے۔

اس ملک پر ۱۹۱۳ء میں فرانس نے قبضہ کرلیا۔ ۱۹۶۰ء میں یہ ریاست خود مختار ہوگئی اور نیا آئین نافذ ہوا۔ ۱۹۶۹ء میں صدر گوچلے نے فرانسیسی فوجوں کی مدد سے ملک میں انتشار ختم کیا۔ اس وقت چاڈ افریقی اتحاد، اقوام متحدہ اور اسلامی سیکرٹریٹ کا ممبر ہے۔

۱۴۔ ماریطانیہ کی اسلامی جمہوری ریاست:

یہ اسلامی ریاست افریقہ کے مغربی ساحل پر واقع ہے۔ اس کا رقبہ سوا چار لاکھ مربع میل اور آبادی بارہ لاکھ ہے۔ اس کا صدر مقام "نواکشوٹ" ہے۔ سرکاری مذہب اسلام ہے لیکن دوسرے مذاہب کو مکمل آزادی حاصل ہے۔ ریاست میں مسلمانوں کی آبادی ننانوے فی صد ہے۔ پیداوار گندم، چاول، جو اور کھجور ہے۔ یہاں مچھلی تیار کرنے، کپڑا بننے اور سمندری پانی کو صاف کرنے کی صنعتیں ہیں۔ یہاں قدیم زمانے میں حبشی اور بربر قوم کے لوگ آباد ہیں۔ اس ملک نے پوری آزادی حاصل کرلی۔ ۱۹۷۲ء میں ماریطانیہ سات قوموں کی اقتصادی انجمن میں شامل ہوگیا۔ ملک کی سرکاری زبان فرانسیسی ہے اور قومی زبان عربی ہے۔

۱۵۔ دولت سعودیہ عربیہ:

دولت سعودیہ عربیہ نجد اور حجاز کے علاقوں پر مشتمل ہے۔ رقبے کے لحاظ سے عرب ممالک میں سب سے بڑی ریاست ہے۔ سعودی عرب تیل کی پیداوار میں دنیا بھر میں پانچویں نمبر پر ہے۔ اس کا رقبہ نو لاکھ مربع میل ہے اور آبادی ایک کروڑ ہے۔ صدر مقام ریاض ہے۔ اس ملک میں سارے مسلمان آباد ہیں۔ ۱۹۱۳ء کی جنگ سے پہلے اس سرزمین پر ترکوں کی حکومت تھی۔ اس جنگ کے دوران ہاشمی خاندان کے ایک فرد شریف حسین نے ترکوں سے بغاوت کرکے اتحادیوں کا ساتھ دیا۔ چنانچہ جنگ کے اختتام پر شریف حسین کو حجاز کا حکمران تسلیم کیا گیا۔ شریف مکہ کی حکومت کا انتظام اچھا نہ تھا۔ چنانچہ حاجیوں کو ان کے ہاتھوں بہت تکلیف اٹھانا پڑتی تھی۔ چنانچہ سلطان عبدالعزیز ابن سعود نے حجاز پر حملہ کردیا اور برطانیہ نے عبدالعزیز بن سعود کو عرب کا حکمران تسلیم کرلیا۔

پھر کئی برس بعد ۱۹۶۴ء میں شرعی طور پر شاہ فیصل کو عرب کا حکمران تسلیم کیا گیا۔ سعودی عرب سے پاکستان کے دوستانہ تعلقات قائم ہیں۔ عرب ریاستیں باہمی اتحاد اور تعاون سے اپنے دفاعی انتظامات کرنے کے قابل ہوگئی ہیں۔ سعودیہ نے ۱۹۷۸ء میں اسرائیل سے ایک معاہدہ کیا جس میں یہ تسلیم کو اسرائیلی ریاست کی نگرانی میں حق خود ارادیت دیا گیا۔ اس پر فلسطینی عربوں نے ۱۹۸۱ء میں انور سادات کو قتل کردیا کیونکہ عمان اور سوڈان کے سوا باقی تمام عرب ممالک نے انور سادات کو غدار قرار دیا تھا۔

عالم اسلام کے سیاسی حالات کے ایک سرسری جائزہ سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ دولت سعودیہ عربیہ کو بین الاقوامی حلقے میں فیصلہ کن اثر و رسوخ حاصل ہے کیونکہ مقامات مقدسہ اس کی تحویل میں ہیں۔ اس لیے اسے تمام عالم اسلام کا روحانی پیشوا ہونے کا فخر حاصل ہے۔

۱۶۔ عرب کی اہم اسلامی ریاستیں:

(ا) عمان:

اس کا پرانا نام مسقط و عمان ہے۔ سولہویں صدی میں اس ریاست کو پرتگیزیوں نے فتح کیا۔ مگر سترہویں صدی میں یہ ریاست ایران کے قبضے میں آگئی۔ پھر ۱۹۵۰ء میں پاکستان نے بندرگاہ گوادر کو آٹھ ملین ڈالر میں خرید لیا۔ اس ریاست کا مذہب اسلام ہے۔ زبان زیادہ تر عربی ہے مگر وہاں اردو، بلوچی اور ہندی بھی بولی جاتی ہے۔

(ب) کویت:

یہ چھوٹی سی ریاست خلیج فارس کے بالمقابل واقع ہے۔ اس کا رقبہ ۶۲۰۰ مربع میل ہے اور ۹۳ فیصد مسلمانوں کی آبادی ہے۔ آب و ہوا گرم مرطوب ہے۔ خاص پیداوار کھجور، پیاز، موتی اور تربوز وغیرہ ہیں۔ یہاں کی صنعتیں سیمنٹ سازی اور فرنیچر سازی وغیرہ ہیں۔ یہ ملک موتیوں کی تجارت کے لیے خاص طور پر مشہور ہے۔ کویت، عرب لیگ اور اسلامی سیکرٹریٹ کی انجمن کا ممبر ہے۔

(ج) یمن:

حضور رسول کریم ﷺ کے زمانے میں یمن کے گورنر باذان نے ۶۲۸ء میں اسلام قبول کیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں یہاں بغاوتیں ہوئیں جنہیں عکرمہ بن ابوجہل اور شرجیل بن حسنہ نے فرو کیا۔ ۱۸۳۹ء میں برطانیہ نے عدن پر قبضہ کرلیا۔ یمن کے حکمران امام احمد کو ۱۹۶۲ء میں قتل کردیا گیا۔ جدید یمن کا مجموعی رقبہ ۱۸۶ مربع میل اور کل آبادی چالیس لاکھ ہے۔ دنیا کا بہترین قہوہ یہاں پیدا ہوتا ہے۔

(د) قطر:

۱۹۱۵ء قطر عثمانی ترکوں کے زیر اثر رہا۔ ۱۹۷۲ء میں قطر نے اپنی آزادی کا اعلان کردیا اور احمد بن علی اس ریاست کے حاکم اعلیٰ بن گئے۔ پھر کچھ عرصہ بعد ان کے چچازاد بھائی خلیفہ بن حماد ثانی نے ان کی جگہ لے لی۔

ریاست کا رقبہ ساڑھے آٹھ ہزار مربع میل ہے اور آبادی ایک لاکھ کے قریب ہے۔ سرکاری زبان

WWW.PAKSOCIETY.COM

عربی اور مذہب اسلام ہے۔ قطر کی معدنی دولت پیٹرول ہے۔ سمندر سے موتی بھی نکالے جاتے ہیں۔ زرعی پیداوار بہت کم ہے۔

(۵) بحرین:

یہ کویت سے دو سو میل جنوب مشرق میں واقع ہے۔ یہ چند جزیروں کا مجموعہ ہے۔ سب سے بڑا جزیرہ بحرین ہی ہے۔

اہل عرب نے ساتویں صدی عیسوی میں ان جزائر پر اپنا قبضہ جما لیا تھا۔ سولہویں صدی میں ان پر پرتگیزیوں نے قبضہ کرلیا۔ ۱۷۸۳ء میں انگریزوں نے اس ریاست کو اپنے اثر میں لے لیا۔ پھر ۱۹۷۱ء میں بحرین کو آزادی ملی۔ اس وقت بحرین میں برطانیہ کا ایک بحری اڈہ ہے۔ بحرین کا رقبہ ۲۳۱ مربع میل اور آبادی تقریباً تین لاکھ ہے۔ اس کا صدر مقام منامہ ہے۔ زبان عربی ہے۔ تقریباً ۹۵ فیصد مسلمان ہیں۔ ان میں اکثر لوگ شیعہ مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔

بحرین کی اہم ترین صنعت تیل صاف کرنا ہے اور زرعی پیداوار موتیوں اور مچھلیوں پر مشتمل ہے۔ یہاں کی آب و ہوا گرم اور مرطوب ہے۔

متحدہ عرب امارات

دوسری چھوٹی ریاستیں یہ ہیں۔ حضرموت، دبئی، شارجہ، فجیرہ، ام القوین، راس الخیمہ اور عجمان ہیں۔ ان ریاستوں کے حکمران شیخ کہلاتے ہیں۔

سیاسی لحاظ سے یہ تمام امارتیں انگریزوں کے زیر اثر تھیں۔ انیسویں صدی عیسوی میں ان علاقائی اکائیوں نے برطانیہ کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے برطانیہ نے اعلان کیا کہ وہ یہ معاہدہ ختم کردے گا۔ پھر چھ ریاستوں یعنی ابوظہبی، دبئی، شارجہ، فجیرہ، ام القوین اور عجمان نے مل کر متحدہ عرب امارات کی تشکیل کی۔ بہت جلد ہی راس الخیمہ نے بھی اس میں شرکت کرلی۔ جدید مملکت کا صدر شیخ زید بن سلطان النہیان کو منتخب کرلیا گیا۔ اس کا رقبہ ۳۲۲۷۸ مربع میل اور آبادی تین لاکھ ہے۔ ان اکائیوں کی سرکاری زبان عربی اور سرکاری مذہب اسلام ہے۔ یہاں کے لوگوں کا عام پیشہ ماہی گیری ہے۔ تیل یہاں کی سب سے بڑی معدنی دولت ہے۔ ان ممالک میں کوئی قابل ذکر صنعت نہیں ہے۔ یہ متحدہ امارات عرب لیگ، اسلامی قوموں کی انجمن اور اسلامی سیکرٹریٹ کی ممبر ہیں۔ عرب امارات کی آبادی عرب باشندوں، ایرانی، بھارتی اور پاکستانی لوگوں پر مشتمل ہے۔

(۹) سلطنت اردن

سلطنت عثمانیہ کے زمانہ میں اردن کا علاقہ شام کے صوبے کا ایک غیر معروف سب ڈویژن تھا مگر ۱۹۲۰ء میں اسے شام سے الگ کرکے ایک علیحدہ ملکی اکائی کا تصور دیا گیا۔ برطانیہ کی سرپرستی میں شریف مکہ کا بیٹا امیر عبداللہ ۱۹۲۱ء میں اس کا فرماں روا تسلیم کیا گیا۔ پھر ۱۹۴۶ء میں اسے بھی سیاسی آزادی نصیب ہوئی لیکن برطانیہ کو یہاں ہوائی اڈے رکھنے کا حق حاصل رہا۔

پھر ۱۹۴۸ء کی فلسطینی لڑائی میں امیر عبداللہ کی فوجوں نے بہت بہادری دکھائی۔ جب جنگ ختم ہوئی تو امیر عبداللہ کی سلطنت کا رقبہ تقریباً دوگنا ہوگیا جس میں چار لاکھ مہاجرین کو بسانے کا انتظام کیا گیا اور انہیں اردن کی شہریت کے حقوق دے دیے گئے مگر مالی لحاظ سے اردن کا حکمران برطانیہ کا دست نگر رہا۔

پھر ۲۰ جولائی ۱۹۵۱ء کو امیر عبداللہ قتل کردیے گئے اور ولی عہد طلال تخت نشین ہوا مگر اپنی مسلسل بیماری کی وجہ سے اسے ۱۹۵۲ء میں معزول کردیا گیا اور ان کا بڑا لڑکا حسین ملک کا فرماں روا بنا دیا گیا۔ پھر شاہ حسین نے شام و مصر کے ساتھ ایک دفاعی معاہدہ کیا جس کی

رو سے اسرائیلی ریاست کے خلاف جنگ کی صورت میں تینوں ممالک نے متحد ہوکر لڑنے کا فیصلہ کیا۔

نہر سوئز کے سلسلے میں جب جنگ ہوئی تو اردن کے برطانیہ اور فرانس سے تعلقات کشیدہ ہوگئے اور برطانیہ نے اردن کی مالی امداد بند کردی۔ گو مصر اور شام کے ساتھ سیاسی تعلقات میں گڑبڑ ہوئی مگر امریکی حکومت نے اردن کو امداد دینا شروع کردی جو ۱۹۶۰ء میں پانچ کروڑ ڈالر سالانہ تک پہنچ گئی۔ اردن کا رقبہ ۳۷۷۳۸ مربع میل اور آبادی سترہ لاکھ سے زیادہ ہے۔ اس کا پایہ تخت عمان ہے۔ سرکاری زبان عربی، آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ اردن عرب لیگ، اقوام متحدہ اور اسلامی سیکرٹریٹ کا ممبر ہے۔

ان کے علاوہ بیسویں صدی کی اسلامی سلطنتوں میں مندرجہ ذیل ریاستیں اور حکومتیں بھی شامل ہیں ان کے ہم صرف ایک سطری حوالے درج کررہے ہیں۔ ان کی تفصیل ہم کسی اور موقع پر لکھیں گے۔ بیسویں صدی کی باقی ریاستیں مندرجہ ذیل ہیں۔

ملک	دارالسلطنت	زبان
۱۷۔ لبنان	بیروت	انگریزی
۱۸۔ شام	دمشق	عربی
۱۹۔ عراق	بغداد	عربی
۲۰۔ ایران	تہران	فارسی
۲۱۔ افغانستان	کابل	پشتو
۲۲۔ ملائیشیا	کوالالمپور	ملائی
۲۳۔ پاکستان	اسلام آباد	اردو
۲۴۔ فلسطین	تل ابیب	عربی

ان صفحات میں دنیائے اسلام کے جن چوالیس اسلامی ملکوں کے نام اور ان کا مختصراً تذکرہ کیا گیا ہے ان کی تفصیل تاریخ یادداشت کے لیے نہیں بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ بیت المقدس (فلسطین) پر ۱۹۶۷ء اور ۱۹۶۷ء میں یہودیوں نے جو قیامت صغریٰ برپا کی اور جس کے کرب سے آج بھی بیت المقدس ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا ہے۔ وہ قیامت دن دہاڑے ان چوالیس مسلم ریاستوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اور سر پر چڑھ کر برپا کی۔ وہ سب کچھ ان مسلم ریاستوں نے سنا اور دیکھا ہے اور آج بھی دیکھ رہے ہیں۔

ان مسلمان ریاستوں اور ملکوں میں چھوٹے بڑے امیر اور متوسط درجے کی ریاستیں اور ملک شامل ہیں اور اگر خدا نے وہ دن دکھایا کہ یہ تمام ریاستیں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ظالم یہودیوں کے خلاف کھڑی ہوگئیں تو پھر نہ امریکا اور نہ برطانیہ یہودیوں کو بچا سکتا ہے اور نہ ان کی حفاظت کرسکتا ہے۔ آج ہم جب ٹی وی پر بیت المقدس میں مسلمانوں کے مکانوں، دکانوں اور بازاروں کو جلتے دیکھتے ہیں اور سڑکوں پر یہودی ٹینکوں کو دوڑتے اور نہتے مسلمانوں پر گولیاں برساتے دیکھتے ہیں تو ہمارے سینے جل اٹھتے ہیں۔

یہ بات نہیں کہ مسلمان بزدل ہیں اور یہودیوں کا مقابلہ نہیں کرسکتے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکا اور برطانیہ یہودیوں کی مدد دامے، درمے اور سخنے کر رہے ہیں۔ بلکہ انہوں نے یہودیوں کے لیے اسرائیل میں جدید ترین اسلحہ کے ڈھیر لگا دیے ہیں۔ جبکہ مسلمان یہودیوں کے مقابلے میں بالکل نہتے نظر آتے ہیں۔ مسلمان اگرچہ یہودیوں کے مقابلے میں دل والے اور بہادر ہیں مگر وہ یہودیوں سے اسلحہ کی مار کھاتے ہیں۔ پھر جب مسلمانوں کو زیادہ غصہ آتا ہے اور وہ رسائل میں یہودیوں کے مظالم پڑھتے اور ٹی وی پر دیکھتے ہیں تو ان کا خون کھول اٹھتا ہے اور کوئی جوان اپنے جسم پر بم باندھ کر کلاشنکوف

سنبھال کر یہودیوں کے ہجوم میں گھس پڑتا ہے پھر اس کے جسم سے بندھے بم پھٹتے ہیں تو دس بیس یہودی ڈھیر ہو جاتے ہیں اور خود اس کے جسم کے ٹکڑے بھی بکھر جاتے ہیں۔

جان دو اور جان لو کا یہ سلسلہ آج نہیں بلکہ ۱۹۲۸ء سے شروع ہوا اور اس میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ آیئے اب ہم یہود اور مسلم کشمکش کو اس کے آغاز یعنی کم از کم ۱۹۲۸ء سے ایک بار پھر دیکھتے ہیں تا کہ ہم یہودیوں کی پشت پر بیٹھے ہوئے ان حمایتیوں کے چہرے بھی دیکھ سکیں جن کے زور اور شہ پر یہودی بیت المقدس میں مسلم آبادی کے خلاف میں مسلسل دہشت گردی کا ننگا ناچ دکھا رہے ہیں۔

مسلم سرشت

ہم جانتے ہیں کہ تاریخ قوموں کے عروج و زوال کی سچی کہانی ہے۔ ایمان اور عمل صالح اپنانے والوں سے خالق عالم کا وعدہ ہے کہ وہ انہیں زمین پر اپنا خلیفہ بنائے گا۔ چنانچہ بلندی اور پستی کا یہ چکر امت مسلمہ کے ساتھ بھی چلتا رہا ہے۔ اور جب ہم مسلمانوں کے عروج و زوال پر نظر ڈالتے ہیں تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس قوم کی تخلیق قدرت نے ایک خاص غرض سے کی تھی۔ چنانچہ جب تک قوم اپنے نصب العین کے مطابق میدان جہد میں رہتی ہے اسے عروج ملتا ہے اور جب وہ اپنے مقصد یعنی خدا بندگی سے سرتابی کرتی ہے تو وہ ناکام اور رسوا ہو جاتی ہے۔

خلافت عباسیہ میں جب بغداد کو "دنیا کا دولہن" کہا جاتا تھا اور کتاب و سنت کے وارث معمولی معمولی باتوں پر آپس میں لڑنے جھگڑنے اور ایک دوسرے پر کفر و شرک کے فتوے لگانے لگے تو تاتاریوں نے اس قوم یعنی مسلمانوں کی امامت [illegible] لیکن اس دور میں امام ابن تیمیہ کی للکار نے جس میں کتاب و سنت کی پوری روح جلوہ گر تھی، بڑھتے ہوئے تاتاری طوفان کا رخ پھیر دیا تھا۔ ہماری تاریخ کی کتابیں پکار پکار کر کہتی ہیں کہ امت رسول ہاشمی ایک خاص امتیاز رکھتی ہے جو اسے دوسری قوموں سے ممتاز اور بالاتر رکھتا ہے۔ یہ امتیازی وصف ہی دراصل اللہ کی کتاب و سنت سے وابستگی ہے۔ جب تک مسلمان کتاب و سنت کی چھاؤں میں رہتا ہے اس پر کفر کی دھوپ کام نہیں کرتی مگر جب مسلمان کی بنیاد یعنی ایمان میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے تو اس کی طاقت کا سورج گہنا جاتا ہے۔ عظمت کا سورج گہنا جاتا ہے اور وہ عزت سے بھی دور کر دیا جاتا ہے۔

ماضی میں جب تاتاری یلغار مشرق وسطیٰ کو اپنے سیلاب میں بہانے چلا جا رہا تھا کہ کتاب و سنت کی روح سے سرشار ایک گروہ نے اسے للکارا اور وہ طوفان جو شمع توحید کو بجھانے کے لیے اٹھا تھا بلبلے کی طرح بیٹھ گیا۔

یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ آج پھر مشرق وسطیٰ ایک نئے طوفان کی لپیٹ میں آ گیا ہے۔ یہ سیلاب صیہونیت کا ہے، یہودیت اور اسرائیلیت کا ہے۔ اور یہ سیلاب ماضی کے تاتاری فتنے سے بھی شدید تر ہے۔ ماضی اور حال کے ان دو فتنوں میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف اتنا کہ تاتاری فتنہ اپنے وجود میں مستقل تھا اور عہد حاضر کا صیہونی فتنہ استعماری طاقتوں کا ایک بہروپ ہے۔ چہرے پر نظر ڈالیے تو اسرائیل لیکن دل و دماغ، عزائم اور ارادے سب کے سب استعماری طاقتوں کے ہیں۔ ان میں ساری طاقت دراصل استعماری ہے اور اسے جنم بھی استعمار ہی نے دیا ہے۔ لطف یہ کہ نمو و پرداخت بھی اس نے کی اور حفاظت بھی وہی کر رہا ہے۔

"بیت المقدس"

بیت المقدس ہمارا "قبلہ اول" ہے۔ یہ ہماری نسل کی بڑی بدبختی ہے کہ اسے "قبلہ اول" کے چھن جانے کے حادثے سے دوچار ہونا پڑا۔ اس سے زیادہ دل شکن حادثہ "مسجد اقصیٰ" کی توہین کا ہے۔ یہودی اس عظیم، مبارک اور مقدس مسجد کو گرا کر اپنا ایک "معبد" تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ اس پر بس نہیں بلکہ اب تو یہودی حرمین الشریفین پر بھی حریصانہ نظریں ڈالنے لگے ہیں۔ مزید یہاں یہ اعلان نیل سے فرات تک توحید پرستوں کو نابود کرنے کی آرزو بھی رکھتے ہیں لیکن ہم ابھی تک ان کے عزائم کو نہیں سمجھ سکے اس لیے کہ ہمیں اس مسئلہ کی نزاکت کا احساس نہیں۔ ہم اس شہر کی عظمت اور فضیلت کو نہیں جان سکے جس کے لیے حضرت عمرؓ نے سفر کیا اور غازی اسلام صلاح الدین ایوبی اور ان کے جاں نثار ساتھی برسوں لڑتے رہے اور داد شجاعت دیتے رہے۔ یہاں تک کہ اس شہر کے ذرے ذرے میں ان کا خون رچ بس گیا جو آج بھی مضطرب ہے لیکن ہے وہ ایک نئی کروٹ کا منتظر ہے۔

یہ دل اس شہر کی عظمت اور فضیلت کی داستان ہے۔ جس کے حصول کے لیے ہمارے اسلاف، ہمارے آباؤ اجداد ایک سو سال تک اپنا خون بہاتے رہے اور آج بھی اس کی خوں چکاں داستان مسلمان بچے، جوان اور بوڑھوں کی زبان پر ہے۔ ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء کو اقوام متحدہ نے بیت المقدس اور اس کے گرد کے علاقوں کو عالمی اہمیت کا علاقہ قرار دیتے ہوئے فلسطین کی تقسیم کے ساتھ بیت المقدس کو بین الاقوامی تولیت میں دینے کا فیصلہ کر دیا۔

یہودیوں نے اس فیصلہ کو خوش دلی سے منظور کیا لیکن عربوں نے اس ناانصافی کے سامنے سر جھکانے سے انکار کیا۔ اس کے ساتھ ہی یہودیوں نے مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ ملت عظمیٰ کی مختصری فوج آزادی لاکھوں یہودیوں کے مقابلہ میں ڈٹ گئی۔ یہودیوں کو عالمی صیہونی ایجنسی اور بعض ممالک خصوصاً برطانیہ کی پورا سلاح اور روپیہ کھلے عام فراہم کر رہے تھے۔ برطانوی حکومت نے بھی انہیں مکمل سہولت جدید ترین ہتھیاروں سے لیس کیا۔ انہیں (دشمنی یہودیوں کو) عرب علاقوں پر قبضہ کرنے میں مدد دی اور عرب آبادی کو محفوظ مقام پر پہنچانے کے بہانے شہر خالی کرا لیے۔ چنانچہ ۱۳ مئی ۱۹۴۸ء کو جب برطانیہ رخصت ہوا تو دیر یاسین، عکہ، حیفہ، تبریاس، جافا، بیسان، ملد، یافا اور بیت المقدس (نیا شہر) ایسے شہر عرب آبادی سے بالکل خالی ہو چکے تھے۔

برطانیہ کی معاشی جنگ (۱۹۴۸ء)

برطانیہ اور یہودیوں کی ملی بھگت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ برطانیہ نے اعلان کیا تھا کہ وہ فلسطین کو ۱۵ مئی کو خالی کرے گا اور حیفہ کی بندرگاہ سے فوجیں اگست میں ہٹائے گا مگر اس نے اس اعلان کے برعکس حیفہ کو بھی ۳۰ مئی کو خالی کر دیا اور ۱۵ مئی کو اسلحہ اور بارود سے لدے ہوئے جہاز حیفہ کی بندرگاہ پر پہنچ گئے۔ اس کے ساتھ ہی یہودیوں کی ایک زبردست فوج نے بیت المقدس کا محاصرہ کر لیا۔ اخوان مجاہدین گزشتہ چار ماہ سے پرانے شہر میں یہودیوں سے جنگ کر رہے تھے۔ ان کے پاس ہتھیار تھوڑے تھے اور وہ بھی پرانی قسم کے تھے مگر وہ اپنے جوش ایمان، خلوص نیت، شوق شہادت اور توکل اللہ کی بدولت لڑتے رہے۔ اس وقت مقامی آبادی کے علاوہ گرد و پیش کے تیس ہزار مسلمان بیت المقدس میں پناہ گزین تھے۔ چند ہفتے پہلے ہی یہودی دیر یاسین میں قتل عام کر چکے تھے۔ القدس کے ہاتھ سے نکل جانے کا مطلب یہ تھا کہ یہاں بھی دیر یاسین کی

دہشت ناک کہانی دہرائی جائے گی۔ اخوان کے پاس گولہ بارود کا آخری ذخیرہ ختم ہو رہا تھا۔ چنانچہ انہوں نے عرب لیجن سے مدد مانگی لیکن جنرل گلب پاشا نے بعض سیاسی اور مذہبی وجوہ کی بنا پر ایک فوجی بنیاد کی آڑ میں شہر خالی کرنے کا مشورہ دیا جسے اخوان نے مسترد کر دیا۔ اخوان دستوں کے کمانڈر نے کہا۔

”یہودی ہماری لاشوں پر سے گزر کر ہی بیت المقدس میں داخل ہوں گے۔“

عرب لیجن سے مایوس ہو کر پوری عرب آبادی گھروں سے نکل آئی۔ رات بھر شدید جنگ ہوتی رہی اور صبح کے وقت یہودی پسپا ہونے لگے۔ اردنی فوج کے ایک افسر نے اس صورت حال کی خبر دی تو جنرل گلب پاشا کی مخالفت کے باوجود یہودیوں کی تازہ دم فوج کے پہنچنے سے پہلے پہلے اردنی فوج شہر میں داخل ہو گئی۔ یہودیوں نے ہتھیار ڈال دیے اور اخوان کے ثبات، استقلال اور جانفروشی نے بیت المقدس کو مسلمانوں کے لیے محفوظ کر لیا۔

۸ جولائی کو یہودیوں نے دوبارہ حملہ کیا لیکن شدید جنگ اور زبردست نقصان اٹھانے کے بعد پسپا ہو گئے۔ اس وقت اقوام متحدہ یہودیوں کی مدد کو آگے بڑھی لیکن اقوام متحدہ کی قرارداد کے احترام میں عربوں نے ابھی ہتھیار رکھے ہی تھے کہ ۱۵ جولائی کو یہودیوں نے ایک زبردست حملہ کر کے بیت المقدس کے چوراسی فیصد رقبے پر قبضہ کر لیا اور مسلمان صرف قدیم شہر تک محدود ہو کر رہ گئے۔

پھر ۹ اگست ۱۹۴۹ء کو اقوام متحدہ نے بیت المقدس کو غیر مسلح قرار دینے کی قرارداد منظور کی جسے اسرائیل نے مسترد کر دیا اور مطالبہ کیا کہ بیت المقدس کی حالیہ پوزیشن کو برقرار رکھا جائے۔ پھر چند برس بعد اقوام متحدہ پر الزام لگا کہ وہ اپنی قراردادوں پر عمل کرانے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ اسرائیل نے بیت المقدس سے متعلق اقوام متحدہ کی تمام قراردادوں کو ماننے سے بالکل انکار کر دیا اور بیت المقدس کو اسرائیلی دارالسلطنت بنانے کی باتیں شروع کر دیں۔

اقوام متحدہ نے ایک اور قرارداد کے ذریعے یہودیوں پر واضح کر دیا کہ بیت المقدس کو دارالسلطنت نہیں بنا سکتے لیکن اسرائیل نے اسے بھی نظر انداز کر دیا اور پارلیمنٹ کی منظوری سے بیت المقدس کو اسرائیل کا مستقل دارالسلطنت قرار دے کر وزارت خارجہ کے سوا اکثر دفاتر بیت المقدس میں منتقل کر دیے اور جون ۱۹۵۳ء میں وزارت خارجہ بھی بیت المقدس منتقل ہو گئی۔

۲۹ جولائی ۱۹۵۳ء کو امریکا نے برطانیہ، مشرقی جرمنی، روس، فرانس، اٹلی، جاپان، ترکی، کینیڈا، آسٹریلیا، سوئٹزرلینڈ، چیکوسلواکیہ اور دوسروں کی طرح اپنا سفارت خانہ تل ابیب سے بیت المقدس منتقل کرنے سے انکار کر دیا لیکن اکثر ممالک کے سفارتی مشن بیت المقدس آ گئے۔

اسرائیل میں انضمام

اسرائیل نے قدیم بیت المقدس پر ۷ جون ۱۹۶۷ء کو قبضہ کر لیا اور ۴ جولائی ۱۹۶۷ء کو اقوام متحدہ نے قرارداد نمبر ۲۲۵۳ (ای۔ ایس۔ وی) کے ذریعے بیت المقدس کو اسرائیل میں مدغم کرنے کے اقدام کو غیر قانونی قرار دیا۔ اس قرارداد کے حق میں ۹۹ ووٹ آئے۔ کسی نے مخالفت نہیں کی مگر امریکا اور اسرائیل غیر جانب دار رہے۔ پھر ۱۴ جولائی کو جنرل اسمبلی نے اس قرارداد کی توثیق کر دی۔

اس سے اگلے سال یعنی ۲۱ مئی ۱۹۶۸ء کو سلامتی کونسل نے اسرائیل کے رویے کی مذمت کی اور ۴ جولائی اور ۱۴ جولائی کی قراردادوں پر اصرار کرتے

ہوئے اسرائیلی اقدام کو بین الاقوامی قانون اور رائے عامہ کے خلاف قرار دیا۔ مگر اسرائیل نے اقوام متحدہ کی ہر قرارداد کو اقوام متحدہ کے منہ پر دے مارا جس کے نتیجے میں آج تک بیت المقدس اسرائیلی ظلم و استبداد کا شکار ہے اور اسے کسی ایسے صلاح الدین ایوبی کا انتظار ہے جو اسرائیل اور اقوام متحدہ دونوں کے گلے پر چھری پھیر سکے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ بیت المقدس کئی بار اجڑا اور پھر آباد ہوا ہے۔ اس عرصے میں اس کی شہر پناہ بھی کئی بار تعمیر ہوئی۔ بیت المقدس کی پہلی شہر پناہ (فصیل) عہد ۱۰۵۲ میں تعمیر ہوئی تھی اور اس کے خستہ ہونے پر حضرت سلیمان نے اس کے گرد ایک مضبوط فصیل تعمیر کرائی۔ پھر حضرت سلیمان کے چار سو سال بعد یہ شہر پناہ شاہ بابل بخت نصر کے ہاتھوں تباہ ہوئی جس نے فصیل گرا کر وہاں ہل چلوا دیا ہے۔

دوسری فصیل کا کام ۴۴۵ ق م میں شروع ہوا۔ یہ شہر پناہ یہودی قبائل نے آپس میں تقسیم کاری کے اصول پر بنائی اور اس کی تعمیر میں مقامی لوگوں کے علاوہ اہل فارس، رومیوں، شامیوں اور مصریوں نے امداد کی مگر تعمیر کا کام کسی نہ کسی طرح جاری رہا اور آخر اسے مکمل کیا گیا۔ یہ شہر پناہ پہلی فصیل کے کھنڈرات ہی پر استوار کی گئی تھی اس لیے شہر کے کل رقبے میں کوئی زیادہ فرق نہ آیا۔ اس شہر پناہ کی تعمیر [illegible] سے شروع ہوئی۔ اس کی مغربی حد موجودہ [illegible] دمشق کی جانب تھی۔ یہاں سے [illegible] یہ شہر پناہ بھی زیادہ عرصہ تک [illegible] نہ رہ سکی اور [illegible] کی تمام [illegible] کا شکار ہوئی۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ شہر پناہ کی تیسری تعمیر [illegible] شروع کی۔ اس کا [illegible] کام اس قدر شاندار تھا کہ شام کے رومی حکمران کے ذہن میں شک پیدا ہوا کہ یہ سب کچھ ایک نئی بغاوت کی تیاری ہے۔ چنانچہ اس نے کلاڈیس سیزر کو ایک خط لکھا جس میں اس شک کا اظہار کر دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کلاڈیس نے اگریپا کو مزید تعمیر سے روک دیا۔ پھر یہودیوں نے اپنے روایتی حربوں (مکاری) سے کام لیتے ہوئے اس کی جزوی تعمیر کا اجازت نامہ حاصل کر لیا۔

جو سفس اس شہر کی بہت تعریف کرتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ اس کی تعمیر میں ۴۰ ہاتھ لمبے اور دس ہاتھ چوڑے پتھر لگائے گئے تھے جن کا اٹھانا اور بلند کرنا انسانی طاقت سے ممکن نظر نہ آتا تھا۔ یہ فصیل ۷۰ء میں ٹیٹس اور رومی حملوں کا شکار ہو گئی اور ملبے کا ڈھیر بن گئی۔

اس کی موجودہ فصیل ترکان عثمان کے دوسرے بادشاہ سلیمان اعظم نے تعمیر کرائی۔ سلیمان اعظم کے والد سلطان سلیم نے ۱۵۱۷ء میں اس شہر کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ سلیمان اعظم نے اس کی تعمیر دو بھائیوں کو سونپی تھی جنہوں نے ۱۵۳۶ء میں کام کا آغاز کیا اور وہ اس کی تکمیل تک ایک دوسرے سے نہ مل سکے۔ سات سال بعد یعنی ۱۵۴۳ء میں موجودہ [illegible] گیٹ پر ان کی ملاقات ہوئی۔ اس خوشی میں انہوں نے دروازہ پر چار شیر بنائے مگر کیوں؟ اس کی کوئی تفصیل نہیں بتائی گئی۔

تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ شہر پناہ کی ہر تعمیر کے ساتھ اس کے دروازوں کے ناموں میں تھوڑا بہت بدل ہوتا رہا۔ بیشتر عرب جغرافیہ نویسوں نے ان دروازوں کا ذکر ضرور کیا ہے اور صرف دو عرب مصنفین نے اس کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

ان میں مقدسی نے ۹۸۵ء میں اور مجیر الدین نے ۱۴۹۶ء میں اس کی تفصیل بتائی ہے۔ ان تاریخوں

کے درمیان یہ مقدس شہر تقریباً ایک صدی تک صلیبیوں کی آماجگاہ بنا رہا۔ ان دونوں تذکرہ نگاروں نے جو نام لکھے ہیں وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مقدسی نے جن دروازوں کا ذکر کیا ہے وہ آج تک کھلے ہوئے ہیں اور استعمال میں ہیں۔

مقدسی نے با اصرار کے آٹھ دروازے بتائے ہیں جن کے نام یہ ہیں۔

۱۔ باب صیہون ۲۔ باب التیہ (دشت) ۳۔ باب البلاط ۴۔ باب ارمیہ (حضرت ارمیہ کا گڑھا) ۵۔ باب سلوان (صلوان) ۶۔ باب اعمدہ (ستون) ۸۔ باب محراب داؤد۔

ان میں سے باب محراب داؤد آج کل یافہ گیٹ کہلاتا ہے۔ مقامی لوگ اسے باب الخلیل یا باب حبرون کہتے ہیں۔ مقدسی نے اس سلسلے میں با اصرار کا ذکر کیا ہے۔ وہ اس دروازے سے داؤد کے برج اب تک موجود ہے اور اس میں وہ محراب بھی سلامت ہے جس سے یہ دروازہ منسوب کیا جاتا ہے۔

مقدسی کا باب صیہون جنوبی دیوار میں باب حبرون کے بعد دوسرا دروازہ ہے جسے آج کل باب النبی داؤد کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ جبکہ مجیر الدین نے اسے "باب حارۃ الیہود" کہا ہے۔ اس کے قریب ہی حضرت داؤد علیہ السلام کا مزار مبارک ہے۔

اسی طرح باب "اریحا" وہ ہے جسے چودھویں صدی سے سینٹ اسٹیفن گیٹ کا نام دیا گیا ہے۔ یہ دروازہ دسویں صدی عیسوی میں "جریکو گیٹ" کہلاتا ہے۔ اسے باب الاسباط یا "مریم حق" کا دروازہ بھی کہتے ہیں۔ برکۃ اسرائیل اس دروازے کے باہر ہے جو نہایت قدیم تالاب ہے۔

"باب جب ارمیہ" شمال کا چھوٹا سا دروازہ باب الساہرہ ہے قدیم زمانہ میں "ہیرود" گیٹ کہلاتا تھا۔ اس کے قریب ہی وہ میدان ہے۔ یہاں بعض روایات کے مطابق روز محشر (قیامت) ساری مخلوق جمع ہوگی۔ اور ایک خندق بھی ہے جس کے بارے میں عام روایت ہے کہ اسے سلطان صلاح الدین ایوبی نے کھدوایا تھا لیکن مقدسی نے اسے "گرجے کا دروازہ" کہا ہے جس کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ یہ خندق قدیم زمانے سے ہے۔ البتہ یہ تاثر ممکن ہے کہ سلطان صلاح الدین ایوبی نے اسے مزید مستحکم اور استوار کیا ہو۔

باب عمود آج بھی اسی نام سے شمالی دیوار کے وسط میں واقع ہے۔ اسے باب دمشق کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ کیونکہ یہاں سے ایک سڑک نابلس اور دمشق کو جاتی ہے۔

عیسائی روایات کے مطابق قبول مسیحیت کے بعد "سینٹ پال" اس دروازے سے شہر میں داخل ہوئے تھے۔ محاربات صلیب کے وقت یہ دروازہ سینٹ اسٹیفن سے منسوب تھا کیونکہ وہ جگہ جہاں یہودیوں نے سینٹ اسٹیفن کو سنگسار کیا وہ اس دروازے کے باہر چند قدم دور ہے۔ اس جگہ تھیوڈوسیس جانی کی ملکہ یودوسیا نے ۴۵۵ء ایک گرجا بنوایا تھا۔ ملکہ اس گرجا میں دفن ہے۔ اس گرجا سے کچھ فاصلے پر وہ شاہوں کے مقبرے ہیں جو مشرقی میسوپوٹامیا کی ملکہ ہیلینا کے لیے تعمیر ہوئے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دین موسوی قبول کرنے کے بعد ملکہ اپنے بیٹے ازاتس کے ساتھ شہر قدس آئی اور ازاتس کے کئی بیٹے اس شہر میں آباد ہو گئے۔ ملکہ اور ازاتس ان مقبروں میں مدفون ہیں ان سے کچھ فاصلے پر مسلمانوں کا قبرستان اور حضرت سلیمان کی تجلیاں ہیں۔

مقدسی کا "باب التیہ" اور "باب سلوان" آج کل

معدوم ہے لیکن قیاس کیا گیا ہے کہ باب التیہ مجیر الدین کا باب المسرب (چھوٹا دروازہ) ہے جو کہ باب صیہون اور باب حبرون کے درمیان ارغون خانقاہ کے قریب کھلتا تھا لیکن آج کل بند ہے۔

باب سلوان، مشرقی دیوار میں آج کا "باب المغاربہ" ہے جسے فرنگیوں نے کوڑی دروازے کا نام دیا تھا۔ باب البلاط غالباً مجیر الدین کے باب الرحمہ (میدان) کا قدیم نام ہے جو کہ باب حبرون کے شمال میں شہر پناہ کے مشرقی پہلو پر تھا لیکن سولہویں صدی میں اسے بند کر دیا گیا۔ اوپکی ۱۸۶۵ء میں باب الرحمہ کا ذکر بھی کرتا ہے جسے وہ "گولڈن گیٹ" کہتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے۔

"یہ دروازہ شہر کے مشرقی پہلو پر ہے مگر عام طور پر بند رہتا ہے اور صرف شاخ زیتون کے میلے کے دن کھولا جاتا ہے۔"

"کتاب زیارات یروشلم" میں اوا نگ دری لکھتا ہے۔

"یہ معبد سلیمانی کے مشرقی دروازے کی جگہ قائم ہے۔ حضرت عیسیٰ پام سنڈے کو اس دروازے سے دمشق میں داخل ہوئے۔ یہ دروازہ ۶۲۹ء میں مقدس صلیب مسیح کی یادگار کے طور پر ہرکولیس نے تعمیر کرایا تھا۔ عہد صلیبی میں یہ دروازہ دو مرتبہ کھلتا تھا۔ ایک مرتبہ پام سنڈے کے جشن کے لیے اور دوسری مرتبہ تجدید مقدس صلیب مسیح کے روز۔ ترکوں نے اسے دوبارہ تعمیر کرایا لیکن کبھی استعمال نہیں ہوا۔"

"اس باب کے باہر ایک محراب بنی ہوئی ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حضرت مہدی آخر الزماں دمشق کے راستے اسی جگہ تشریف لائیں گے۔

ڈبلیو مزید لکھتا ہے۔

"اس دیوار کا جو حصہ مسجد اقصیٰ سے متعلق ہے۔ اس جگہ ایک چبوترے سے جنت کو گزار کر بلاک کیا گیا تھا۔ مجیر الدین کے باب الدعاء کی آج کل نشاندہی ممکن نہیں ہے۔ البتہ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ باب یہود سے کسی قدر مغرب میں ہوگا۔"

آگے چل کر ریری تحریر کرتا ہے متصل باب الحدید کا ذکر کرتا ہے۔ جو ۱۸۹۹ء میں تعمیر ہوا۔ اس کے مطابق "نیو یروشلم" اسی دروازے سے باہر ہے۔ عہد یہود میں ہیرودیس اور جوناتن کے مقابل مغربی دیوار سے باہر میدان میں ہوتے تھے۔ اس دیوار میں آج کل باب الاسباط ہے۔ مجیر الدین نے خانقاہ ابن عبداللہ کے قریب باب الاعوریہ اور شہر کے شمال مشرقی گوشے میں "باب حارۃ طور" کا ہونا بھی بیان کیا ہے لیکن آج کل ان کا کوئی نشان نہیں۔

پہاڑیوں اور وادیوں کا شہر

بیت المقدس کو پہاڑیوں اور وادیوں کا شہر کہنا بالکل درست ہے۔ اس شہر کے تین اطراف میں وادیاں پھیلی ہوئی ہیں جنہوں نے اسے ایک عظیم اور منفرد شہر بنا دیا ہے۔ یہاں کیدرون اور ہنوم کی وادیاں خاص طور سے بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ اگر ان وادیوں کا رخ کسی اور سمت ہوتا تو بیت المقدس یہاں آباد نہیں ہو سکتا تھا۔

یہاں کی وادی ہنوم کتاب مقدس کے مطابق اپنے مالک کالی بن ہنوم سے منسوب ہے۔ ہنوم نے پہلے اس جگہ ڈیرے ڈالے پھر آگے بڑھ کر شہر پر قابض ہو گیا۔ یہاں مسلمانوں کا ایک قبرستان ہے جس کے وسط میں صیہون کا بالائی تالاب جسے اب "برکۃ الممیلا" کہا جاتا ہے۔ واقع ہے۔ پھر اترائی میں چوتھائی میل کے فاصلے پر صیہون کا زیریں تالاب "برکۃ السلطان" واقع ہے۔

وادی میں ایک سمت اونچی ڈھلوان چٹانیں ہیں

جن میں پتھر تراش کر مزارات بنائے گئے ہیں جنہیں بادشاہوں کے مقبرے کہا جاتا تھا۔ آج کل ان عمارتوں کو لوگ رہائش کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یہاں سے باب دمشق ایک میل سے بھی کم فاصلے پر ہے۔

"یروشلم"

اسلامی دور حکومت سے پہلے حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے عہد میں یروشلم اپنی سلطنت کا صدر مقام رہا ہے لیکن عہد اسلامی میں اس کی یہ حیثیت ختم کر دی گئی تھی۔ خلیفہ حضرت عمرؓ نے جب شام کی فتح کی تکمیل کی تو بیت المقدس، جند فلسطین کا صدر مقام تھا۔ فلسطین، شام کا ایک صوبہ تھا لیکن اہل شام "جند" کو ذیلی اضلاع کے معنی میں استعمال کرتے تھے۔ عہد فاروقی میں جند فلسطین میں میدان عکہ کے جنوب میں خلیج عقبہ تک اور اردن تک کا سارا علاقہ شامل تھا۔ اس جند کی مغربی سرحد پر سمندر، جنوب میں دشت تیہ اور مصر کا راستہ حد بندی کرتا تھا۔ اموی دور حکومت میں جند فلسطین کی حدود میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی البتہ عہد سلیمان بن عبدالملک میں اس کا دارالحکومت لد سے رملہ تبدیل کر دیا گیا۔ رملہ، سلیمان نے ہی بسایا تھا۔ عہد عباسیہ میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی مگر جب صلیبی قابض ہو گئے تو ایک بار پھر سیاسی حیثیت اور اہمیت اختیار کر گیا اور اسے یروشلم کی ریاست کا دارالحکومت بنا دیا گیا۔

چودھویں صدی عیسوی میں ابوالفدا نے اہل اردن اور دیگر بھی اس کے ماتحت اضلاع میں شامل کر دیا۔ رفح سے الجون تک اس کی لمبائی ایک سو میل کم از کم دو روز میں طے کرتے ہیں اور اس کی چوڑائی یافا سے اریحا تک طے کرنے کے لیے بھی اتنا ہی وقت لگتا ہے۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ جند فلسطین میں زغر اور دیار قوم لوط ایلیا اور الشراۃ تک کا علاقہ شامل ہے۔

اسی طرح اصطخری کے مطابق ولایت شام میں فلسطین میں سب سے زرخیز ہے۔

تیرھویں صدی میں یاقوت نے یروشلم کو ولایت فلسطین کا دارالحکومت لکھا ہے۔

بیہقی کا بیان ہے کہ فلسطین کا صدر مقام ایلیا (بیت المقدس) رملہ سے اٹھارہ میل پر واقع ہے۔

ترکمان عثمانی کے دور میں ولایت فلسطین کے پاشا (لیفٹیننٹ گورنر) کے اکثر دفاتر یہیں تھے اور جب اسے برطانیہ کا ذیلی علاقہ قرار دیا گیا تو برطانیہ نے اس کے انتظام کے لیے جنرل مقرر کیا۔

۱۹۴۸ء کی جنگ کے بعد یہ شہر اور فلسطین کے دوسرے علاقے مملکت ہاشمیہ اردن کا حصہ ہے۔

شرعی حیثیت

کلام پاک میں بیت المقدس یا یروشلم وغیرہ کے الفاظ کے ساتھ تو کہیں ذکر نہیں بلکہ اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

"پاک ہے وہ جو لے گیا اپنے بندے کو رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف جس کے گرد ہم نے برکت نازل کی ہے تاکہ ہم اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ تحقیق وہ سنتا اور دیکھتا ہے۔"

یہاں مسجد الحرام سے خانہ کعبہ اور اس کے آس پاس کی جگہ یعنی حرم اور مسجد اقصیٰ سے مراد بیت المقدس ہے۔ اور قرآنی آیات میں جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے وہ واقعہ معراج مبارک ہے جس سے ہر مسلمان واقف ہے۔

محققین کے نزدیک ہجرت سے ایک سال پیشتر رجب کی ۲۷ تاریخ کو (واقعہ معراج) پیش آیا۔ مسجد اقصیٰ حضرت سرور کائناتؐ اور مسلمانوں کا پہلا قبلہ بھی رہ چکی ہے۔ اس کے گرد و پیش اللہ تعالیٰ نے

برکتیں نازل فرمائیں، وہ دینی بھی ہیں اور دنیاوی بھی جیسے کہ صاحب روح المعانی نے اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا۔

"بیت المقدس کے گرد دینی و دنیاوی برکتیں نازل کی ہیں کہ وحی اور فرشتوں کے اترنے کا مقام اور انبیاء کی عبادت گاہ اور انبیاء کا قبلہ ہے... اور قیامت کو مخلوق اس سرزمین میں محشور ہوگی (حساب کتاب دے گی)۔ اور ہر طرف نہریں اور باغات اسے گھیرے ہوئے ہیں۔"

اس لوح میں خدا کا مظہر تجلی جبل طور اور اسی طرح مقدس وادی طویٰ ہے جن کا مندرجہ ذیل آیات میں عزت و احترام کے ساتھ ذکر ہے۔

جب موسیٰ نے مدت پوری کر لی اور اپنی اہلیہ کو لے کر چلے گئے طور کی جانب ایک آگ دیکھی۔ اپنی بیوی سے فرمایا۔

"ٹھہرو۔ میں نے آگ دیکھی ہے۔ شاید میں اس کے پاس سے کوئی خبر یا چنگاری لے آؤں تاکہ تم تاپو۔"

پھر جب آگ کے پاس گئے تو برکت والی زمین میں وادی ایمن کے کنارے درخت کی طرف سے آواز آئی۔

"اے موسیٰ! بے شک میں ہوں اللہ رب سب جہانوں کا۔"

یہ وادی طویٰ وہی مقدس وادی ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جوتے اتارنے کا حکم دیا گیا تھا۔

"جب موسیٰ نے آگ دیکھی تو اپنی اہلیہ سے کہا تم یہاں ٹھہرو میں نے آگ دیکھی ہے شاید کہ میں تمہارے پاس اس سے انگارہ لے آؤں یا کوئی راہ بتانے والا پا جاؤں۔"

پھر جب آگ کے قریب آئے تو پکارے گئے۔ "کہ موسیٰ! میں تمہارا پروردگار ہوں۔ پس اتار دو دونوں جوتیاں اپنی۔ بے شک تم مقدس وادی طویٰ میں ہو۔"

حضرت حسنؓ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک میں جس وادی طویٰ کا ذکر ہے یہ فلسطین کی وادی ہے جو یکے بعد دیگرے دو مرتبہ پاک مقدس کی گئی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جوتیاں اتارنے کا حکم اس لیے دیا گیا کہ ان کے تلوے اس پاک مقدس زمین سے مس ہو کر برکت حاصل کریں۔

اللہ تعالیٰ مزید فرماتا ہے۔

"اور جب کہا ہم نے داخل ہو تو اس گاؤں میں۔ پس کھاؤ اس سے جہاں سے چاہو تم بافراغت اور داخل ہو دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے اور کہو بخشش مانگتے ہیں ہم۔"

بیضاوی کہتے ہیں:

"یہ گاؤں جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کے ساتھ داخل ہونے کا حکم دیا گیا۔ بیت المقدس (یروشلم) تھا۔"

قرآن کہتا ہے۔

"یا مانند اس شخص کے کہ گزرا وہ پر ایک گاؤں کے اور وہ گرا ہوا تھا اوپر چھتوں اپنی کے۔ کیونکر زندہ کرے گا اللہ پیچھے موت اس کی کے۔"

ایک حدیث میں ہے کہ حضرت الیاس یا حضرت خضر نے بیت المقدس کو تباہی کے بعد دیکھا تھا۔ بخت نصر نے جو کیا تھا۔ چنانچہ یہ آیت اسی سلسلے میں ہے۔

"اے قوم ارض مقدس میں جو اللہ پاک نے تمہارے لیے لکھ دی ہے۔ داخل ہو جاؤ اور پیٹھ دکھا کر نہ لوٹنا ورنہ نقصان میں پڑ جاؤ گے۔"

یہ ارض مقدس فلسطین کا ہی علاقہ ہے۔ اس پاک سرزمین کے ساتھ مسلمانوں کی دائمی وابستگی

حدیث سے ثابت ہے۔ چنانچہ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے۔

"سوائے تین مسجدوں کے اور کسی (مسجد کے لیے) طویل سفر نہ کیا جائے۔ مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور مسجد نبوی۔"

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ مسجد حرام (کعبۃ اللہ) مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ ایک ہی لڑی کے تین انمول موتی ہیں۔ چنانچہ مشکوٰۃ میں آیا ہے کہ نبی کریم نے فرمایا۔

"آدمی کے اپنے گھر کی نماز تو ایک نماز ہے۔ مسجد کی نماز پچیس نمازوں کے برابر ہے اور جامع مسجد کی نماز پانچ سو نمازوں کے برابر ہے اور مسجد اقصیٰ میں ایک نماز پچیس ہزار (بعض روایت کے مطابق پچاس ہزار) نمازوں کے برابر ہے اور میری مسجد (مسجد نبوی) میں ایک نماز پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہے اور مسجد حرام کی ایک نماز ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے۔" (ابن ماجہ، مشکوٰۃ)

صحیح مسلم میں آیا ہے کہ۔

"پہلے مسلمان بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے مگر سولہ ماہ نماز پڑھنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ وہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کریں۔ یعنی جب سے نماز فرض ہوئی اس وقت سے سولہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کی جاتی تھی۔ پھر حکم خداوندی کے تحت مسلمان بیت المقدس کے بجائے کعبۃ اللہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے لگے۔"

اس سے صاف ظاہر ہوا کہ پہلے ہمارا کعبہ بیت المقدس تھا اس لیے اسے "قبلہ اول" کہا جاتا ہے۔

اسرا اور معراج کا تذکرہ

نبی کریم ﷺ نے معراج سے واپس آنے کے بعد اس کا ذکر اس طرح فرمایا۔

"معراج کی شب میرے پاس براق لایا گیا۔ براق ایک چوپایہ جانور ہے۔ اس کا رنگ سفید، قد گدھے سے بڑا اور خچر سے چھوٹا۔ اس کا قدم حد نظر تک پڑتا تھا۔ میں براق پر سوار ہوا اور بیت المقدس میں آیا۔ براق کو میں نے اس زنجیر سے باندھا جس سے انبیاء اس کو باندھا کرتے تھے۔ پھر میں مسجد میں گیا اور دو رکعت نماز مسجد میں پڑھی۔ پھر میں مسجد سے باہر آیا اور جبرائیل میرے پاس ایک برتن شراب کا اور ایک دودھ کا لے کر آئے۔ میں نے دودھ لے لیا۔ جبرائیل نے کہا۔ "آپ نے فطرت کو اختیار کیا ہے۔" (مسلم شریف)

اسی طرح احادیث اور روایات سے یہ بھی ثابت ہے کہ مسجد اقصیٰ میں انبیائے سابق نے آپ کی امامت میں نماز ادا کی۔ اور یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے فتح بیت المقدس کے بعد کہا تھا۔

"اس شہر کے ہم مالک ہیں۔ اور ہم عیسیٰ اور موسیٰ کے عیسائیوں اور یہودیوں سے بہتر وارث ہیں۔"

علاوہ اس کے قیامت تک کے متعلق کہا یوں پتہ چلتا ہے کہ قرب قیامت کی ایک علامت یہ ہوگی کہ مؤذن قریب سے اذان دے گا (یعنی اس جگہ سے جہاں سے سب سن سکیں۔ حسینؓ کا ارشاد ہے کہ اس قریب مقام سے مراد بیت المقدس ہے۔

بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کے بارے میں تفسیر جلالین میں علامہ جلال الدین سیوطی نے اس طرح لکھا ہے کہ۔

"بیت المقدس اہل عبادت گاہ اور زیارت گاہ ہے۔ یہی وہ اعلیٰ اور برتر مقام ہے جہاں خداوند تعالیٰ نے اپنے فرشتے جبرائیل کو حضرت سلیمانؑ کے پاس بھیجا تھا۔ یوحنا اور زکریا کو بشارت دی گئی۔ حضرت

داؤد کو مسجد اقصیٰ کا نقشہ دکھایا تھا۔ روئے زمین کے کل چرند پرند کو آپ کے تابع کر دیا تھا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پیغمبروں نے قربانیاں دیں۔ حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے اور پالنے میں گفتگو فرمائی اور یہاں سے آسمانوں پر اٹھائے گئے۔"

"یاجوج ماجوج"

آپ نے یاجوج ماجوج کا نام تو ضرور سنا ہوگا یہ وہ بلائیں ہیں جو روئے زمین پر قابض ہو جائیں گی مگر یہ بیت المقدس میں داخل نہ ہو سکیں گی۔ کیونکہ بیت المقدس وہ پاک جگہ ہے جہاں یہ بلائیں داخل ہوتے ہی خدا کے حکم سے شکست و ہلاک کر دی جائیں گی کیونکہ بیت المقدس وہ متبرک مقام ہے جہاں حضرت آدمؑ، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسحاقؑ اور حضرت مریمؑ دفن ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں یوم حشر میں تمام بنی آدم دوبارہ زندہ ہو کر فیصلے کے لیے اکٹھا ہوں گے اور اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کے ساتھ مسجد اقصیٰ میں اپنا دربار لگا کے عدل و انصاف فرمائے گا۔

مختصر یہ کہ بیت المقدس سیکڑوں انبیاء اور مرسلین کی جائے پیدائش اور ان کا مسکن اور مدفن ہے اس لیے مسلمان اور مسلمان ہی اس کے مالک ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ صرف مسلمان ہی ایک ایسی قوم ہیں جو بلا تفریق اور تخصیص تمام انبیائے کرام اور مرسلین پر ایمان لاتے اور انہیں برحق سمجھتے ہیں۔

اب جہاں تک یہودیوں کا یہ دعویٰ کہ بیت المقدس ان کے باپ دادا کی میراث ہے جو خدا نے انہیں عطا کی ہے تو اس کی تاریخی حقیقت اور حیثیت یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ کی پیدائش سے تقریباً تین ہزار سال پہلے فلسطین کے علاقوں میں کنعانی قبائل آباد تھے۔ یہ قبائل عرب سے ہجرت کر کے فلسطین پہنچے تھے اور تو فلسطین کا پرانا نام بھی کنعان تھا۔ مختصر یہ کہ بارہ سو سال قبل مسیح جب بنی اسرائیل (جنہیں اہل فلسطین عبرانی کہتے تھے) فلسطین میں داخل ہوئے تو عرب قبائل نے ان کی شدید مزاحمت کی اور وہ ڈھائی سو سال کی جدوجہد کے بعد ہی وہ فلسطین اور بیت المقدس پر قابض ہو سکے (۹۹۰ق۔م) یہودی بیرونی قوم تھے اور انہیں اسی وجہ سے عبرانی کہا جاتا تھا کہ وہ نسل کشی کے مرتکب ہو کر فلسطین پر قابض ہوئے تھے۔ شمالی فلسطین میں وہ صرف پانچ سو سال تک آباد رہے اور جنوبی فلسطین میں تقریباً دو ہزار سال سے آباد چلے آ رہے ہیں۔ اس لیے یہ سرزمین عربوں کی ہے نہ کہ یہودیوں کی۔

"مسجد اقصیٰ، مسجد حرام، مسجد نبوی"

نبی پاک ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ صرف تین مسجدوں کی زیارت کے لیے (حصول ثواب کی خاطر) رخت سفر باندھنا چاہیے۔ یعنی مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ۔ وہ مقدس مقامات (مساجد) ہیں جن کی بدولت یہ مقدس شہر مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کی عقیدت کا مرکز ہے۔ وہ شہر کی مشرقی پہاڑی (موریہ) پر ایک احاطہ میں ہیں جسے اہل اسلام (حرم شریف) کے نام سے پکارتے ہیں اور وہ بیت المقدس کا مقدس ترین حصہ ہے۔

ڈاکٹر برکلے کے بیان کے مطابق حرم شریف ۱۳۹ ایکڑ پر پھیلا ہوا ہے۔ مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ بھی جو صدیوں سے شہر کی عظمت اور تقدس کا نشان ہیں اسی حرم میں ہیں۔ حرم میں جگہ جگہ بلند مقامات ہیں جنہیں مسلمان "محراب" کہتے ہیں۔ مقدس سمجھتے ہیں اور ان کے سامنے نوافل ادا کرتے ہیں۔

قدیم مورخوں نے حرم شریف کی محرابوں اور گنبدوں کا جس انداز میں ذکر کیا ہے وہ موجودہ حالات سے قطعاً مختلف ہے۔ آج ان میں سے کئی

نہیں یہ مشکوک ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صلیبیوں نے اپنے ۹۰ سالہ دور میں حرم شریف میں بعض غیر معمولی تبدیلیاں کیں اور تین نسلیں گزرنے کے بعد جب صلاح الدین ایوبی نے اسے بحال کروایا تو اکثر مقامات غائب اور علامات محو ہو چکی تھیں۔

"حرم شریف"

ابن الفقیہ نے ۹۰۳ء میں لکھا ہے کہ حرم شریف کی لمبائی ایک ہزار اور چوڑائی سات سو ہاتھ ہے۔ اس کی عمارتوں میں چار ہزار چوبی شہتیر، سات سو سنگی ستون اور پانچ سو پیتل کی زنجیریں ہیں۔ ہر رات ایک ہزار چھ سو فانوس روشن ہوتے ہیں اور ان کے لیے ایک سو چالیس (۱۴۰) غلام مامور ہیں۔ ہر ماہ ایک سو مقطا (سوا تین سیر کی ایک قسط) روغن زیتون خرچ ہوتا ہے۔ حرم شریف کے اندر سولہ بڑے صندوق ہیں جو کلام پاک کے نسخوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ وضو کرنے کے لیے چار حوض اور وعظ دینے والوں کے لیے پانچ منبر ہیں۔ مسجد اور گنبدوں کی چھتوں پر مٹی کی بجائے جست کی ۲۵ ہزار چادریں چڑھائی گئی ہیں۔ مسجد کے اندر مستورات کے لیے حجرہ نما لمبے تین عدد مقصورے ہیں۔ حرم شریف کے اندر باہر کے تمام دروازوں کی تعداد پچاس ہے۔

ایک اور مورخ ابن عبد ربہ اس سال کے بعد یہ لکھتا ہے کہ۔

"حرم شریف کی عمارتوں میں ایک ہزار فانوس روشن کیے جاتے ہیں۔ دروازے پچاس اور ستون ۶۸۴ ہیں۔ صخرہ کے اندر تیس اور باہر اٹھارہ ستون ہیں۔ گنبد پر جست کی ۳۳۹۴ چادریں ہیں جن پر پیتل کی ۱۰۲۱۰ اصل کی ہوئی تختیاں جڑی ہیں۔ اس رقبہ میں روشنی کے لیے ۴۶۴ فانوس روشن کیے جاتے ہیں جو تانبے کی زنجیروں اور کنڈوں سے لٹکے رہتے ہیں۔ ہر زنجیر ۱۸ گز لمبی ہے۔ بڑی تختی کے چوبی قرآن مجید جن کا ہر صفحہ کھال کے پورے قطعہ کا ہے، طول پر پھیلے رہتے ہیں۔ حرم محترم میں دس محرابیں ہیں اور پندرہ گنبد، چار حوض اور چار مینار اذان کے لیے ہیں۔ مسجد، گنبد اور میناروں، سب کی چھتوں پر جست کی چادریں ہیں۔ خدمت کے لیے ۲۳۰ مملوک ہیں جنہیں سرکاری خزانے سے تنخواہ ملتی ہے۔ روغن زیتون کا ماہانہ صرف سات سو قسط ماہانہ ہے (ایک قسط برابر ڈیڑھ پونڈ)

مقدسی نے ایک جدید ترین سروے کے مطابق حرم مقدس کی لمبائی ۴۰۰ گز اور چوڑائی ۲۲۰ گز ہے۔ حرم میں جابجا زیتون، سرو اور نارنج کے درخت ہیں۔ اس کے دروازے ۲۳ ہیں جن میں اکثر بند رہتے ہیں۔

"پیمائش"

مقدسی اور ابن الفقیہ، دسویں صدی عیسوی میں اس کا طول و عرض ۷۰۰×۱۰۰۰ ہاتھ بتاتے ہیں۔ ناصر خسرو اور ادریسی ۴۰۰×۱۰۸۰ فٹ بتاتے ہیں۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کی فتح کے ایک عرصہ بعد ۱۳۵۵ء میں ابن بطوطہ نے ۴۳۵ اور ۲۳۵ گز، الکی صاحب شہر اقرام نے ۱۳۵۱ء میں ۳۱۸×۳۳۸ گز لکھا ہے۔ جبکہ ۱۳۹۶ء میں مجیر الدین ۹۳×۷۵۲ فٹ بتاتا ہے، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ زمانہ قدیم سے دور جدید تک احاطہ حرم کی حدود میں کچھ زیادہ ردوبدل نہیں ہوا۔ البتہ ۱۹۲۶ء میں مولانا شیر علی نے اس کا طول و عرض ۴۰۰×۲۶۰ گز بتایا ہے۔ یہ اضافہ شاہ حسین کے عہد میں حرم کی ترمیم کے دوران ہوا۔

حرم شریف کے دروازے

(۱) ابن الفقیہ ۹۰۳ء: باب داؤد، باب حطہ، باب النبی، باب رحمت، باب توبہ، باب اسباط، باب ام خالد (۲) ابن عبد ربہ ۹۱۳ء: باب رحمت، باب توبہ، باب داؤد، باب حطہ، باب محمد، ابواب الاسباط (چھ عدد)، باب ہاشمی، باب ام خالد (۳) مقدسی ۹۸۵ء: باب داؤد، باب حطہ، باب النبی، ابواب مریم، باب رحمت، باب برکہ نبی، باب اسرائیل، ابواب الاسباط، باب الولید، باب ام خالد، باب السکینہ (۴) ناصر خسرو ۱۰۴۷ء: باب داؤد، باب حطہ، باب عین اصلوان، باب رحمت، باب توبہ، باب ابواب (سات عدد)، باب زاویائے صوفیہ (۵) مجیر الدین ۱۳۹۶ء: باب السلسلہ، باب النبی، باب اقصیٰ قدیم، باب الرحمت، باب الحطہ، باب التوبہ، باب الدواریہ (۶) لی سٹرینج ۱۸۹۰ء: باب السلسلہ، باب النبی، باب البراق، باب رحمت، باب التوبہ، باب الحکم، باب شرف الانبیاء۔

نوٹ:

۱۔ ابواب مریم، باب عین الصلوان، صلاح الدین ایوبی نے تیغہ کروایا۔

۲۔ باب الوادی، وادی جہنم کی طرف کھلتا تھا اور باب التوبہ کے قریب تیغہ کیا ہوا آج بھی موجود ہے۔

ان اختلافات کی اصل وجہ یہ ہے کہ حرم شریف کے اطراف و جوانب میں مختلف ادوار میں بہت کچھ ردوبدل ہوتا رہا۔

الف۔ عیسائی صلیبی حکومت کے زمانے میں

ب۔ مسلمانوں کی دوبارہ تعمیر کے وقت

ج۔ سلطان سلیمان کے سولہویں صدی میں دوبارہ تعمیر کے وقت جب چاروں دیواروں کو از سر نو تعمیر کیا گیا تو نام بدل دیے گئے۔

ابن قتیبہ، ابن عبد ربہ، ناصر خسرو اور مقدسی کے "باب حطہ" کا نام اس وقت "باب البراق" یا "باب النبی" ہے۔ جس کا آدھا حصہ زمین کے اندر ہے۔ ناصر خسرو نے اس سلسلے میں یہ روایت بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اس دروازے سے حرم شریف میں داخل ہونے کا حکم دیا تھا جبکہ مقدسی، ابن الفقیہ اور ناصر خسرو کے باب النبی اور ابن عبد ربہ کے باب محمد کو تیغہ کر کے بند کر دیا گیا ہے۔

ناصر خسرو نے اس دروازے کے بارے میں لوگوں کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ یہ حضرت سلیمان کے زمانے کی تعمیر ہے اور نبی کریم ﷺ شب معراج کو اسی دروازے سے گزر کر مسجد اقصیٰ میں تشریف لائے تھے۔ یہ دروازہ مکہ معظمہ کی جانب کھلتا ہے۔ حرم شریف کے اس زمین دوز راستے کی ڈیوڑھی کے دوہرے پٹ کے دروازے ہیں۔ اس کو زمین دوز بنانے کی وجہ یہ ہے کہ مضافات میں جو لوگ رہتے تھے وہ لوگ شہر کے دوسرے محلوں کا چکر لگائے بغیر حرم شریف میں آ سکیں۔ لیکن اس مقام پر زمین دوز محرابیں آج بھی نظر آتے ہیں جو مجیر الدین کے عہد میں "الاقصیٰ القدیمہ" کہلاتے تھے اور ان محرابوں کے سروں پر ایک دوہرا بڑا دروازہ موجود تھا۔

ناصر خسرو کا "باب العین صلوان" محراب مریم کے قریب واقع تھا۔ سلطان صلاح الدین نے بیت المقدس پر قبضہ کیا تو مغرب اور شمال کی سمت سوائے حرم میں آنے جانے والے تمام راستے بند کروا دیے اور دروازوں پر بھی تیغا کروا دیا گیا۔ ابن الفقیہ کا باب الوادی، حرم شریف کے مشرقی جانب وادی جہنم کی طرف کھلتا تھا اور قبۃ الصخرہ کے چبوترے کے براق کا زینہ اس کے مقابل تھا۔

بعض لوگوں کا یہ بھی بیان ہے کہ نبی کریم ﷺ شب معراج اسی دروازے سے داخل ہوئے۔ یہ "باب البراق" اور "باب النبی" بھی کہلاتا اور باب القدیم سے مغرب کی طرف بہت گز حرم کی دیوار کے اس حصے میں اب بھی تیغا کیا ہوا موجود ہے۔

ابن الفقیہ اور ابن عبدربہ کا باب الرحمت اور مقدسی کے باب الرحمہ، ناصر خسرو کے باب توبہ باب رحمت شرقی دیوار کے دو بند پھاٹک ہیں جنہیں فرنگی گولڈن گیٹ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مگر مسلمان آج بھی انہیں باب الرحمہ اور باب التوبہ کے نام سے پکارتے ہیں۔ باب توبہ کے بارے میں ناصر خسرو نے لکھا ہے کہ یہی وہ دروازہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد کی توبہ قبول فرمائی تھی۔ ناصر کے عہد میں اس کے قریب ایک مسجد بنی ہوئی تھی اور آج کل اس کی جگہ "کرسی سلیمان" ہے۔

سیوطی نے باب الرحمہ کے بارے میں لکھا ہے کہ بیت المقدس کے مشرق کی طرف اس دیوار میں واقع ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے یوں ذکر کیا ہے۔

"اس کے سامنے کی وادی کو "وادی جہنم" کہتے ہیں۔ خود یہ دروازہ یعنی باب الرحمہ حرم شریف کی چہار دیواری میں اندر کے رخ پر ہے۔"

اس آیت میں جس دروازے کی طرف اشارہ ہے اسے بند کرا دیا گیا ہے۔

اب رہا باب التوبہ جو باب الرحمت سے مل کر ایک ہی دروازہ بن جاتا ہے لیکن ان دونوں دروازوں میں سے آج کل کسی میں بھی آمدورفت نہیں۔ باب التوبہ کے قریب اور باب الرحمہ الاسباط کے درمیان حضرت خضر اور الیاس کا مسکن ہے۔ یہ دروازہ چھٹی صدی عیسوی میں تعمیر ہوا اور صلیبیوں نے اسے گولڈن گیٹ (باب الذہب) کا نام دیا۔

اب رہا مقدسی کا باب سرکہ بنی اسرائیل اور ناصر خسرو کا "باب الابواب" تو یہ رباط صلیبیہ کے بعد سے باب الاسباط کے نام سے مشہور ہے اور حرم شریف کی شمالی دیوار کے مشرقی سرے اور مسکن حضرت خضر اور الیاس کے قریب ہی واقع ہے۔

مقدسی، ابن الفقیہ، ابن عبدربہ کا باب الاسباط اور ناصر خسرو کا باب الابواب حرم کے مغرب میں شمالی دیوار کو لے جانے والا دروازہ ہے جو رباط صلیبیہ سے اب تک باب الحطہ کے نام سے موسوم ہے۔

سیوطی لکھتا ہے:

"اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اس دروازے سے حرم شریف میں داخل ہونے کا حکم دیا تھا۔ مقدسی کا باب ہاشمیہ، ابن عبدربہ کا باب الہاشمی، ناصر خسرو کا باب ... دانے صوفیہ اور مجیر الدین کا باب الدویداریہ آج کل باب صوفیہ یا باب شرف الانبیا کہلاتا ہے۔

سیوطی کہتا ہے: "یہ حرم کے شمالی رخ سے کھلتا ہے۔"

مقدسی اور ابن عبدربہ کا باب الولید، اس زمانہ کا باب الغوانمہ ہے جو مغربی دیوار کے شمالی سرے پر واقع ہے۔ سیوطی اسے باب الخلیل بھی کہتا ہے۔ لیکن مقدسی کے بیان کے مطابق باب الخلیل یا باب ابراہیم باب الولید سے آگے جنوب کا دروازہ تھا جسے ناصر خسرو نے باب السقر لکھا ہے اور آج کل باب الناظر کہلاتا ہے۔

سیوطی لکھتا ہے:

باب الناظر کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ کبھی نہیں کھلا۔ پہلے زمانہ میں اسے باب میکائیل کہتے تھے اور ایک خبر کے مطابق حضرت جبرائیل نے شب معراج کو اسی دروازے پر براق کو باندھا تھا۔ باب الحدید، سلطان صلاح الدین نے حرم شریف کی موجودہ مغربی دیوار میں باب الناظر کے جنوب میں بنایا تھا۔ کسی زمانہ میں اسے باب ارغون الکاملی بھی کہا جاتا تھا۔ مقدسی اور ابن الفقیہ کا باب ام خالد موجودہ باب القطانین (پارچہ فروشاں) ہے۔ باب القطانین ان دروازوں میں ہے جنہیں از سر نو بنایا گیا ہے۔

سب سے پہلے اسے الملک الناصر بن قلاوون نے تعمیر کیا تھا لیکن بعد میں گر کر بے کار ہو گیا اور تنکیز الناصری دمشق کے والی شام نے سلطان محمد ابن قلاوون کے حکم سے دوبارہ تعمیر کیا تھا۔ اس کے جنوب میں مزید دو باب المتوضأ (طہارت) یا باب المطہرہ (بارش) ہے۔ موجودہ ایوبی مرحوم علاء الدین بصیر نے بنائی تھی۔

مقدس اور ناصر خسرو کا باب داؤد موجود یا باب السلسلہ ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت داؤد اسی راستے حرم میں تشریف لاتے۔ باب السلام یا باب سکینہ اسی دروازے کے قریب بنا ہوا ہے۔ موجودہ دور میں ۱۹۶۷ء حرم کے چودہ دروازے ہیں۔ ان میں سے بہت سے مقفل ہیں۔ صرف شمالی جانب دو دروازے کھلے رہتے ہیں۔ رومن کی فوجی چھاؤنی اسی طرف دیوار حرم کے ساتھ تھی۔

دالان:

حرم مبارک کے اندر چار دیواری کے ساتھ ساتھ جو حرم بنے ہوئے ہیں وہ مسلمانوں کے ابتدائی عہد میں بھی اسی حالت میں اسی جگہ موجود تھے۔ یہ دالان مغربی اور شمالی دیوار کے ساتھ ساتھ ہیں۔ جبکہ وادی جہنم کے رخ پر مشرقی دیوار میں جس میں باب الرحمۃ ہے کوئی دالان نہیں ہے اس کے جنوبی حصہ میں کوئی دالان ہے۔

مغربی چار دیواری کے اندر تمام کے تمام دالان الملک الناصر ابن قلاوون کے عہد ۱۳۱۰ء تا ۱۳۲۰ء کی تعمیر ہیں۔

باب مغاربہ موجودہ باب انجی کے قریب سے باب السلسلہ تک کا دالان ۱۳۰۷ء میں باب السلسلہ کے قریبی مینار سے باب الناظر کا دالان ۱۳۳۶ء میں باب الغوانمہ تک بنایا گیا۔

شمالی دیوار سے ملحق دالان ان عمارتوں کے ساتھ تعمیر ہوئے جو ان میں سے ہر ایک ساتھ بنی ہوئی ہے۔

اس کے بعد ان کی وقتاً فوقتاً مرمت ضرور ہوتی رہی لیکن مجموعی طور پر بالکل اسی حالت میں ہیں جیسے کہ ۱۳۹۰ء میں تھے۔

"مسجد اقصیٰ"

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ صرف تین مسجدوں کی زیارت کے لیے رخت سفر باندھنا چاہیے۔ ایک مسجد حرام، دوسری مسجد اقصیٰ اور تیسری مسجد نبوی۔ یہ ایک ایسی حدیث ہے جسے تمام مسلمان تسلیم کرتے ہیں۔ بیت المقدس کا مقدس ترین حصہ "حرم شریف" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ حرم شریف ۳۵ ایکڑ کے رقبہ پر پھیلا ہوا ہے۔ مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ اسی حرم میں ہیں۔ حرم شریف میں جگہ جگہ بلند مقامات ہیں جنہیں ہم مسلمان "محراب" کہتے ہیں۔ مقتدی گھٹنے ٹیکتے ہیں اور ان کے سامنے نوافل پڑھتے ہیں۔

آج ان محرابوں اور گنبدوں میں سے کئی نابود یا مشکوک ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صلیبیوں نے اپنے نوے سالہ دور میں حرم مقدس میں بہت سی تبدیلیاں کر دی تھیں اور جب تین نسلیں گزرنے کے بعد صلاح الدین ایوبی نے اسے بحال کرایا تو اکثر مقامات غائب ہو چکے تھے۔

مسلمانان عالم کو دنیا کے تین شہر اپنی جان سے زیادہ عزیز ہیں۔ ان میں ایک مکہ شریف، دوسرا مدینہ شریف اور تیسرا بیت المقدس ہے اور بیت المقدس کو اپنے سینے پر مسجد اقصیٰ رکھنے کا فخر حاصل ہے۔

اقصیٰ کے معنی دور کے ہیں۔ پس مسجد اقصیٰ کے معنی دور کی مسجد ہوئے۔ یہاں مسجد سے مراد بیت المقدس کے حرم مقدس کا پورا رقبہ ہے۔ شب معراج

کی روایت کے مطابق آنحضرت ﷺ ایک پر دار گھوڑے (براق) پر سوار ہو کر حضرت جبرائیلؑ کے ساتھ مکہ معظمہ سے طور سینا گئے۔ وہاں سے بیت لحم پہنچے اور پھر بیت المقدس تشریف لائے۔

رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

"ہم جس وقت بیت المقدس کے دروازے پر پہنچے تو جبرائیلؑ نے مجھے براق سے اتارا اور براق کو ایک کنڈی سے باندھ دیا جس سے انبیائے سابق بھی اپنے گھوڑے باندھتے تھے۔"

پھر نبی کریم ﷺ باب محمد میں داخل ہو کر اس چٹان پر چڑھے جسے قبۃ الصخرہ کہا جاتا ہے اور جو یہودی روایات کے مطابق ہیکل سلیمانی کے وسط میں تھی۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ یہاں مذبح تھا۔ اس کے قریب ہی آپ کی ملاقات انبیائے کرام کی جماعت سے ہوئی۔ حضور پاک نے حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور دوسرے انبیائے کرام کے ساتھ نماز ادا فرمائی۔

اسی مقدس چٹان سے نبی کریم ایک نور کے زینے سے آسمان پر چڑھے تھے اور جنت الفردوس اور اس کی نعمتوں کو دیکھا۔ پھر ساتوں افلاک طے کر کے حضور حق تعالیٰ میں پہنچے اور وہاں احکام صلوٰۃ ملے۔ اس کے بعد دوبارہ زمین پر تشریف لائے اور اسی نور کے زینے سے اتر کر صخرہ مقدسہ پر قیام فرمایا۔ پھر جس طرح تشریف لائے تھے۔ اسی طرح براق پر واپس ہوئے اور رات ختم ہونے سے پہلے ہی مکہ معظمہ پہنچ گئے۔

یہ معراج کی رات کا خلاصہ ہے۔ اس روایت نے اہل اسلام کے لیے اس چٹان اور حرم مبارک کے ذرے ذرے کو مبارک اور متبرک بنا دیا ہے۔

یہودی روایت

جس جگہ آج مسجد اقصیٰ واقع ہے۔ یہودی روایت کے مطابق اس جگہ بھی "ہیکل سلیمانی" قائم تھا۔ اس ہیکل سلیمانی کو شاہ بابل بخت نصر نے چھٹی صدی ق م میں مسمار کر دیا تھا۔ بابل سے واپسی پر یشوع اور زروبابل نے ہیکل کو دوبارہ تعمیر کیا لیکن یہ عمارت بھی رومی حملہ آوروں کی یلغار سے تباہ و برباد ہو گئی اور یہودیوں کو شہر سے نکال دیا گیا۔

اس کے ایک زمانہ بعد یہودی پھر شہر میں آباد ہوئے اور ہیرود اعظم کے زمانہ میں اس شہر نے بہت ترقی کی۔ یہاں کئی نئی عمارتیں بنائی گئیں اور یہودیوں کی خوشنودی کے لیے ہیکل سلیمانی از سر نو تعمیر ہوا لیکن یہ ہیکل بھی ۷۰ء میں رومی حکمران طیطس نے یروشلم کے ساتھ ہی تباہ و برباد کر دیا۔

آثار قدیمہ کے ماہرین کے خیال کے مطابق موجودہ "دیوار گریہ" حضرت سلیمانؑ کے ہیکل کی دیوار نہیں بلکہ یہ عمارت ہیرود کے تعمیر کردہ کا حصہ ہے جسے ہیرود نے تعمیر کرایا اور بعد میں جسے رومیوں نے برباد کر دیا۔

سلجوقی خاندان:

عرب مورخین صاف الفاظ میں کہتے ہیں کہ صلیبیوں نے سلجوقی خاندان کے مظالم کی جتنی بھی داستانیں بیان کی ہیں وہ سراسر جھوٹ اور محض افسانے ہیں اور مغربی مورخین نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آل سلجوق نے عیسائی سلطنت کے سرحدی حملوں سے تنگ آ کر بعض جوابی کارروائیاں کی تھیں جنہیں عیسائیوں نے بہت محسوس کیا تھا۔ سب جانتے ہیں کہ آل سلجوق جنگجو تھے۔ وہ وسط ایشیا سے اٹھے اور طوفان کی طرح دوسرے ممالک پر چھا گئے تھے۔ سلطان الپ ارسلان اور اس کے عظیم بیٹے ملک شاہ نے ایشیائے کوچک سے رومیوں کے اقتدار کو ختم کر دیا تھا۔ رومی شہنشاہ کمنس اپنے زخم چاٹ رہا تھا اور بدلہ لینے کے موڈ میں تھا کہ مسلمانوں کی بد قسمتی یہ ہوئی

کہ ملک شاہ کا انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے سلجوقی سلطنت کے حصے بخرے ہو گئے۔

ملک شاہ کے اس دنیا سے اٹھ جانے کے موقع پر رومی شہنشاہ نے خوب فائدہ اٹھایا۔ اس نے پوپ کے جنگ بازوں کے نام پیغام بھیجا اور پوپ کے سامنے فریاد کی اور انہیں مذہب کے نام پر ارض مقدس اور آثار مسیح کی حفاظت کے لیے برانگیختہ کیا۔ خاص طور سے یہ پروپیگنڈہ کیا گیا کہ مسلمانوں کا مقصد عیسائی مذہب کو مٹانا ہے۔ پاپ نے فوراً پیانسا اور کلیر مونٹ میں یکے بعد دیگرے دو اجلاس کیے۔ ان اجلاسوں میں مکار پیٹر نے خصوصیت سے شرکت کی۔ اس کی غمگین گوئیوں سے متاثر ہو کر تمام حاضرین جلسہ نے اپنے شانوں پر کپڑے کی بنی ہوئی صلیب لگائی اور "خدا کی مرضی یہی ہے... خدا کی مرضی یہی ہے" کی پکار لگاتے ہوئے بیت المقدس کو چھڑانے کی قسم کھائی۔ فوج کی روانگی ۱۰۹۶ء میں اس دن قرار پائی جس دن عیسائی عقیدے کے مطابق حضرت مریمؑ آسمان پر تشریف لے گئی تھیں۔ عیسائی مورخین اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ "صلیبی جنون" لوگوں میں اس طرح پھیلا کہ پوری عیسائی دنیا اس جنون میں گرفتار ہو گئی۔ لوگوں کو جنت کی خوش خبری، مال کا لالچ، زرخیز زمینوں پر قبضہ کا تصور... ان باتوں نے عیسائیوں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف نیا جوش بھر دیا۔ راہبوں نے اسے غنیمت جانا کیونکہ انہیں خانقاہوں کی سخت زندگی سے نجات ملنے کی امید بندھ گئی۔ وہ گلی گلی پکارتے پھرتے تھے کہ "صلیب پہننے والوں کو قرضوں اور ٹیکسوں سے چھٹکارا مل جائے گا اور وہ بیت اللہ کا محافظ کہلائے گا۔" یہ جنون صرف یورپ تک ہی محدود نہ رہا بلکہ دور دراز کے جزیروں تک پہنچ گیا۔ اس لیے کہ عیسائیوں نے اعلان کر دیا تھا۔

"اے نوجوان سپاہیو! تم تو اپنے نیزوں سے شکست دو گے۔ اور ہمیں اپنے دکھ درد کی وجہ سے فتح میں شریک ہونے کا موقع دو گے۔"

اس کے نتیجے میں تیرہ لاکھ عیسائی فلسطین پر قبضے کے لیے چڑھ دوڑے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پورا یورپ ایشیا پر حملہ آور ہو گیا ہے۔ ان مقدس غارت گروں نے ہنگری اور بلغاریہ میں شدید لوٹ مار کی۔ قسطنطنیہ کی شہزادی کا بیان ہے کہ یہ لوگ غارت گروں کے سامنے جو بھی آتا اس کی ٹھکائی کر ڈالتے تھے۔ اس طرح یہ لوگ مقامی لوگوں سے لڑتے جھگڑتے قسطنطنیہ پہنچے۔ اس وقت قیصر الیکس نے انہیں ایشیائے کوچک کی طرف دھکیل دیا۔ یہاں ان کی دھلائی اور پٹائی ہوئی۔ قونیہ کے فاتح ارسلان سلجوقی نے انہیں جانوروں کی طرح قتل کر دیا۔

پھر ۱۵ اگست ۱۰۹۶ء کو یورپی حکومتوں کی باقاعدہ افواج ایشیا کے ساحل پر اتریں۔ ان میں فرانس، برطانیہ، اٹلی، سسلی اور جرمنی کی فوجیں شامل تھیں۔ ان کی قیادت گاڈفرے، ریمنڈ، بوہیمنڈ، ٹینکرڈ اعظم، کاؤنٹ ٹولوز، رابرٹ نارمنڈی اور ہیگو آف ورمنڈ جیسے سالار کر رہے تھے۔ فوجوں کی تعداد تقریباً دس لاکھ تھی۔ صلیبیوں نے قونیہ کا محاصرہ کیا۔ سلطان امیر ارسلان نے مقابلہ کیا مگر شکست اٹھانا پڑی۔ تو یہ صلیبی غارت گر انطاکیہ کی طرف بڑھے۔ امیر فیروز نے غداری کی اور انہیں راستہ دے دیا۔ صلیبی لشکر رات کے وقت شہر میں داخل ہوئے اور دن بھر مسلمانوں کا قتل عام کرتے رہے۔ انہوں نے مسلمانوں کے مکانات تک مسمار کر دیے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس قتل عام میں دس ہزار مسلمان شہید ہوئے۔

اس کے بعد یہ غول معرۃ النعمان پہنچے اور اسے فتح کر کے تین دن تک قتل عام کرتے رہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ وہاں ایک لاکھ آدمی قتل اور اسی قدر گرفتار ہوئے۔ پھر یہ سالار افضل بدر جمالی نے مقدس پر چڑھائی کر دی۔ چالیس دن کے محاصرے کے بعد شہر فاطمیوں کے قبضے میں آ گیا اور افتخار الدولہ حاکم شہر بنا دیا گیا۔ پھر ۱۰۹۹ء میں صلیبی کوہستان کی طرف سے شہر میں داخل ہو گئے۔ مسلمانوں نے مسجد اقصیٰ میں پناہ لی۔ عیسائیوں نے پہلے شہر میں قتل عام کیا پھر مسجد کا رخ کیا اور بوڑھے، جوانوں اور بچوں تک کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر شہید کر دیا۔ ایک گروہ محراب داؤد میں جا پہنچا۔ حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر دیے گئے۔ معصوم بچوں کو فصیلوں پر سے پٹخ کر مار دیا گیا۔ علما کرام پر تیل اور نفط چھڑک کر جلا دیا گیا۔

ایک بیان کے مطابق صرف مسجد اقصیٰ اور محراب داؤد میں لوگوں کی تعداد ساٹھ ہزار سے زیادہ تھی مگر مورخین یہ تعداد ستر ہزار بتاتے ہیں۔ جنگ کا اختتام ہوا تو گھٹنوں تک گلیوں میں خون کا دریا بہہ رہا تھا۔ اس قتل عام کے بعد تیسرے دن مسلمان قیدیوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ مشہور مورخ اسٹینلے پول لکھتا ہے کہ صلیبی بیت المقدس میں گھس گئے اور وہاں موجود تمام مسلمانوں کو قتل کر دیا۔ یہودیوں کو گرجا ہی میں جلا کر ختم کر دیا گیا۔

ٹنکرڈ نے تین سو قیدیوں کو جان کی امان دی تھی۔ وہ بیچارے بھی نہ بچ سکے اور ان قیدیوں کو قتل کر دیا گیا۔ پھر ایک قتل عام ہوا جس میں بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو ریزہ ریزہ کر دیا گیا۔

شیخ سعدیؒ نے اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ

"جو عیسائی بیت المقدس میں داخل ہوئے انہیں انسان کہنا انسانیت کی توہین ہے۔"

اسی طرح ایک عینی شاہد لیانی نے لکھا ہے۔

"ہمارے صلیبی راستوں اور مکانوں کی چھتوں پر دوڑ رہے تھے اور اس شیرنی کی طرح جس کے بچے چھن گئے ہوں۔ قتل عام کر کے خوش ہو رہے تھے۔ بچوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہے تھے۔"

ایک دوسرا شاہد بیان کرتا ہے۔

"بیت المقدس کے راستوں میں ہاتھوں، رانوں کے انبار لگ گئے تھے۔ چلنے کا راستہ نہ تھا۔ چلنے والوں کو لاشوں پر سے گزرنا پڑتا تھا۔ کسی کا ہاتھ، کسی کا پیر اور کسی کا دھڑ۔ ایک طوفان شیطانی برپا تھا۔ یہ قتل عام آٹھ دن جاری رہا۔ عورتیں، بچے اور بوڑھے تمام کے تمام قتل کر دیے گئے۔"

مسجد اقصیٰ کی چاندی کی چالیس بڑی قندیلیں جن کا وزن ایک سو قتل شامی اور چھوٹی دو سو قندیلیں لوٹ لی گئیں۔ مسجد اقصیٰ کا مال غنیمت اس قدر تھا کہ چھ گاڑیاں بھی بھر جاتیں تو ختم نہ ہوتا۔

اس قتل عام کی اطلاع جب بغداد پہنچی تو اہل بغداد بیوہ عورتوں کی طرح سر کھلے گلیوں میں نکل آئے اور دہائی دی۔

"آہ! بیت المقدس میں قہر الٰہی نازل ہوئی۔"

خلیفہ مستظہر نے فوج بھیجی جو رستے سے علیحدہ طوفان سے پلٹ گئی۔ مصر نے امیر انجیوش کی سرکردگی میں ایک لشکر روانہ کیا لیکن وہ بھی شکست کھا گیا۔ یہ مصری لشکر بازاری اور ناتجربہ کار آدمیوں پر مشتمل تھا۔ چنانچہ جب دشمن نے حملہ کیا تو یہ جان بچا کر بھاگا اور دشمن نے آسانی سے اسے قید کر لیا۔ صرف چند سپاہی جان بچا سکے۔

اس المناک واقعہ کے نتیجے میں عیسائیوں نے چار عیسائی سلطنتیں قائم کیں اور ان کا سردار اعلیٰ

گا فرے یعنی بیت المقدس کا والی بنایا گیا۔ ان سلطنتوں کے نام یہ تھے۔

(۱) انطاکیہ (۲) طرابلس (۳) الرہا (۴) بیت المقدس

ان کے سردار اعلیٰ یعنی گاڈفرے نے اپنا لقب "محافظ قبر مسیح" رکھا مگر وہ کچھ عرصہ بعد یعنی ۱۸ جولائی ۱۱۰۰ء میں مر گیا۔ اس کی جگہ اس کا بھائی بالڈوین الرہا سے آ کر اس کا جانشین ہوا۔ وہ اپنی جگہ الرہا میں اپنے چچیرے بھائی بالڈوین برگ کو تخت نشین کر آیا تھا۔ عربی تاریخ میں اسے بردویل لکھا جاتا ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ بیت المقدس پر قبضہ کے بعد بھی عیسائی لشکر برابر آتے رہے لیکن مسلمان ان کے مقابلہ میں کوئی متحدہ محاذ قائم نہ کر سکے۔ ادھر عباسی خلافت بھی دم توڑ رہی تھی۔ پورے عرب میں بے شمار خود مختار ریاستیں قائم ہو گئی تھیں جو آپس میں لڑتی جھگڑتی رہتی تھیں۔ عیسائی ان ریاستوں پر قبضہ کر کے انہیں مسلمانوں سے خالی کرا لیتے تھے اور یہ مسلمان جنگل اور پہاڑوں میں پناہ لیتے تھے۔

لیکن ان مشکلات کے زمانہ میں بھی مسلمانوں کا ایمان چٹان کی طرح مضبوط رہا۔ انہیں یقین تھا کہ مصائب کے یہ دن عارضی ہیں اور جلد ہی پھر وہ وقت آ جائے گا جب مسلمان پھر سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیم کو عام کریں گے اور اس یقین کو عملی صورت میں پیش کرنے کے لیے بہت سے دل اور ایمان والے کمر کس کے کھڑے ہو گئے اور انہوں نے لشکری بھیڑیوں کا منہ پھیر کے رکھ دیا۔ ایسے ہی شجاع اور ایمان والے لوگوں میں ریاست موصل کے والی اتابک عمادالدین زنگی کا نام سب سے اوپر ہے۔ چنانچہ عمادالدین زنگی نے عیسائیوں کی ایک زبردست ریاست "الرہا" کو شکست دے کر اس پر قبضہ کر لیا۔ الرہا کی شکست سے پورے یورپ اور عیسائی دنیا میں کہرام مچ گیا۔ چنانچہ پاپائے روم نے عیسائیوں کو نہ صرف شرم و غیرت دلائی بلکہ ان کے اندر اس قدر اشتعال پیدا کر دیا کہ وہ ایک بار پھر مسلمانوں کے سامنے میدان میں کود پڑنے کو تیار ہو گئے۔

پس ایک طرف سے فرانس کا فرماں روا لوئی سابع اور دوسری طرف سے المانیہ کا کونراڈ ثالث اپنے لشکروں کو لے کر بیت المقدس کی طرف بڑھے۔ پہلے کونراڈ اپنے لشکر کے ساتھ مسلمانوں کے مقابل ہوا لیکن مسلمانوں کے ہاتھوں شکست کھا کر قتل ہو گیا۔ اس کے شکست خوردہ لشکری بھاگے تو انہیں فرانسیسی لشکر آتے ہوئے مل گیا اور یہ بھگوڑے ان کے ساتھ ہو گئے۔ مگر جب مسلمانوں کا سامنا ہوا تو دونوں کو خوب مار پڑی اور یہ شکست کھا کر بیت المقدس پہنچے۔ یہ ۱۱۴۷ء کا زمانہ تھا۔ دمشق پر مجیرالدین ابق حکمرانی کر رہا تھا۔ اس پر حملہ کیا لیکن عمادالدین زنگی کے دونوں بیٹے سیف الدین اور نورالدین محمود نے انہیں شکست سے دوچار کیا اور یہ پسپا ہو کر بھاگ گئے۔ یہ دوسری صلیبی جنگ تھی۔

دوسری صلیبی جنگ میں عیسائیوں کا کس قدر نقصان ہوا اس کا حال ایک عینی شاہد کی زبانی سنیئے۔

"یورپ کے شہر اور قصبے خالی ہو گئے تھے۔ اس مقدس آگ (صلیبی جنگ) کا ایندھن بننے کے لیے اتنی کثیر تعداد یورپ سے روانہ ہوئی تھی کہ ان کے پیچھے سات عورتوں کے مقابلے میں صرف ایک مرد نظر آتا تھا۔ پھر جب انہیں خبر پہنچی کہ ان کے شوہر، بھائی اور بیٹے اب کبھی واپس نہ آ سکیں گے تو پورا یورپ نالہ و شیون سے گونج اٹھا۔"

یورپی مورخین کہتے ہیں اور سچ ہی کہتے ہیں کہ دوسری صلیبی جنگ سے یورپ کا سر صرف نیچا ہی نہیں بلکہ بیت المقدس کی لاطینی ریاست بھی کمزور

ہو گئی اور اگر نورالدین کی موت چالیس دن اور مہلت دیتی تو بیت المقدس میں عیسائی سلطنت کا خواب بھی شرمندہ تعبیر نہ ہوتا۔

عمادالدین کا بیٹا نورالدین زنگی ایمان کی دولت سے مالا مال تھا۔ اس نے اعلان کر رکھا تھا کہ وہ ملک شام سے عیسائیوں کو نکال کے رہے گا مگر موت نے اسے مہلت نہ دی اور اس کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔

نورالدین زنگی نے اپنی فوج کو منظم کیا اور قرب و جوار کی ریاستوں کو اپنا تابع بنا لیا۔ پھر اس نے شام اور جزیرہ ایک متحدہ ریاست بنائی اور اس نے مصر میں اثر و رسوخ حاصل کیا اور اس کا یہ قدم ہی مستقبل میں مسلمانوں کی خوش بختی کا باعث بنا۔ اس مجاہد کو ہر وقت جہاد کا خیال رہتا تھا مگر اس نے عیاری اور مکاری سے کام نہیں لیا بلکہ عیسائیوں کو ہمیشہ للکار کر مارا۔

نورالدین زنگی نے عیسائیوں کو جب اور جہاں بھی شکست سے دوچار کیا وہاں وہ ہمیشہ کامیاب اور کامران رہا۔ پھر اس کا ایک نوجوان شمشیر زن یوسف جسے نورالدین زنگی نے زبردستی مصر بھیجا تھا وہ اس قدر تیغ زنی اور شمشیر زنی کا مالک ہوا کہ جس کا جواب مسلمانوں کی تاریخ میں مشکل ہی سے مل سکے گا۔ یہ نوجوان سال اور جواں عمر اپنی شجاعت، دلیری اور بے مثال بہادری کی بدولت سلطنت مصر کا حاکم ہوا بلکہ وہ سلطان صلاح الدین ایوبی کے نام سے اس قدر مشہور ہوا کہ جس کی مثال دنیا مشکل سے ہی پیش کر سکے گی۔ صلاح الدین کے جوہر نورالدین زنگی کی زندگی ہی میں نمایاں ہونے شروع ہو گئے تھے مگر اس کے اصل جوہر اس وقت اپنے آقا اور مربی کی موت کے بعد پوری طرح کھل کر سامنے آئے۔ تاریخ اسلام اب تک سلطان صلاح الدین ایوبی کا جواب پیدا نہیں کر سکی۔

قاضی ابن شداد، سلطان صلاح الدین ایوبی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"جہاد کی محبت اور جہاد کا عشق ان کے رگ و ریشہ میں رچا ہوا ان کے قلب و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ جہاد ان کا محور اور ان کی گفتگو کا اول و آخر ہوتا تھا۔ صلاح الدین ہر وقت جہاد کی تیاریوں میں خود کو مصروف رکھتے تھے اور اسباب و وسائل کی پرکھ کرتے رہتے تھے۔ اس مطلب کے آدمیوں کی انہیں ہر وقت تلاش رہتی تھی۔ وہ ہمیشہ جہاد کی ترغیب دینے والے کی تلاش میں رہتے۔ اسی جہاد فی سبیل اللہ کی خاطر انہوں نے اہل خاندان، وطن، مسکن اور تمام ملک کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ انہوں نے سب کی مفارقت گوارا کی اور ایک خیمہ کی زندگی پر قانع رہے۔ کسی شخص کو اگر ان کا قرب حاصل ہوتا تھا تو وہ ان کو جہاد کی ترغیب دیتا اور اس طرح ان کی نظروں میں وقعت حاصل کرتا۔ اس بات کی قسم کھائی جا سکتی ہے کہ جہاد کا سلسلہ شروع ہونے کے بعد ان کا جہاد نے ایک پیسہ بھی جہاد یا مجاہدین کی امداد و اعانت کے علاوہ کسی اور مصرف میں خرچ نہیں کیا۔"

سلطان صلاح الدین کی دردمندی اور ایمان داری کی تصویر قاضی ابن شداد نے ان الفاظ میں بھی کھینچی ہے۔

"جب سلطان صلاح الدین ایوبی میدان جنگ میں ہوتے تو ان کا حال ایک غمزدہ ماں کی طرح ہوتا تھا جس نے اپنے اکلوتے بیٹے کا غم اٹھایا ہو، وہ ایک صف سے دوسری صف تک دوڑتے پھرتے اور لوگوں کو جہاد کی ترغیب دیتے۔ وہ خود ساری فوج میں گشت کرتے اور پکارتے پھرتے۔

"اسلام کی مدد کرو...... اسلام کی مدد کرو۔"

ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے...... شاہی طبیب نے مجھے بتایا کہ ایک مرتبہ جمعہ سے اتوار تک

سلطان نے صرف چند ٹکڑے کھائے۔ اُن کی طبیعت میدان جنگ کے علاوہ کسی اور طرف راغب ہی نہ ہوتی تھی۔

اسی طرح لین پول لکھتا ہے۔

"صلاح الدین نے اپنی تیغ کی تمام کوشش اس بات پر صرف کی کہ ایک اسلامی سلطنت قائم کی جائے جس میں کفار کو ملک سے خارج کرنے کی پوری طاقت ہو۔"

سلطان صلاح الدین ۱۱۶۹ء میں مصر کے وزیراعظم بنے اور اسی سال ستمبر میں فاطمی خلیفہ العاضد کا انتقال ہوا۔ اس کی موت پر صلاح الدین ایوبی نے سلطنت مصر کو عباسی خلافت کے تحت کر دیا۔ بعض شرپسندوں نے ملک میں فساد برپا کرنا چاہا لیکن صلاح الدین کی عقل و دانش نے ایسی تمام سازشوں کو ناکام بنا دیا۔ شام و مصر متحد ہو گئے اور عیسائی سکندریہ میں شکست کھانے کے بعد صلح کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس کے نتیجے میں بارہ سالہ معاہدہ وجود میں آیا لیکن عیسائیوں نے معاہدہ سے انحراف کیا۔ اس کے باوجود سلطان نے کوئی جوابی یا انتقامی کارروائی نہ کی۔ البتہ مدافعتی جنگیں جاری رہیں۔ لیکن جب سلطان نے نواحی علاقوں پر تسلط پایا تو عیسائیوں پر کاری ضرب لگانے کے انتظامات شروع کر دیے۔

اس بات سے دشمن بھی انکار نہیں کرتے کہ سلطان نے کبھی کسی معاہدہ کے خلاف کوئی قدم اٹھایا۔ اس کے برعکس عیسائی متواتر خلاف ورزیاں کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ اس معاہدہ صلح کی خلاف ورزی کرتے ہوئے والی کرک ارناط نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر حملے کا ارادہ کیا اور روضہ اطہر کے بارے میں اپنے مذموم عزائم کی تکمیل کے لیے فوجیں جہاز کے ساحل پر اتار دیں۔

ہیرالڈ لیم لکھتا ہے کہ اس حملے کا منصوبہ کافی دیر سے اس (ارناط) کے ذہن میں پرورش پا رہا تھا۔ وہ اپنے سنگین قلعہ میں بیٹھا جہاز تیار کر رہا تھا۔ جہازوں کے مختلف حصے قلعہ میں بنا کر بحیرہ روم میں پہنچائے جاتے۔ دوست بدو اور سادہ لوح عرب اس پراسرار سامان کو اونٹوں پر لاد کر بحیرہ قلزم کے شمال میں پہنچا جاتے۔ وہاں اس نے ان مختلف پرزوں کو جوڑ کر جہاز بنائے اور بحیرہ قلزم پر مسلمانوں کی بندرگاہ ایک کو اپنے محاصرے میں لے لیا۔ یہ بندرگاہ اور علاقہ پچھلے پانچ سو سال سے اسلامی تسلط میں تھا۔

یہ عیسائیوں کی پہلی مداخلت تھی۔ ارناط (ریجی نالڈ) کے صلیبی ایک سال تک قتل و غارت گری میں مصروف رہے۔ یہ بحر ہند اور عدن، حبش، یمن پر امن حاجیوں کو لوٹنے کی تاک میں لگے رہتے۔ ایک عرب مورخ لکھتا ہے۔

"ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔"

پھر ایک مرتبہ عیسائی بھاگ کے یہ بحیرے مدینہ منورہ سے صرف ایک دن کے فاصلے تک پہنچ گئے۔ اس مقدس شہر کی سلامتی خطرے میں پڑ گئی تھی کہ سلطان کو خبر لگ گئی۔ وہ تڑپ اٹھا۔ اس نے فوراً اسلامی بحری بیڑے کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ اس بیڑے نے بڑی تیزی سے بڑھ کر ارناط کے لشکر کو جا پکڑا اور شکست دے کر قتل کر دیا یا قید کر لیا۔ یہ ارناط کی خوش قسمتی تھی کہ وہ وہاں سے بچ کر نکل بھاگا۔

عیسائیوں کے اس اقدام نے سلطان کو بہت تکلیف پہنچائی مگر عیسائی اپنی دیدہ دلیریوں اور بدمعاشیوں سے باز نہ آئے۔ آخر مجبور ہو کر سلطان صلاح الدین ایوبی نے کرک کی طرف کوچ کیا۔

پس تیرہ جولائی ۱۱۸۷ء تک حطین کے قریب ایک خونریز جنگ ہوئی جو ۴ جولائی کو شام کے وقت

اپنے عروج کو پہنچ گئی۔

اس سلسلے میں ہیرالڈ لیم صلیبیوں کی تباہی کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتا ہے۔

"حطین کے میدان میں گندم کے ڈھیر کی طرح عیسائیوں کی لاشوں کے انبار لگ گئے تھے۔ صلیب اعظم مسلمانوں نے چھین لی۔ قیدیوں میں ارناط (ریجی نالڈ) اور شاہ بیت المقدس بھی شامل تھے۔ صلاح الدین ایوبی نے اسے اپنے ہاتھوں جہنم رسید کیا اور اس گستاخ رسول سے شان رسالت ﷺ میں گستاخی کا انتقام لیا۔"

فتح کے بعد

پچھلے صفحات میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ تین اور چار جولائی ۱۱۸۷ء کو حطین کے میدان میں عیسائیوں نے شکست کھائی تھی اور انہوں نے صلح کی درخواست کی تھی۔ مگر سلطان نے انکار کر دیا تھا اور شرط یہ رکھی تھی کہ اگر عیسائی یہ شہر خالی کر دیں تو انہیں زراعت کے لیے زمین دی جائے گی مگر بڑا پادری اس شرط پر رضامند نہ ہوا اور مسلمانوں نے مجبور ہو کر شہر پر حملہ کر دیا۔ مسلمانوں کو چودہ جولائی ۱۰۹۹ء کو عیسائیوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا جو قتل عام ہوا تھا وہ آج بھی یاد تھا لیکن سلطان بڑے پادری کی درخواستوں سے نرم پڑ گیا اور اس نے صلح اس شرط پر کی کہ چالیس دن کے اندر ہر مرد دس دینار، ہر عورت پانچ دینار اور ہر بچہ ایک دینار زر فدیہ ادا کرے اور شہر سے نکل جائے ورنہ اسے غلام بنا لیا جائے گا۔

اس شرط کے تحت سلطان کو زر فدیہ کے تحت تیس ہزار دینار وصول ہوئے۔ جن لوگوں کے پاس کچھ نہ تھا انہیں بغیر زر فدیہ ادا کیے چھوڑ دیا گیا۔ ایک عیسائی کی روایت ہے کہ بیت المقدس میں رہ گئی۔ اس کے عوض سلطان نے اٹھارہ ہزار کو آزادی دے دی۔

روایت ہے کہ جب عیسائی ملکہ سبیلا شہر سے جاتے وقت سلطان سے ملنے آئی تو اس کی بڑی عزت و تکریم کی گئی۔ ملکہ کے ساتھ اور بہت سی خواتین تھیں جنہوں نے روتے بلکتے بچوں کو گود میں اٹھا رکھا تھا۔ ان خواتین نے درخواست کی کہ ان بچوں کے باپ رہا کر دیے جائیں۔ پس سلطان نے دس ہزار عیسائیوں کو جو زر فدیہ ادا نہیں کر سکتے تھے۔ سلطان نے خود ان کا زر فدیہ ادا کر کے انہیں رہائی دلائی۔

سلطان پادریوں کے ساتھ بہت عزت سے پیش آیا اور بڑا پادری مسجد اقصیٰ، مقبرہ اور دیگر عیسائی مقدس مقامات کا مال و متاع لے کر نکلا۔ سلطان نے اس سے کوئی تعرض نہ کیا۔ غرض یہ کہ سلطان نے عیسائیوں کے ساتھ ایسا شریفانہ سلوک کیا کہ عیسائی تاریخ اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ بقول لین پول، رحم دل سلطان نے صلیبیوں سے نرمی اور شفقت کا برتاؤ کر کے ان سے "شریف دشمن" کا لقب پایا۔

یہ شہر صلیبی دور میں عیاشی، فحاشی اور بدکاری کا مرکز بن گیا تھا۔ سلطان صلاح الدین نے فتح کے بعد عیسائیوں کو امن و امان دیا اور ان ستر ہزار مسلمانوں کا انتقام نہیں لیا جو ایک صدی قبل اسی بیت المقدس میں ذبح کر دیے گئے تھے۔

تاریخ متفق ہے کہ سلطان ہلالی پرچم لہراتا ہوا جمعہ کے دن تاریخ ستائیس رجب ۵۸۳ ہجری مطابق اکتوبر ۱۱۸۷ء بیت المقدس میں داخل ہوا اور مقدس مقامات پر صلیبوں کی جگہ ہلالی پرچم لہرا دیا۔

مصر میں سلطان کا اقتدار قائم ہوتے ہی فرنگیوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی تھی۔ انہوں نے اس سے مقابلے کے لیے اندلس اور سسلی کی حکومتوں سے مدد طلب کی تھی لیکن ان کی یہ مدد اس وقت پہنچی جب سلطان بیت المقدس پر قبضہ کر چکا تھا۔ اس کے باوجود عیسائیوں نے اس مدد کے زور پر دمیاط پر حملہ

کر دیا لیکن شکست کھا گئی۔

مسجد اقصیٰ میں نجاست

بیت المقدس کی فتح کے بعد غازی اسلام سلطان صلاح الدین نے مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کو نجاستوں سے پاک کر کے ان کے فرش اور دیواروں کو گلاب و مشک سے دھلوایا۔ ان مقدس مقامات پر صلیبیوں نے حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کی رنگین تصویریں بنا رکھی تھیں۔ انہیں ختم کرنے کے بعد جمعے کا خطبہ ہوا۔ ۴ شعبان ۵۸۳ ہجری کو قاضی محی الدین ابن زکی الدمشقی نے خطبہ دیا اور نماز پڑھائی۔ سلطان چوتھی شعبان ۵۸۳ ہجری تک شہر میں رہا اور بعد نماز جمعہ صلاح الدین صور کی طرف روانہ ہو گیا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ صلیبی دور میں فلسطین کی جو اخلاقی حالت تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہیملٹن آف جارٹر کے مطابق سارے فلسطین میں ایک عورت بھی نہیں تھی جسے باعصمت کہا جائے۔ صلیبیوں اور گرجا کے راہبوں کی زندگی میں جو تضاد تھا اس سلسلے میں اس کا بیان ہے کہ عام شہری محنت و مشقت کی زندگی بسر کرتے تھے مگر گرجوں کی دولت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اسقف اعظم ہرقلیس کے صندوق ہیرے جواہرات سے لبریز تھے۔ وہ دولت کا پجاری تھا اور اس کی زندگی حرص و ہوس کا افسانہ تھی۔

ہیرالڈ کے مطابق جو زمین عیسائی حکومت کی تھی وہ راہبانہ و جنگی کے جتھوں جیسی مذہبی اور نیم فوجی جماعتوں کے تصرف میں چلی گئی تھی۔ سرزمین قدس کے یہ خادم اس کے حقیقی مالک بن بیٹھے تھے۔ یہ جماعتیں براہ راست پاپائے روم کے ماتحت تھیں۔ قانون کے مجرم ان کے پاس پہنچ کر محفوظ ہو جاتے تھے۔ گائی ڈی لوسگنام بیت المقدس کا آخری حکمران تھا۔ اس سے پہلے آٹھ شاہ حکومت کر چکے تھے۔

پھر جب شکست خوردہ صلیبی بیت المقدس سے نکلے تو ان کا ایک گروہ مغرب کی طرف روانہ ہوا۔ وہ ہر جگہ یہ پیغام دیتا تھا۔

"اے عالم مسیحیت! دشمن یروشلم پر قابض ہو گئے ہیں... مقدس صلیب کھو گئی ہے... ہماری فوج برباد ہو گئی ہے۔"

پوری عیسائی دنیا میں آگ لگ گئی۔ پادری اور راہب تمام مسیحی دنیا کا دورہ کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ انہوں نے مقدس باپ کی دہائی دے دے کر لوگوں کو جنگ پر ابھارا۔ بیت المقدس کا اسقف اعظم جس کے ساتھ سلطان نے نہایت فیاضی کا سلوک کیا تھا، فرانس میں ایک تصویر لیے گھوما۔ اس تصویر میں جنگ مسیح کو زخمی حالت میں اور ایک مسلمان کو حملہ کرتے دکھایا گیا تھا۔

آخر یہ آگ بھڑک اٹھی۔ شاہ جرمنی فریڈرک نے سلطان کو خط لکھا۔

"اگر بیت المقدس عیسائیوں کے حوالے نہ کیا گیا تو میں اپنی ساری فوجیں لے کر تمہیں سزا دینے پہنچ جاؤں گا۔"

سلطان نے اس خط کا کوئی اثر نہ لیا۔ لیکن یورپ میں ایک خوفناک جنگ کی تیاریاں زور شور سے جاری رہیں۔ اور اس میں ہر عیسائی نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہ حد یہ کہ عورتیں بھی سپاہی بن گئیں اور قیصر جرمنی فریڈرک، شاہ انگلستان رچرڈ اول اور ڈیوک آف آسٹریا اپنی فوجوں اور رضاکاروں کے ساتھ سلطان صلاح الدین کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوئے۔ اور یہ تھی تیسری صلیبی جنگ...!

اس جنگ کی تیاری جس جوش و خروش سے کی گئی اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جنگ کے مصارف کے لیے انگلستان اور فرانس وغیرہ میں "عشر صلاح

الدین" کے نام سے ایک ٹیکس جاری کیا گیا۔ پادریوں نے فتویٰ دیا تھا کہ جو شخص اس کار خیر میں شریک نہیں ہو گا وہ مسیحیت سے خارج ہو جائے گا۔ مشہور مورخ گبن (گبن) لکھتا ہے۔

"صلاح الدین نے جب سے اپنی عظمت کا عروج اس ٹیکس کی شکل میں لیا وہ آج تک کسی تاج دار کو نصیب نہ ہو سکا۔ رچرڈ نے مصارف جنگ کے لیے اپنی جاگیر فروخت کر دی۔ بڑے بڑے عہدوں کو نیلام کیا گیا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر کوئی خریدار ہو تو لندن تک کو بیچنے کے لیے تیار ہوں۔"

جو لوگ کسی مجبوری کی بنا پر شریک نہ ہو سکے انہوں نے اپنے خرچ پر اپنی جگہ آدمی بھیجے۔ عورتوں نے اپنی انگوٹھیاں اور زیورات تک نذر کر دیا۔

بہرحال دو سال کی مکمل تیاری کے بعد یہ لشکر فلسطین کی طرف بڑھا۔ مورخین نے لکھا ہے۔

"یہ فوج نہیں بڑھ رہی تھی بلکہ ہتھیاروں اور سپاہیوں کا ایک سیلاب تھا جو عربوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جانے کے لیے امڈا آیا تھا۔"

اس لشکر کی تعداد بعض مورخین کے قول کے مطابق چھ لاکھ اور بعض کے خیال میں دس لاکھ تھی۔ جتنے یورپی اور مسیحی سربراہ اس جنگ میں شامل تھے کسی صلیبی محاربے میں اس سے پہلے شریک نہ ہوئے تھے اور اس متحدہ قوت کا سامنا صرف اور صرف سلطان صلاح الدین ایوبی کو کرنا تھا۔

اس کے مقابلے پر قیصر جرمنی تھا مگر اس بد ذات کو قدرت نے دریائے سالف عبور کرتے ہوئے ڈبو کر ختم کر دیا۔ اس طرح اس فوج کا ایک حصہ واپس چلا گیا۔ اب برطانیہ اور فرانس کی افواج فلسطین کے ساحل پر اتریں اور انہوں نے عکہ کا محاصرہ کر لیا۔ پھر جرمنی والے بھی ان سے آملے۔ اس طرح محاصرہ کرنے والوں میں آسٹریا، اٹلی، برطانیہ، اسپین، فرانس وغیرہ کے فوجی دستے صلیبی رضاکاروں میں شامل ہو گئے۔ مگر محصورین نے تمام ناموافق حالات کے باوجود تین سال تک حملہ آوروں کا مقابلہ کیا اور آخر مسلمان سلطان تک نے ہتھیار ڈال دیے اور وہ لاکھ دینار ادا کرتے ہوئے صلح کر لی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ محاصرہ کے ان تین سالوں کے دوران سلطان نے محاصرین کو مدد پہنچانے کی تمام تدبیریں کیں اور ایک مرتبہ محاصرہ توڑ کر ان تک مدد پہنچائی بھی مگر محصورین نے حوصلے چھوڑ دیے تھے۔ دوسری طرف فرنگی بحری بیڑے کی حفاظت، مضبوطی، افواج میں بیماری اور بعض دیگر اسباب کی بنا پر محصورین کی مزاحمت نہ کی جا سکی اور عکہ کے باسیوں نے ہتھیار ڈال دیے۔

سلطان کو اس خبر سے شدید صدمہ ہوا۔ رچرڈ جسے شیر دل کہا جاتا ہے۔ اس نے معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے نہ صرف اسیران جنگ کو بلکہ سفیروں اور یرغمال میں آئے ہوئے امیروں تک کو شہید کر دیا۔ صلیبیوں کی اس بد عہدی پر مورخ لین پول لکھتا ہے۔

"بجائے اس کے کہ خدا عیسائیوں کو چھوڑتا، عیسائیوں نے خدا کا دامن چھوڑ دیا۔"

اس سلسلے میں ہیرالڈ لیم نے سلطان کے بارے میں تبصرہ کیا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

"سلطان صلاح الدین پر صد آفریں کہ اس عالی حوصلہ انسان نے صرف اعلانیہ جنگ میں دشمن سے بدلہ لیا۔"

اس سے زیادہ تعجب کی یہ بات ہے کہ جب رچرڈ نے سلطان سے سامان خوراک کی درخواست کی تو سلطان نے اسے ٹھکرایا نہیں بلکہ شریف دشمن ہونے کا ثبوت دیا۔ مگر اس پر بھی تہذیب کے علم بردار

فرنگیوں کو حیا نہیں آئی۔

عکہ کو تباہ و برباد کرنے کے بعد صلیبی لشکر نے عسقلان کا رخ کیا۔ سلطان نے مقابلہ کے بجائے ایک اور حکمت عملی اختیار کیا کہ پورے شہر عسقلان کو گرا کر زمین کے برابر کر دیا۔ اس لیے جب صلیبی لشکر وہاں پہنچا تو اس کا استقبال شکستہ عمارتوں اور کھنڈرات نے کیا۔

عیسائی لشکر اس سے بہت بد دل ہوا۔ رچرڈ اگرچہ دل چھوڑ بیٹھا تھا مگر اس نے پھر بھی بیت المقدس پر حملہ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی رچرڈ نے جنگ سے نجات پانے کے لیے سلطان کو ایک تجویز لکھ کے بھیجی۔ اس تجویز میں درج تھا کہ:

"رچرڈ کی بہن کی شادی، سلطان صلاح الدین کے بھائی ملک العادل سے کر دی جائے۔ اور سلطان بیت المقدس ملک العادل کو دے دے۔"

سلطان نے رچرڈ کی تجویز کو منظور کر لیا لیکن اس سے یورپ میں کہرام مچ گیا۔ عیسائیوں نے رچرڈ کو مسیحیت سے خارج کرنے کی دھمکی دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پھر سے جنگ چھڑ گئی۔ فرنگی لشکر بیت المقدس کی طرف بڑھا مگر اس کی دیواروں سے ٹکرا کر ناکام و نامراد لوٹ گیا۔ اس سے عیسائیوں میں بددلی پھیلی اور وہ باہم دست و گریباں ہو گئے۔"

رچرڈ نے ایک بار پھر صلح کی کوشش کی اور دو ستمبر ۱۱۹۲ء کو سلطان صلاح الدین کے بھائی ملک العادل اور رچرڈ نے معاہدہ صلح پر دستخط کر دیے۔

اس معاہدہ کے تحت یافا، لد، رملہ، قیساریہ، ارسوف، حیفہ اور عکہ رچرڈ کا مقبوضہ اور عسقلان کو آزاد علاقہ قرار دیا گیا۔ طے پایا کہ تین سال تک تمام عیسائی زائرین محصول ادا کیے بغیر بیت المقدس کی زیارت کر سکیں گے۔

اس طرح مسلسل پانچ سال تک خون ریز لڑائیوں کے بعد تیسری صلیبی جنگ کا اختتام ہوا۔ اس جنگ میں یورپ کے لاکھوں آدمی، سینکڑوں نامور امرا اور علما دین متعدد بادشاہ کام آئے۔ بے اندازہ دولت برباد ہوئی۔

بچاؤ نے اس طرح لکھا ہے۔

"یورپ کی تمام متحد طاقتوں نے عکہ کی فتح اور عسقلان کی بربادی سے زیادہ کچھ حاصل نہ کیا۔"

عرب مورخین کا بیان ہے کہ:

"عکہ کے سامنے چھ لاکھ کروسیڈ کام آئے اور مشکل سے ایک لاکھ اپنے گھروں کو واپس جا سکے۔"

لین پول کا بیان ہے۔

"جولائی ۱۱۸۷ء حطین پر مسلمانوں کی فتح سے قبل دریائے اردن کے مغرب میں مسلمانوں کے پاس ایک انچ زمین نہ تھی۔ ستمبر ۱۱۹۲ء میں جب صلح ہوئی تو صور سے لے کر یافا تک جو ایک پتلی سی پٹی کے سوا ملک مسلمانوں کے قبضہ میں تھا اور فرنگیوں کو اپنی جانی اور مالی قربانیوں کے مقابلے میں جو کچھ حاصل ہوا وہ نہایت ہی حقیر تھا۔"

مورخین کے بقول یورپ کے ہر قریہ اور گھر میں نالہ و ماتم برپا ہو گیا۔ اس سلسلے میں ہیرالڈ لیم نے لکھا ہے کہ:

"برسوں کی خونریزی کے بعد بھی انہیں اپنے مقامات مقدسہ میں سے کسی پر بھی قبضہ نصیب نہ ہوا۔"

اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت ہے کہ سلطان نے یہ جنگ بے انتہا نامساعد حالات میں لڑی تھی۔ اس کی فوج خود سر ہو گئی تھی۔ جنگ کے دوران عرب قبیلوں میں گھس آتے اور لوٹ مار کر کے بھاگ جاتے تھے۔ پھر جب سلطان نے اپنی فوج کے منصوبے پرزوں کو نکال باہر کیا تو رچرڈ نے صلح کی پیش کش کر دی۔ سلطان مکمل اور فیصلہ کن فتح کا خواہاں تھا۔ اس نے

بہاؤالدین سے صاف الفاظ میں کہا تھا۔

"میں صلح کرنے سے ڈرتا ہوں۔ نہ جانے میری موت کے بعد حالات کیا ہوں۔"

لیکن سلطان کی فوج جنگ سے بیزار ہو چکی تھی اور آخر کار حالات نے اسے مجبور کر دیا۔

مورخین اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ سلطان صلاح الدین ایوبی نے میدان جنگ میں بھی اپنے دشمن کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے یا اس پر اوچھا وار کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ پھر جب رچرڈ نے بیت المقدس پر قبضہ کرنے کے لیے حملہ کیا تو سلطان نے اس کے گھوڑے کو زخمی ہوتے دیکھا اور فوراً اسے خوب صورت عربی گھوڑے بھجوائے تاکہ وہ یہ نہ کہہ سکے کہ اس کا گھوڑا کمزور تھا۔

ہیرالڈ لیم لکھتا ہے۔

"سلطان صلاح الدین جنگ کے دوران بھی ایسا ہی فراخ دل اور بردبار رہا جیسا کہ وہ جنگ سے پہلے تھا۔ جب رچرڈ نے سلطان کو لکھا کہ فرانسیسی معاہدے کے فریق نہیں، اس لیے انہیں یروشلم کی زیارت کی اجازت نہ دی جائے تو سلطان نے جواب میں لکھا کہ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے تمام عیسائیوں کو زیارت کی اجازت بخش دی ہے۔ پھر انہیں کیسے محروم کر دوں؟"

بشپ آف سالسبری نے منہ مانگی مراد پائی۔ اس نے پادریوں کے مزار مقدس میں قیام کی اجازت مانگی اور سلطان نے فوراً اجازت دے دی۔

سلطان کی واپسی

جب رچرڈ ساحل شام سے چلا گیا تو سلطان حرم مقدس میں آیا۔ اس نے تمام امیروں کو جمع کیا اور انہیں ایک ایک کر کے رخصت کر دیا۔ سلطان نے پچھلے کئی سال سے روزے نہیں رکھے تھے۔ پس اس نے القدس میں قیام کے دوران مسلسل روزے رکھے۔ اس سے اس کی صحت بگڑ گئی۔ طبیب خاص نے اسے باوجود نقاہت اس سے روکنے کی سخت کوشش کی لیکن سلطان نے یہ مشورہ قبول نہ کیا اور کہا۔

"معلوم نہیں کہ آئندہ کیا ہو؟"

پس سلطان نے مسلسل روزے رکھے اور پورا کفارہ ادا کر دیا۔ اس نے اس قیام میں شہر پناہ کی مرمت کرائی۔ خندق کھدوائی۔ نئے اوقاف قائم کیے اور بیت المقدس کا انتظام امیر عز الدین جردیک کے سپرد کر کے دمشق روانہ ہو گیا۔

مجاہد اعظم کی وفات

تاریخ ناقل ہے کہ اس سال سلطان نے اپنی نقاہت کے باوجود دمشق سے باہر نکل کر حج سے لوٹنے والوں کا پرتپاک استقبال کیا۔ وہ اگلے سال خود بھی حج کے لیے جانے کا ارادہ کر رہا تھا لیکن تین مارچ ۱۱۹۳ء میں ملک الناصر سلطان صلاح الدین نے وفات پائی۔

بازاروں میں سناٹا چھا گیا۔

آج وہ عظیم الشان انسان موت کی آغوش میں سو گیا تھا جس نے بیس سال تک دنیائے اسلام کی نیابت قدرت سے قیادت کی تھی۔

شیخ ضیاء الدین ابوالقاسم نے غسل دیا اور دمشق کے باغ کی بارہ دری میں عصر کے وقت اس جگہ دفن کیا جہاں انہوں نے انتقال کیا۔ جو تلواریں جہادوں میں ان کے زیب کمر تھیں۔ وہ ان کے برابر رکھ دی گئیں اور وہ انہیں اپنے ساتھ جنت میں لے گئے۔

سلطان نے ہر چیز ختم کر دی تھی۔ وہ خالی ہاتھ اس دنیا سے گئے۔ وہ کہتے تھے کہ انسان خالی ہاتھ آتا ہے اس لیے اسے خالی ہاتھ ہی جانا چاہیے۔ سلطان کے کفن دفن کے لیے بھی قرض لیا گیا یہاں تک کہ ان

کی قبر میں جو لکڑیاں لگیں وہ بھی قرض سے منگوائی گئی تھیں۔ ان کی موت سے ہر طرف سناٹا سا چھا گیا تھا۔ لوگ جب بولتے تو آہستہ آواز میں گفتگو کرتے تھے۔ دفن کے بعد ہر شخص خاموشی سے اپنے گھر چلا گیا۔ سڑکوں اور کوچہ بازار میں سناٹا سا طاری معلوم ہوتا تھا۔

طبیب عبداللطیف کا بیان ہے کہ اس کے علم میں صرف سلطان کی شخصیت ہے جس کے لیے واقعی رعایا نے ماتم کیا۔

❁❁❁

پاپائے روم انوسنٹ ثالث نے صلیبیوں کے جذبہ جہاد کو زندہ رکھا اور جنگ کی تیاریاں ہوتی رہیں۔ پوپ ایک اشتعال انگیز اور آتش بیان مقرر تھا۔ وہ کہتا تھا۔

"یروشلم کی رہائی مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے۔"

پوپ نے مسیحی برادری کو خبردار کیا کہ مسلمان یروشلم کے قبضے کے بعد مسیحیت کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی تدبیریں کریں گے۔ اس کی ان باتوں کا یہ اثر ہوا کہ عیسائی دوشیزائیں سرزمین قدس کو آزاد کرانے کا حلف اٹھانے والوں کو تلاش کرتی پھرتی تھیں۔ اس دوران ہنری شیمپین نے ۱۱۹۸ء سے ۱۲۰۴ء کے دوران ساحل فلسطین پر حملے کیے مگر اسے کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ پھر ۱۲۰۴ء میں کاؤنٹ بالڈون کی سالاری میں جرمنی، فرانس، یورپ کے، انگلستان، روم بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سارے یورپ کی متحدہ فوجیں قسطنطنیہ پہنچیں اور قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا۔ ان کے جنون کا یہ عالم تھا کہ وہ ایک فرانسیسی لڑکے کی قیادت میں یروشلم کو کافروں سے چھڑانے کے لیے روانہ ہوئے مگر ان کا برا حشر ہوا۔ اس لشکر میں بارہ بارہ سال اور چودہ چودہ سال کے لڑکے اور لڑکیاں تھیں اور ان کی مجموعی تعداد تقریباً نوے ہزار تھی۔ یہ لشکر جس شہر سے گزرتا لوگ اس سے نیک فال لیتے اور کہتے۔

"اب یروشلم آزاد ہو جائے گا۔"

مگر اس کا انجام یہ ہوا کہ بچیوں کی عصمتیں لوٹی گئیں اور لڑکوں کو غلام بنا کر بیچ دیا گیا۔ باقی بچے لڑکوں نے اطالوی شہروں اور قصبوں میں نوکریاں کر لیں۔

اس انجام تک پہنچنے کے باوجود یورپ کا صلیبی جنون سرد نہیں ہوا تھا۔ پورے یورپ میں صلیبی جنگوں کی زور شور سے تبلیغ ہو رہی تھی۔ پھر ۱۲۱۵ء میں پاپائے روم نے ایک کانفرنس بلائی اور ایک نئی جنگ کے لیے جون ۱۲۱۷ء کی تاریخ مقرر ہوئی۔ اس کے نتیجے میں ایک صلیبی لشکر شاہ ہنگری کی قیادت میں ساحل عکہ پر لنگر انداز ہوا۔ اس کے بعد اور لشکر آئے اور ان کا مقابلہ صلاح الدین ایوبی کے بھائی الملک العادل سے ہوا۔ اس کی عمر ۷۰ سال کی ہو چکی تھی مگر اس کے باوجود صلیبی لشکر ساحلی علاقوں سے آگے نہ بڑھ سکا۔

اس دوران الملک العادل کا انتقال ہو گیا۔ اس کا بیٹا الملک الکامل جانشین ہوا۔ سلطان دمشق نے حرم مقدس اور محراب داؤد کی دیواروں کے علاوہ بیت المقدس کی تمام فصیلیں گرا دیں تاکہ دشمن شہر کو قلعہ بنا کر زیادہ نقصان نہ پہنچائے۔ لیکن صلیبی المقدس تک نہ پہنچ سکے۔ پھر بھی انہوں نے دمیاط پر قبضہ کر کے مسلمانوں کا خون بہایا اور مسجدوں کو گرجوں میں تبدیل کر دیا۔

اس فتح کے بعد پچاس ہزار سے زیادہ صلیبی قاہرہ کی طرف بڑھے۔ الملک الکامل گھبرا گیا اور اس نے فوراً صلح کی پیش کش کر دی اور وعدہ کیا کہ اگر دمیاط واپس کر دیا جائے تو وہ یروشلم کو عیسائیوں کے

حوالے کر دے گا مگر عیسائی رضا مند نہ ہوئے اور انہوں نے مطالبہ کیا کہ کرک اور ماؤنٹ ریال بھی ان کے حوالے کیا جائے۔

اس اختلاف نے جنگ کی صورت اختیار کر لی اور منصورہ کے قریب میدان کارزار گرم ہوا۔ اس لڑائی میں عیسائیوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور دمیاط خالی کر کے صلح پر آمادہ ہو گئے۔ الملک الکامل نے یافا سے تمیس تک کے علاقے پر فریڈرک ثانی کا قبضہ تسلیم کر لیا اور اس سال کے لیے معاہدہ ہو گیا۔ مگر فریڈرک ثانی نے پادریوں کی ناراضگی کی وجہ سے معاہدے سے آنا کانی شروع کر دی اور واپس جانے پر آمادہ ہوا۔ پھر ۱۲۲۳ء میں سسلی میں ایک نئی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں فریڈرک نے ۱۲۲۵ء میں کروسیڈ پر جانے کا حلف اٹھایا مگر ایک عرصہ تک اسے ٹالتا رہا۔ پھر وہ ۱۲۲۸ء میں فلسطین کی طرف روانہ ہوا مگر راستے میں بیمار ہو گیا اور اس نے سفر ملتوی کر دیا۔ اس پر پاپائے روم نے اس کے خلاف کفر کا فتویٰ جاری کر دیا اور پاپائی میں ہونے والی مذہبی رسومات معطل کر دیں۔ اس پر گھبرا کر فریڈرک واپس فلسطین کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ قبرص سے ہوتا ہوا عکہ پہنچا۔ اس وقت اس کے ساتھ ۲۵ ہزار کا لشکر تھا۔

ادھر الملک العادل نے بیٹوں کو خانہ جنگی سے بچانے کے لیے سلطنت ان میں تقسیم کر دی تھی۔ اس نے کرک، اردن، دمشق اور طبریہ اپنے بیٹے معظم کو دیے تھے۔ باپ کی وفات کے بعد الملک الکامل کے چھوٹے بھائیوں نے اسے اپنا سرپرست تسلیم کیا لیکن بعد میں ان میں اختلاف پیدا ہوا اور معظم باغی ہو گیا۔

جس وقت فریڈرک اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ ساحل فلسطین پر اترا تو المقدس پر معظم کا قبضہ تھا۔ اس نے فرنگیوں کو المقدس میں داخل نہ ہونے دیا۔ پھر ملک کامل نے معاہدہ ذیل شرائط پر بیت المقدس کو شاہ فریڈرک ثانی کے حوالے کر دیا۔ شرائط یہ تھیں۔

۱۔ فرنگی بیت المقدس کی شہر پناہ دوبارہ تعمیر نہیں کریں گے۔

۲۔ مسلمانوں کے مقامات مقدسہ مثلاً قبۃ الصخرہ اور مسجد اقصیٰ میں کوئی تعرض نہیں کریں گے۔

۳۔ بیت المقدس سے ساحل تک عیسائیوں کو راستہ دے دیا جائے گا۔

کامل نے دس سال کے لیے عارضی قبضہ دیا تھا مگر مسلمانوں نے اس کے خلاف نفرت کا اظہار کیا اور یہی چھٹی صلیبی جنگ کہلاتی ہے۔

مصر اور دمشق میں ٹھن گئی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب چنگیز خان دنیا پر چھایا جا رہا تھا۔ وہ خوارزمیوں کا تعاقب کرتا ہوا سرزمین فلسطین تک آ پہنچا تھا۔ فریڈرک اور الکامل میں دس سال کا معاہدہ ہوا تھا لیکن اس معاہدے سے دونوں فریق خوش نہ تھے۔ چنانچہ دوبارہ سے کا بادشاہ ساحل فلسطین پر پہنچا اور لوٹ مار کر کے واپس ہو گیا۔ اس کے جواب میں الکامل کے جانشین الناصر نے آگے بڑھ کر بیت المقدس کا محاصرہ کر لیا۔ وہاں عیسائیوں نے ایک قلعہ بنایا تھا جسے تباہ کر دیا گیا۔

(باقی آئندہ)

سازشی دشمن

اسرار احمد

انہوں نے ایک شخص سے اسی کی نقل کی مہارت لی اور پھر اپنا کام بھی خوش اسلوبی سے انجام دے دیا جب کام کی معاوضہ کی طرح کرنے کا وقت آیا تو پتا چلا کہ ان کی مسافت پہلے ہی پوری ہو چکی ہے

[illegible]

روڈ سنسان پڑا ہوا تھا۔ ہماری کار تیز رفتاری سے سنسان سڑک پر پھسلتی جا رہی تھی۔ آگے چوراہا تھا جس کا سگنل اپنی سرخ آنکھوں سے ہمیں گھور رہا تھا لیکن میں نے سگنل بند ہونے کی پروا نہ کی اور کار آگے بڑھا دی۔ گاڑی کو میں ڈرائیو کر رہا تھا جب کہ رنظرفی میرے برابر میں بیٹھا ہوا تھا۔ ہم دونوں ذرا دیر قبل ہی کیانا بن کے شراب خانے سے نکلے تھے اور شراب کے کئی پیگ ہمارے معدوں میں اترے ہوئے تھے۔

نشے کی زیادتی کے باعث اسٹیئرنگ وہیل پر میری گرفت خاصی کمزور تھی۔ گاڑی مست شرابی کی طرح لہراتی جھومتی آگے بڑھ رہی تھی۔ سگنل ابھی تک بند تھا۔ اصولاً مجھے رک جانا چاہیے تھا لیکن نشے کی زیادتی نے میرا دماغ ماؤف کر دیا تھا اور قانون کی پابندی کا خوف میرے دل سے نکل چکا تھا۔

جوں ہی گاڑی چوراہے کے وسط میں پہنچی بائیں جانب سے جدھر کا سگنل بند تھا ایک تیز رفتار موٹر سائیکل آئی اور سیدھی ہماری کار سے ٹکرا گئی۔ موٹر سائیکل سوار نوجوان ہی تھا اور اپنی دانست میں بالکل صحیح آ رہا تھا۔ اس کی موٹر سائیکل ہماری کار کے اگلے حصے سے ٹکرائی۔ دوسرے ہی لمحے موٹر سائیکل ایک طرف الٹی پڑی تھی اور دوسری جانب نوجوان موٹر سائیکل سوار زخمی حالت میں سڑک پر پڑا کراہ رہا تھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئی تھیں۔

میں نے ایک نظر نوجوان کے چہرے پر ڈالی اور گھبرا کر رنظرفی کی جانب دیکھا۔ اس کا چہرہ دہشت سے سفید پڑ گیا تھا۔

"بھاگ نکلو فوراً..." وہ بڑبڑایا۔ "ابھی کسی نے ہمیں نہیں دیکھا ہے۔"

میری انسانی حس بیدار ہو گئی۔ میرا دل چاہا کہ میں زخمی نوجوان کو اٹھاؤں اور گاڑی میں ڈال کر سیدھا اسپتال لے جاؤں لیکن دوسرے ہی لمحے مصلحت انسانیت پر غالب آ گئی اور ایسا کرنا خطرہ مول لینے کے مترادف تھا۔

میں نے رنظرفی کے مشورے پر عمل کیا اور گاڑی کو تیز رفتاری سے بھگا دیا۔ زخمی نوجوان حسرت بھری نگاہ سے ہماری طرف دیکھتا رہ گیا۔ اس کی کراہوں میں بے بسی شامل ہو گئی تھی لیکن میں نے ان کراہوں کی کوئی پروا نہ کی۔

گاڑی تیز رفتاری سے دوڑتی ہوئی چند ہی لمحوں میں جائے حادثہ سے بہت دور نکل آئی۔ میرا اور رنظرفی دونوں کا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔ یہ ایک زبردست ایکسیڈنٹ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ زخمی نوجوان بروقت طبی امداد نہ ملنے کی وجہ سے زندہ نہیں بچ سکا ہوگا۔ ہمارے حق میں سب سے بہتر بات یہ تھی کہ اب تک اس سڑک پر ہماری گاڑی کے علاوہ کوئی اور گاڑی نہیں گزری تھی۔

میں نے گاڑی کو فوراً ایک ویران جگہ پر کھڑا کر دیا اور گاڑی سے باہر نکل آیا۔ رنظرفی نے بھی میری تقلید کی۔ یہ گاڑی ہماری نہیں تھی نہ جانے کس کی تھی جسے ہم نے عارضی طور پر اڑا لیا تھا۔

مجھے یقین تھا کہ اگر زخمی نوجوان مرنے سے بچ گیا ہوگا اور اس نے کار کا نمبر نوٹ کر لیا ہوگا تو اس سے ہماری صحت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ پولیس زیادہ سے زیادہ اس نمبر سے کار کے اصل مالک تک پہنچ سکتی تھی۔ ہم تک نہیں آ سکتی تھی۔

بہرحال گاڑی سے اترتے ہی ہماری پوری کوشش یہی تھی کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے ہم دونوں گاڑی سے زیادہ سے زیادہ دور نکل جائیں۔ دوسری صورت میں یہ بھی ممکن تھا کہ کوئی شخص ہمیں اس گاڑی سے اترتے دیکھ لیتا اور بعد میں پولیس کو ہمارے بارے میں بتا دیتا۔ پولیس کے نزدیک ویسے بھی ہم کچھ نیک نام نہ تھے کئی مرتبہ چھوٹی موٹی چیزیں اڑا لینے اور پھر پکڑے جانے کی صورت میں ہم جیل کی ہوا کھا چکے تھے۔

میں اور رنظرفی دونوں ہی اس حادثے کے باعث بدحواس ہو گئے تھے۔

قریب کی گلی [illegible] ہم تک پہنچتے یہ حادثہ ہمارے ذہن سے نکل چکا تھا۔ ہم اسے بھول چکے تھے اور پھر سے اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے تھے۔

☆......☆......☆

شام کا وقت تھا۔ ہم دونوں کیانا بن بار میں بیٹھے جام سے شغل کر رہے تھے کہ یکایک ہی میں چونک پڑا۔

میرے چونکنے کی وجہ وہ نوجوان شخص تھا جو بیساکھیوں کے سہارے شراب خانے میں داخل ہوا تھا۔ جہاں تک میری یادداشت کا تعلق تھا میں نے اس سے پہلے کبھی اس شخص کو کیانا بن بار میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ یقیناً پہلی بار یہاں آیا تھا۔

اس کی وضع قطع اور چہرے کے تاثرات دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ وہ ایک انتہائی مایوس اور دل گرفتہ انسان ہے۔

وہ سیدھا ہماری میز کے قریب آیا اور خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی عمر تئیس چوبیس سال کے لگ بھگ تھی اگر وہ دونوں ٹانگوں سے معذور نہ ہوتا تو میں اسے بلا تامل ایک وجیہہ نوجوان کہہ سکتا تھا۔ اس عمر میں دونوں ٹانگوں سے معذور ہو جانا ایک المیہ ہی تھا اور اس المیے کے آثار اس کے چہرے سے نمایاں تھے۔

میرے قیاس کے مطابق وہ ان لوگوں میں سے ہرگز نہ تھا جو اپنی مجبوری اور معذوری سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔ اس نے ایک صاف اور بے داغ لباس پہن رکھا تھا۔ جو اس کی امارت کا مظہر تھا۔ اس کی پیشانی کشادہ تھی اور بال گھنے سیاہ تھے۔

اس نے آتے ہی بارٹینڈر کو ایک بوتل اسکاچ لانے کا حکم دیا اور ہماری طرف دیکھ کر مسکرایا لیکن میں یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کی مسکراہٹ میں یاسیت موجود تھی۔

"مجھے لوگن کہتے ہیں۔" اس نے کہا۔ "آپ دونوں کو میرا بیٹھنا ناگوار تو نہیں گزرا؟"

"کچھ زیادہ خوشی بھی نہیں ہوئی۔" رنظرفی نے ذرا سا منہ بنایا۔ "بہرحال اب جب یہاں بیٹھ ہی چکے ہو تو بیٹھے ہی رہو۔"

"صاف گوئی کا شکریہ۔" لوگن دلکش انداز میں مسکرایا۔ "کیا تم اپنا تعارف نہیں کراؤ گے؟"

"مجھے رنظرفی کہتے ہیں اور یہ میرا دوست فریک

ہے۔" اس نے کہا۔

بارٹینڈر نے اسکاچ کی بوتل اور ایک گلاس لا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ وہ لوٹنے ہی لگا تھا کہ لوگن نے اس سے کہا۔ "دو گلاس اور لے آؤ۔" پھر ہماری طرف دیکھنے لگا۔ "آج ایک جام میری طرف سے ہو جائے۔"

میں لالچی نظر سے اسکاچ کی بھری بوتل کو دیکھنے لگا۔ مجھ میں انکار کی جرأت نہیں تھی۔ رمزی کا حال بھی مجھ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔ وہ اپنے خشک ہونٹوں پر بار بار زبان پھیر رہا تھا۔ اس وقت بار میں ہم تینوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ بار خالی پڑا تھا۔

"کیا تم نے اپنی آنکھوں کا علاج کرانے کی کوشش نہیں کی؟" میں نے کہا۔ "موجودہ میڈیکل سائنس کے نزدیک تو اب کوئی کام مشکل نہیں رہا۔ تمہاری آنکھیں آسانی سے درست ہو سکتی ہیں۔"

اس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ ابھر آئی۔ "ہو سکتی ہیں؟" وہ تلخ لہجے میں بولا۔ "میں اب تک پورے چودہ آپریشن کرا چکا ہوں۔"

"یہ تو اپنی اپنی ہمت کی بات ہے۔" رمزی نے بھویں سکیڑتے ہوئے کہا۔ "اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو دوسرے ہی آپریشن کے بعد خودکشی کر لیتا۔" اس نے کہا۔ "تو جوانی میں معذوری کا عذاب سہنا آسان نہیں ہے۔"

"پہلے میں نے بھی یہی سوچا تھا۔" لوگن تلخی سے مسکرایا۔ "لیکن پھر ہمت ہار گیا۔ خودکشی کرنے کے لیے بھی ہمت چاہیے کیونکہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی ختم کر لینا بہت مشکل کام ہے۔"

"چودہ آپریشن کرانے پر اچھی خاصی دولت خرچ ہو گئی ہو گی۔" میں نے کہا۔ "جب کہ اس دور میں ایک آپریشن کرانا بھی عام انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ میں اپنے کان کا آپریشن کرانا چاہتا ہوں لیکن ڈاکٹروں نے اس آپریشن کی فیس دس ہزار ڈالر بتائی ہے جس کی ادائیگی میرے لیے ممکن نہیں ہے۔"

"میں آپریشن کے خرچ اور ڈاکٹروں کی فیس کے لیے کبھی پریشان نہیں ہوا۔" لوگن نے کہا۔ "میرے ڈیڈی میرے لیے خاصی دولت چھوڑ کر فوت ہوئے ہیں۔ ابھی تک میں مزید چودہ آپریشن کرا سکتا ہوں اور خوش حال زندگی بسر کر سکتا ہوں۔"

رمزی نے معنی خیز نظر سے میری طرف دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔

"ایسی صورت میں تمہیں اپنے حالات سے سمجھوتا کر لینا چاہیے۔" میں نے اسے مشورہ دیا۔ "اگر انسان کے پاس دولت ہو تو اس کے بے شمار مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔"

"تم درست کہہ رہے ہو۔" اس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ "دولت سے معاشی مسائل تو حل ہو جاتے ہیں۔" اس نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔ "لیکن ذہنی مسائل اور پریشانیاں حل نہیں ہوتیں۔" پھر وہ ایک عجیب سے انداز میں بولا۔ "میں ان لوگوں میں سے ہوں جو زندگی میں سب سے آگے نکل جانے کی خواہش رکھتے ہیں۔" اس نے ذرا سا توقف کیا پھر بولا۔ "شاید موجودہ صورت حال میں یہ بات تمہیں مضحکہ خیز اور ناقابل یقین لگے لیکن تین سال پہلے میں دنیا کا سب سے تیز رفتار انسان تھا۔ میں اولمپک کھیل میں ایک ہزار میٹر کی دوڑ میں اول آیا تھا اور مجھے طلائی تمغہ ملا تھا۔"

مجھے اس پر ترس آ گیا۔ اس اعتبار سے اس کی حالت واقعی قابل رحم تھی۔ دنیا کا سب سے تیز رفتار انسان سب سے پیچھے رہ گیا تھا مگر رمزی خود پسند آدمی تھا۔ اسے یہ جان کر چنداں افسوس نہیں ہوا تھا۔

"یہ حادثہ کیسے پیش آیا؟" میں نے دریافت کیا۔

"جنگ کے دوران مجھے ویت نام بھیج دیا گیا تھا۔" اس نے بتایا۔ "وہاں پر میرا ایک ایسی بارودی سرنگ پر پیر آ گیا تھا جو ویت نامیوں نے بچھا رکھی تھی۔ سرنگ پھٹ گئی۔ میں بے ہوش ہو گیا۔ مجھے اسپتال میں ہوش آیا تو پتا چلا کہ میری دونوں آنکھوں کی بینائی جا چکی تھی۔"

لوگن کے لہجے میں اداسی در آئی تھی۔ اس نے بارمین کو اشارے سے قریب بلایا اور جیب سے پرس نکال کر اس میں سے ڈالر کا ایک نوٹ دے دیا۔

"پلیز... ایک پیکٹ سگریٹ بھی لا دینا۔"

پرس پر نظر پڑتے ہی رمزی نے مجھے کہنی ماری۔ لوگن کا والٹ نوٹوں سے بھرا ہوا تھا اور پھولا ہوا تھا۔

ان دنوں ہم دونوں ہی بے کار تھے اور ادھار پر گزارا چل رہے تھے۔ جو کچھ مل جاتا اور کبھی نہ ملتا۔ ایسی صورت میں ہم پر فاقہ کشی کی نوبت آ جاتی۔ لوگن نے ہم دونوں کی آنکھوں میں وہ چمک دیکھ لی تھی۔ جو بٹوے میں بھرے نوٹوں کو دیکھ کر ہماری آنکھوں میں ابھر آئی تھی۔ وہ مجھ سے مسکرایا پھر رمزی کی طرف رخ کرتے ہوئے بولا۔

"ایک بات تو بتاؤ... اگر میں تمہیں کسی ویرانے میں لے جاؤں تو تم کیا کرتے؟"

"وہی کرتا جو تمہارے ذہن میں ہے۔" رمزی نے کسی جھجک کے بغیر کہا۔ "بیماری اور فاقہ کشی انسان کو بہت کچھ کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے؟" وہ میری طرف پلٹتے ہوئے بولا۔ "کیا تم بھی اپنے ساتھی سے متفق ہو؟"

"میرا خیال ہے کہ رمزی ٹھیک ہی کہتا ہے۔" میں نے شانے اچکا دیے۔

☆...☆...☆

یہ ایک سنسان اور ویران جگہ تھی۔ لوگن اپنی کار میں بٹھا کر ہمیں یہاں تک لے آیا۔ وہ اپنی زندگی سے تنگ آ چکا تھا۔ خودکشی کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ لہٰذا وہ چاہتا تھا کہ کوئی اسے قتل کر دے۔ وہ اپنے قاتل کو اپنے بٹوے میں موجود ساری رقم دینے کے لیے تیار تھا۔ رمزی اور مجھے پہلے تو اس بات پر یقین ہی نہ آیا مگر وہ سنجیدہ تھا۔ جیسے میں ہمیں بھی سنجیدہ ہو جانا پڑا۔ اس کے بٹوے میں دو ہزار ڈالر سے زیادہ کی رقم موجود تھی۔ جو ہم جیسے فاقہ مستوں کے لیے خاصی بڑی رقم تھی۔

دولت کمانے کا اس سے بہتر موقع ہمیں اپنی پوری زندگی میں نہیں مل سکتا تھا لیکن ہم دونوں ہی اس کی پیشکش کو قبول کرنے میں ہچکچا رہے تھے۔ ہم آوارہ گرد اور لفنگے ضرور تھے لیکن آج تک ہم نے کوئی قتل نہیں کیا تھا۔ ہم پر زیادہ تنگی کا وقت آ پڑتا تو ہم چھوٹی موٹی چوری بھی کر لیتے لیکن قتل کے بارے میں ہم نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ قتل بہت بڑا جرم ہے ساری زندگی جیل کی نذر ہو جاتی ہے۔

"اگر تم مرنا ہی چاہتے ہو تو سمندر میں چھلانگ لگا دو۔" رمزی نے کہا۔ "کسی بلند عمارت سے کود جاؤ۔ اپنی کھوپڑی میں سوراخ کر لو۔ کسی گاڑی کے نیچے آ جاؤ... یا زہر کھا لو۔" اس نے بڑے خلوص سے مشورہ دیا۔ "یا اپنے دو ہزار ڈالر بھی کیوں ضائع کرتے ہو؟"

لوگن کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھر آئی۔ "میں نے بتایا نا کہ میرے اندر خودکشی کرنے کی ہمت نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ "اسی لیے میں تم دونوں کی خدمات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

"مگر یہ تو سراسر اقدام قتل ہو گا۔" میں نے کہا اور اپنی نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔

"تم اسے قتل نہیں کہہ سکتے۔" لوگن نے فوراً ہی

کیا تھا۔" میں نے اسے بتایا۔ "کتنا چونکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" میں نے اسے یاد دلایا۔ "کار کے ساتھ ہی اس کا سر اسٹیئرنگ وہیل پر ڈھلک گیا تھا۔"

اب ہم دونوں سڑک پر پہنچ چکے تھے۔ ہم چاہتے تو ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنے اپنے گھر جا سکتے تھے لیکن ہم نے پیدل ہی چلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ رفعتی بھی سمجھ گیا تھا کہ میں خوف زدہ ہو گیا ہوں۔ وہ میرا حوصلہ بڑھانے والی باتیں کر رہا تھا اور مجھے بتا رہا تھا کہ وہ ان ایک ہزار ڈالر کو کس انداز میں خرچ کرے گا جو بیٹھے بٹھائے ہاتھ لگ گئے تھے۔

مگر اس کے باوجود ایک نامعلوم سا خوف تھا۔ جو آہستہ آہستہ میرے اعصاب پر حاوی ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ میں لوگن کو پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہوں اور اس خیال کے ساتھ کوئی خوش گوار یاد وابستہ نہیں تھی۔

گھر پہنچ کر مجھے دیر تک نیند نہیں آئی۔ اسی لیے اگلے روز میں دیر تک سوتا رہا۔

☆---☆---☆

دن کے گیارہ بجے کسی نے دروازے پر دستک دی۔ دستک دینے کا انداز بے حد جارحانہ تھا۔

میں ہڑبڑا کر بستر سے اٹھ بیٹھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھول کر دیکھا تو میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میری نظروں کے سامنے ایک پولیس آفیسر کھڑا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے چند قدم کے فاصلے پر ایک پولیس وین کھڑی تھی۔ جس کے پاس دو کانسٹیبل ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ تینوں کے تینوں پوری یونیفارم میں تھے۔

میں نے انہیں دیکھ کر بے یقینی اور بے اختیاری سے پلکیں جھپکائیں۔ کیا میں خواب دیکھ رہا تھا یا وہ حقیقت تھی۔ پولیس آفیسر نے اپنا شناختی کارڈ میری نظروں کے سامنے لہرا دیا پھر کہا۔

"میں لیفٹیننٹ رینڈل ہوں فرام ہومی سائیڈ۔"

اس کی آنکھیں بلی کی طرح بھوری تھیں۔ "کیا تم فریک ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں!" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ پولیس آفیسر، دو کانسٹیبلوں اور پولیس وین کو دیکھ کر میرے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

لوگن کو مرے ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہ گزرے تھے اتنی جلدی پولیس کا معاملے کی تہہ تک پہنچ جانا حیرت انگیز تھا۔

"مگر نہیں یقیناً وہ کسی اور سلسلے میں آئے ہوں گے۔" میں نے خود کو تسلی دی۔ لوگن کی کار میں ہم نے کوئی ایسا نشان بھی نہیں چھوڑا تھا اور نہ ہی کوئی ایسی غلطی کی تھی جس سے پولیس ہم تک پہنچ سکتی۔

"ہم ... ہم ... میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں لیفٹیننٹ؟" میں نے ہکلاتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں تم سے کچھ دریافت کرنا چاہتا ہوں۔" لیفٹیننٹ رینڈل نے کہا اور جواب کا انتظار کیے بغیر اندر داخل ہو گیا۔

وہ تنقیدی نظروں سے پورے گھر کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ چند لمحے تک گھر کا جائزہ لینے میں مصروف رہا پھر میری طرف پلٹ پڑا۔

"گزشتہ شب گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان تم کہاں تھے؟" اس نے پوچھا۔ انداز سرسری سا تھا۔

"ہم ... ہم ... میرا خیال ہے کہ میں کیلاہن بار میں تھا۔" میں نے حلق میں پھنسا تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"تم گیارہ بج کر پانچ منٹ پر بار سے نکل گئے تھے۔" لیفٹیننٹ رینڈل نے بتایا۔ "تمہارے ساتھ

تمہارا دوست رفعتی بھی تھا۔ یہ بات مجھے بار کے مالک مسٹر کیلاہن نے بتائی ہے۔" اس نے کہا۔ "اب میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان تم کہاں تھے؟"

"اوہ تو یہ بات تھی۔" میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

کیلاہن نے شاید لوگن سے بات کرتے دیکھ لیا تھا اور اس نے یہی بات پولیس کو بتا دی تھی تو گویا خطرے والی کوئی بات نہیں تھی۔ میں نے خود کو سنبھالا دیا پھر گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے اٹھتے وقت اپنی گھڑی تو نہیں دیکھی تھی لیکن شراب خانے سے نکل کر میں سیدھا گھر آ گیا تھا۔ اس کے بعد گھر سے نہیں نکلا۔"

"کوئی ثبوت؟" لیفٹیننٹ رینڈل نے مجھے مشتبہ نظروں سے گھورا۔

"میری بیوی چونکہ رات کی ڈیوٹی کرتی ہے اس لیے گھر میں اپنی موجودگی کا کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔

"کیا تم لوگن اسمتھ کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"لوگن اسمتھ؟" میں نے بھویں سکیڑیں اور سوچتے ہوئے پوچھا۔ "کون لوگن اسمتھ؟"

"وہی جو دونوں ٹانگوں سے معذور تھا اور ویل چیئر کے سہارے چلتا تھا۔" لیفٹیننٹ رینڈل نے مجھے بتایا۔

"اچھا ... اچھا۔" میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔ "یہ شخص تو کل مجھے شراب خانے میں نظر بھی آیا تھا۔" میں نے جواب دیا پھر پوچھا۔ "کیوں ... کیا ہوا اسے؟"

"میں تمہیں اس شخص کے قتل کے الزام میں گرفتار کرتا ہوں۔" لیفٹیننٹ سرد لہجے میں بولا۔ "تمہارا ساتھی رفعتی حوالات میں تمہارا منتظر ہے۔ اسے ہم پہلے ہی گرفتار کر چکے ہیں۔" باہر کھڑے ہوئے دونوں کانسٹیبل بھی اب اندر آ چکے تھے اور میرے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے تھے۔

مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ خوف کی ایک سرد لہر میرے پورے جسم میں دوڑ گئی۔

"کیسی فضول بات کرتے ہو لیفٹیننٹ!" میں نے اپنی گھبراہٹ اور خوف پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔" میں نے احتجاج کیا۔ "پھر لوگن اسمتھ کے قتل سے میرا کیا واسطہ۔ میری اس کی کوئی دشمنی نہیں تھی۔ وہ میرے لیے بالکل اجنبی شخص تھا اور کل پہلی ہی بار کیلاہن بار میں نظر آیا تھا۔"

لیفٹیننٹ نے جواب میں ریوالور نکالا اور اس کا رخ میری جانب کرتے ہوئے بولا۔ "اس کی تلاشی لو۔ بٹوا اب تک یقیناً اس کی جیب میں ہی ہوگا۔" اس نے یہ حکم اپنے ایک ماتحت کانسٹیبل کو دیا تھا۔ جس کا نام پیٹر تھا۔ دوسرے کانسٹیبل نے پیچھے سے میرے کوٹ کا کالر پکڑ کر مجھے نہ صرف اپنی طرف گھسیٹ لیا تھا بلکہ اپنی مضبوط گرفت میں بھی لے لیا تھا۔

"تم زیادتی کر رہے ہو لیفٹیننٹ!" میں نے اپنا کالر چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا لیکن اتنی دیر میں ہی کانسٹیبل پیٹر نے میری جیب سے وہ بٹوا نکال لیا تھا جس میں ایک ہزار ڈالر کے نوٹ رکھے ہوئے تھے۔ پیٹر نے وہ بٹوا لیفٹیننٹ رینڈل کی طرف بڑھا دیا۔

"میں نے سنا ہے فریک!" اس نے کہا۔ "تم آج کل بے روزگار ہو پھر اتنی بڑی رقم تمہارے پاس کہاں سے آئی؟"

میں کوئی معقول و مناسب جواب دینے کی سوچ

ی رہا تھا کہ لیفٹیننٹ نے وہ پیپر کو تھما دیا اور کہا۔
"ان نوٹوں کے نمبر اس لسٹ سے ملا کر دیکھو جو تمہارے پاس موجود ہے۔"

پیٹر نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور صوفے پر بیٹھ کر نوٹوں کے نمبر کاغذ پر لکھے ہوئے نمبروں سے ملانے لگا۔ اس دوران میں کانسٹیبل کی گرفت مجھ پر بہ دستور سخت تھی اور لیفٹیننٹ رینڈل کا ریوالور اور اپنی سرد آنکھیں مجھے گھور رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی پیٹر اپنے کام سے فارغ ہو گیا۔ وہ لیفٹیننٹ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
"تقریباً سارے ہی نمبر اس لسٹ میں موجود ہیں۔"

مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں یک دم ہی پھٹ پڑا۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" میں نے چیخ کر کہا۔

"بات یہ ہے مسٹر رنگ کہ آج صبح ہمیں اسکول کے احاطے میں سبز رنگ کی فورڈ سیڈان کھڑی ملی تھی۔ اس کے اندر لوگن کی لاش موجود تھی۔ پہلی نظر سے دیکھا جائے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے خودکشی کی ہے کیونکہ اس کے داہنے ہاتھ میں پستول تھا اور کنپٹی میں سوراخ۔" لیفٹیننٹ رینڈل نے کہا۔ "لیکن جب میں نے گہری نظر سے لاش کا جائزہ لیا تو ہمیں پتا چلا کہ قاتل سے ایک غلطی ہو گئی ہے۔" اس نے ذرا سا توقف کیا اور پُر خیال نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "قاتل کو یہ خیال نہ رہا کہ جب انسان داہنے ہاتھ میں پستول پکڑ کے اپنی کنپٹی میں فائر کرتا ہے تو وہ دائیں کنپٹی ہوتی ہے۔"

اس وقت پہلی مرتبہ مجھے خیال آیا کہ میں نے بائیں کنپٹی پر فائر کیا تھا اور پستول اس کے داہنے ہاتھ میں پکڑا دیا تھا لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا تھا کہ وہ فائر میں نے ہی کیا تھا۔ رہی لسٹ سے نمبر ملانے والی بات تو شاید لوگن کی جیب سے نوٹوں کی لسٹ بھی برآمد ہوئی تھی۔ یہ صورت حال اگرچہ نازک ضرور تھی لیکن مایوس کن نہیں تھی۔

"شاید تم ان نوٹوں کی وجہ سے مجھے قاتل سمجھ رہے ہو۔" میں نے جلدی جلدی ذہن میں اپنی مدافعت کے لیے سوچتے ہوئے کہا۔ "حالانکہ یہ رقم اس نے ہم دونوں کو ادھار دی تھی۔"

"جھوٹ تو بہت خوب صورت بول لیتے ہو۔" لیفٹیننٹ رینڈل دھیرے سے مسکرایا پھر بولا۔

"میرا خیال ہے مجھے شروع سے ساری بات بتانی پڑے گی۔" وہ سوچتے ہوئے بولا۔ "شاید تمہیں یاد ہوگا۔ آج سے تقریباً تین چار سال پہلے ایک کار اور ایک موٹر سائیکل کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔"

میں بے ساختہ چونک گیا۔ اس ایکسیڈنٹ کو تو میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا تھا پھر بھی میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔ "حادثے تو روز ہی ہوتے رہتے ہیں اور ان کی خبریں بھی اخبارات میں آتی رہتی ہیں۔" میں نے ہلکے سے توقف کے بعد کہا۔ "تم پتا نہیں کس حادثے کی بات کر رہے ہو؟ پھر میرا کسی حادثے سے کیا تعلق؟ میرے پاس تو کار بھی نہیں ہے۔"

"میں اس ایکسیڈنٹ کی بات کر رہا ہوں۔" لیفٹیننٹ رینڈل نے درشتی سے کہا۔ "جس میں کار والا بھاگ گیا تھا اور موٹر سائیکل سوار دونوں ٹانگوں سے معذور ہو گیا تھا۔"

یہ سنتے ہی میں اچھل پڑا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ لوگن کا چہرہ مجھے کیوں مانوس اور دیکھا بھالا لگ رہا تھا۔ گویا لوگن ہی وہ موٹر سائیکل سوار تھا جس کا میری کار سے ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ میرے جسم میں خوف کی لہر سرایت کر گئی۔

تاہم میں نے اپنے چہرے کو سپاٹ بنا لیا۔ خوف کا کوئی تاثر میں نے اپنے چہرے پر نہیں چھلکنے دیا تھا۔

"مجھے اس ایکسیڈنٹ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔" میں نے ڈھٹائی سے کام لیا لیکن لہجے میں اعتماد کا فقدان تھا۔

"لیکن یہ تم درست ہی کہہ رہے ہو۔" لیفٹیننٹ نے کہا۔ "مگر لوگن کو سب کچھ معلوم ہو گیا تھا۔" اس نے بتایا۔ "وہ کل ہمارے پاس آیا تھا اور اس نے تم دونوں کے خلاف رپورٹ درج کروائی تھی۔ اس نے بڑے وثوق سے ہمیں بتایا تھا کہ تم ہی وہ شخص تھے جس کی کار سے چند سال قبل اس کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ وہ تمہارے خلاف مر جانے کا دعویٰ کرنا چاہتا تھا لیکن اسے ڈر تھا کہ تم اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کرو گے۔" قدرے توقف کے بعد اس نے کہا۔ "وہ رات ہی کو اسپتال سے رخصت ہوا تھا اور جب سے ہی تم دونوں کو تلاش کر رہا تھا۔ حادثے سے ایک لمحہ قبل اس نے تم دونوں کی شکلیں دیکھ لی تھیں جنہیں وہ پھر بھول نہ پایا۔"

کانسٹیبل کی گرفت میرے دونوں بازوؤں پر مضبوط ہو گئی تھی۔

"اس نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ اگر اس کی موت غیر طبعی انداز میں ہوئی تو اس کے ذمہ دار تم ہو گے۔" اس نے کہا۔ "یہ تم اس بات کا ثبوت ہے کہ تم دونوں نے اسے اکیلے میں لے جا کر ٹھکانے لگا دیا۔ تم اس کے بٹوے میں سے رقم نکال لی اور پستول اس کے ہاتھ میں تھما کر وہاں سے بھاگ نکلے۔ تمہیں یقین تھا کہ اسے خودکشی کی واردات ہی سمجھا جائے گا۔" اس کا لہجہ یک لخت ہی درشت ہو گیا۔ "لیکن قانون کے محافظ اتنے بھی اندھے نہیں ہوتے جتنا کہ مجرم انہیں سمجھ لیتے ہیں۔"

"لیکن یہ رقم تو خود اس نے ہمیں دی تھی۔" میں نے کھوکھلی آواز میں کہا۔

"ہونہہ ۔۔۔۔ کوئی احمق ہی اس بات کو تسلیم کر سکتا ہے کہ وہ شخص کس طرح تمہیں وہ ہزار ڈالر دے سکتا ہے جسے تم نے زندگی بھر کے لیے اپاہج بنا دیا ہو۔" لیفٹیننٹ رینڈل نے حقارت سے کہا۔ "اب تم یہ بھی پسند کرو گے کہ ہتھکڑی کی ضرورت پڑے گی؟"

میرے شانے شکست خوردہ انداز میں ڈھلک گئے۔ ساری بات یک دم ہی مجھ پر واضح ہو گئی تھی۔

لوگن ٹانگوں سے معذور ہو کر زندگی سے دل برداشتہ ہو چکا تھا اور مرنا چاہتا تھا لیکن اس نے خودکشی کرنے کی بجائے یہ کام ہم سے کروایا تاکہ ہم بھی اپنے کیے کی سزا پائیں۔ وہ معذور ہو جانے کے باوجود ہمیں شکست دے گیا تھا۔ پھانسی کا پھندا ہماری گردنوں میں ڈال گیا تھا جس سے بچاؤ اب کسی صورت میں ممکن نہیں تھا۔

بلاشبہ لوگن ایک ذہین انسان تھا اور اسے انتقام لینا آتا تھا۔ انتقام بھی ایسا کہ جس میں ناکامی کا ایک فی صد بھی امکان نہیں رہا تھا۔

میں نے ایک گہرا سانس لیا۔ الوداعی نظر سے کمرے میں موجود ایک ایک چیز کو دیکھا۔ اب انہیں دوبارہ دیکھنا میرے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ میری بیوی خواب گاہ میں سو رہی تھی لیکن میں نے اسے جگانا مناسب نہ سمجھا۔ میں اسے جگا کر کرتا بھی تو کیا ۔۔۔۔ اور اب بھی اس سے نظریں نہ ملا پاؤں گا۔

میں نے شانے اچکائے اور دھندلائی آنکھوں سے لیفٹیننٹ کے ساتھ چل پڑا۔

آخری محبت

راحیلہ تاج

محبت ایک ایسا پودا ہے جس میں کبھی ملاپ سے پھول کھلتے ہیں تو کبھی یہ افسردہ ہی [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

مجھے ان کہانیوں پر بھی یقین نہیں آیا تھا جن میں ہیروئنوں کی بے وفائی سے دل برداشتہ ہو کر ہیرو حضرات فوراً ہی فوج میں بھرتی ہو کر شہر سے بہت دور صحرائی سرحد پر چلے جاتے ہیں لیکن جب ہروش نے مجھ سے بے وفائی کی اور کیپٹن سے ملنے لگا تو میں نے وہی کیا جو کہانیوں کے ہیرو کرتے تھے یعنی اپنا تبادلہ مڈل کراس برانچ میں کرا لیا اور فوراً ہی فوج میں بھرتی ہو کر بہت دور چلی گئی۔

جب میں ہروش کی محبت میں مبتلا ہوئی تھی تو سب نے مجھے منع کیا تھا کہ میں اتنے وجیہہ و شکیل کو خاندان کا کیسے بنا لوں جو ہر آئیڈیل پرست لڑکی کے تصور پر پورا اترتا ہو مگر میں نے کسی کی نہیں سنی تھی کیونکہ مجھے ہروش بہت پرخلوص لگتا تھا۔ دوسرے میری انا کو اس وقت بڑی تسکین ملتی تھی جب لوگ مجھے اس کے ساتھ دیکھ کر آپس میں سرگوشیاں کرتے تھے کہ اس لڑکی نے اتنے اسمارٹ اور خوب رو آدمی کو اپنی زلف کا اسیر کیسے بنا لیا ہے۔ جب کیپٹن اپنے بے پناہ حسن اور منہ زور شباب کے ساتھ سامنے آئی تو ہروش نے مجھے [illegible] کہنے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہ کی۔ حسن اتفاق سے انہی دنوں مڈل کراس برانچ میں ایک اسامی خالی ہوئی تو میں نے فوراً درخواست دے دی کیونکہ لوگوں کی ہمدردیاں میرے لیے نشتر ثابت ہو رہی تھیں۔

مڈل کراس ایک الگ تھلگ سا قدیم شہر ہے جس پر تیز رو وقت کے ساتھ ہونے والی تبدیلیوں نے کوئی اثر نہیں ڈالا۔ وہاں آج بھی مویشیوں کی ہفتہ وار منڈیاں اور میلے لگتے ہیں۔ وہاں کے باشندے آج بھی اپنی پرانی روایتوں کا دامن تھامے ہوئے ہیں اور انہیں اس بات سے کوئی فرق نہیں کہ زمانہ کتنا آگے نکل گیا ہے۔ انہوں نے مجھ اجنبی کا بھی کھلے دل سے خیر مقدم کیا اور میں چند ہفتوں میں ہی مقامی سرگرمیوں میں اتنی دلچسپی لینے لگی کہ اپنے بیشتر دکھ اور محرومیاں بھول گئی۔

میں فون کی گھنٹی پر اس کی طرف لپکنا بھی بھول گئی کہ ہو سکتا ہے یہ ہروش کا فون ہو۔ تاہم ہروش نے میرے دل پر بے وفائی کا جو چرکا لگایا تھا۔ اس کے نتیجے میں میں نے اپنے اور مردوں کے درمیان ایک فاصلہ رکھنا شروع کر دیا۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر مرد ہروش کی طرح بے وفا ہو لیکن میں اپنی جگہ بے حد محتاط ہو گئی۔

مڈل کراس میں رہائشی مکانوں کا فقدان تھا۔ مجھے جو گھر ملا وہ شہر کے آخری حصے میں ایک گلی کے اندر واقع تھا۔ اس کا نام بریک ہاؤس تھا۔ وہ ان قدیم مکانوں جیسا تھا جو پکچر پوسٹ کارڈز میں دکھائی دیتے ہیں۔ بڑے بڑے شہتیروں اور چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں والے۔ اس کے پچھواڑے ایک چھوٹا سا اصطبل اور دو تین بگی ہوئی تھی۔ غالباً پہلا کرایہ دار اپنا گھوڑا وہاں رکھتا تھا۔ خواب گاہ کا فرش بھی قدرے ڈھلوان تھا چنانچہ مجھے

پلنگ کے پایوں کے نیچے چھوٹے چھوٹے پتھر رکھنے پڑے تھے۔۔۔ بہرحال یہ مکان دفتر سے میلوں دور تھا اور بس سروس بھی نہیں تھی۔ اچھے موسم میں تو میرے لیے سائیکل پر جانا مشکل نہیں تھا لیکن جب بھی بارش ہوتی تو مجھے وہاں تک گیلا اور پسینے میں شرابور ہونا پڑتا تھا۔

میرے پڑوس میں گراہم رہتا تھا جو ایک فارم کا مالک تھا۔ پہلے دن جب میں گھر پہنچی وہ فوراً آ گیا اور بولا۔ "میں تمہارا پڑوسی ہوں اور شہر میں دودھ انڈے سپلائی کرتا ہوں لہٰذا ان چیزوں کی طرف سے بے فکر ہو جاؤ۔ میں ہر صبح خود پہنچا دیا کروں گا۔" پھر اس نے مجھے پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا اور کہا۔ "اگر میں تمہارے کسی کام آ سکوں تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔"

میں اس کی اس "پیش کش" کا مطلب سمجھ گئی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اب مجھے مردوں سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ میں نے اس کی پیش کش کے جواب میں صرف ایک لفظ "شکریہ" کہا تاکہ وہ میرا مطلب سمجھ جائے اور وہ سمجھ گیا کیونکہ وہ اس کے بعد ہر صبح دودھ اور انڈے دے کر چلا جاتا تھا۔ تاہم میں ہر صبح آٹھ بجے اس کے بھاری بوٹ کی چاپ اور پک اپ کی آواز سننے کی منتظر ضرور رہتی کہ اس طرح مجھے یہ احساس ہوتا تھا کہ رات خیر و عافیت سے گزر گئی ہے۔

شروع کے کئی ہفتے میں نے اپنی آزادی برقرار رکھی پھر موسم برسات شروع ہوا تو طوفان باد و باراں کا منظر دیکھنا تھا مگر جب وہ وادی سے شہر کی طرف آیا تو اس کی تیزی و تندی دہشت خیز بن گئی۔ یوں لگتا تھا کہ بادل اور ساری بجلیاں میرے سر پر گرج رہی ہیں۔ ایسا لگتا تھا کہ کائنات کی ہر شے ایک دھماکے کے ساتھ بھسم ہو جائے گی۔

طوفان جس تیزی سے آیا تھا اسی تیزی سے گزر گیا تو میری جان میں جان آئی اور میں کچن میں پہنچی تاکہ ایک کپ چائے بنا کر پیوں۔ میں نے الیکٹرک کیتلی میں پانی ڈال کر سوئچ آن کر دیا۔ پانچ منٹ بعد میں نے کیتلی کا ڈھکنا کھولا تو پانی ویسے کا ویسا ٹھنڈا تھا۔ شاید طوفان کے باعث بجلی فیل ہو گئی تھی۔ میں نے مختلف چیزوں کا جائزہ لینا شروع کیا تاکہ کسی ایک کو توڑ کر اس کی لکڑی سے آگ جلاؤں اور کھانے پینے کا بندوبست کر سکوں۔ ابھی میں کوئی فیصلہ نہیں کر پائی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے جا کر دروازہ کھولا۔ سامنے گراہم کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"یہ زبردست طوفان باد و باراں تھا۔ غالباً اس کی وجہ سے بجلی فیل ہو گئی ہے۔ ہم تو خیر طوفان اور اس کے اثرات کے عادی ہیں لیکن تم یہاں نئی ہو۔ اس لیے میں نے سوچا کہ ممکن ہے تم نے طوفانی موسم سے نمٹنے کے لیے متبادل انتظام نہ کیا ہو۔ میں تمہارے لیے اسٹوو اور لیمپ لایا ہوں۔ اگر تمہیں ضرورت ہو تو دونوں چیزیں رکھ لو۔"

اپنے اس فیصلے کے باوجود کہ میں کسی مرد کو اپنے

معلومات

☆ ملک ترکی کے عوام بانی اسلامی جمہوریہ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کو ملک پاکستان کا اتاترک سمجھتے ہیں۔

☆ مشہور پختون لیڈر خان عبدالغفار خان نے 1988 میں اس دنیائے فانی سے رحلت فرمائی۔

☆ 18 مئی 1989 کو ملک برما کا نام بدل کر "میانمار" رکھا گیا تھا۔

☆ [illegible]

☆ جاپان کی کرنسی "ین" کہلاتی ہے۔

☆ حضرت ابراہیم علیہ السلام ملک عراق میں پیدا ہوئے تھے۔

محمد ندیم۔۔۔ کراچی

گھر کی دیکھ بھال نہیں کرنے دوں گی۔ میں نے گراہم کو یوں خوش آمدید کہا جیسے وہ میرے لیے چراغ لے دین آیا ہو۔

اسٹوو جلانا بظاہر مشکل نہیں تھا لیکن گراہم نے کہا کہ وہ اس وقت تک وہیں رکا رہے گا جب تک میں اسے جلا کر چائے تیار نہ کر لوں۔ اگر اسٹوو کا کوئی مسئلہ ہوا تو پھر وہ دوسرے کا انتظام کرے گا۔

میں نے اس کی یہ بات رد نہ کی کہ ابھی بادل قریب ہی گرج رہے تھے اور ان کی دوری کیپ بھی مجھے کر مجھے خوف زدہ کر سکتی تھی۔ چنانچہ میں نے اسٹوو جلا کر چائے بنائی اور ایک کپ گراہم کو بھی دیا۔ یہ ایک اخلاقی تقاضا تھا۔ چائے پینے کے دوران مجھے محسوس ہوا کہ اس قد آور اور چوڑے شانوں والے آدمی میں کوئی نہ کوئی کشش ضرور ہے۔

دوسرے دن کی صبح بے حد خوب صورت تھی۔ دھلا دھلایا آسمان بہت پیارا لگ رہا تھا اور خوش گوار فضا دیکھ کر یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ گزر جانے والی رات بڑی وحشت انگیز تھی۔ میں سائیکل پر سوار ہو کر شہر کی طرف روانہ ہو گئی۔ جب مارکیٹ والے چوک میں پہنچی تو وہاں اژدحام تھا اور سڑک بند تھی۔ ہوا یہ تھا کہ کل رات کے طوفان باد و باراں کے باعث چرچ کا مینار گر پڑا تھا۔ یہ چرچ اس علاقے کی قدیم اور یادگار عمارت تھی۔ لوگ اس کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ مینار اور چرچ کا بچا کچھا حصہ بھی منہدم کر دیا جائے مگر دوسرے ماضی کی شاندار یادگار کے انہدام کے خلاف تھے۔

چرچ اور مینار کی دوبارہ تعمیر کے لیے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ لاٹری کے ٹکٹ فروخت کر کے رقم جمع کی جائے۔ لاٹری کے انعامات کے لیے مقامی گیراج کی طرف سے ایک کار دی گئی۔ کسی نے کیک کا ٹک پیش کیے۔ کسی نے کشتی دو افراد کے لیے تفریحی سفر کے ٹکٹ بھی آ گئے اور چھوٹے انعامات کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ لاٹری کا ٹکٹ خریدنے والے ہر آدمی کو کوئی نہ کوئی انعام ضرور ملے گا۔

مقامی لوگوں نے بھی دل کھول کر ٹکٹ خریدے اور کچھ رفاہی اداروں نے دوسرے شہروں میں بھی فروخت کیے۔ اس طرح مینار اور چرچ کے بچے منہدم ہونے والے حصے کی تعمیر کے لیے کافی رقم جمع ہو گئی۔

لاٹری کے ٹکٹوں کی فروخت والے ایام میں گراہم جب بھی سنیچر کی صبح کو اپنا بل لینے آتا یہ ضرور کہتا۔ "میں نے بھی لاٹری کے بہت سے ٹکٹ خریدے ہیں۔ مجھے کسی انعام کی توقع نہیں لیکن اگر میرے نام کھانے کا چولہا نکل آئے تو مزہ آ جائے۔"

میں ہنستے ہوئے کہتی "میں نے بھی کسی انعام کے لالچ میں ٹکٹ نہیں خریدے لیکن اگر مجھے انعام میں کار مل جائے تو بہتر ہے کہ میں آرام سے شہر پہنچ جایا کروں۔"

جس روز لاٹری کا نتیجہ نکلنا تھا۔ میں گھر پر ہی رہی۔ میرا خیال تھا کہ یہ مقامی لوگوں کا معاملہ ہے اور اس اجتماع میں انہیں ہی شریک ہونا چاہیے۔ لاٹری کے نتیجے کا علم مجھے گراہم کے ذریعے ہوا جب دوسری صبح اس نے دودھ اور انڈے دینے کے لیے باورچی خانے کی کھڑکی بجائی۔

میں ڈریسنگ گاؤن کی ڈوری کمر کے گرد کستی ہوئی کچن میں گئی اور کھڑکی کھولی تو وہ مسرت سے لبریز لہجے میں بولا۔ "ہم نے لاٹری جیتی بلکہ لوٹ لی ہے۔ تمہیں ایک جوان بچھیا انعام میں ملی ہے اور مجھے کار۔"

مجھے اپنے انعام سے کوئی خوشی نہ ہوئی۔ آخر میں ایک گائے کا کیا کرتی۔ دفتر میں سب نے مجھے مبارک باد دی اور پوچھا۔ "کیا تم یہ کام چھوڑ کر مویشی پالنا شروع کرو گی؟"

میں نے سوچا کہ میں انعام میں ملنے والی گائے واپس کر دوں گی مگر اسی شام جب وہ کسان جس نے اس گائے کی پیش کش کی تھی۔ گائے میرے گھر لے آیا تو میں اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس کا نام پولی تھا۔ وہ بڑی خوب صورت جنگلی گائے تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں مجھے بہت بھلی لگیں اور میں پہلی نظر میں اسے پیار کرنے لگی۔

کسان نے اصطبل یا باڑے کا بغور جائزہ لیا اور باڑ بندی کو بھی اچھی طرح دیکھا کہ وہ کہیں سے ٹوٹی ہوئی تو نہیں ہے۔ پھر اس نے ہنستے ہوئے ایک بچی سے معاملہ کیا جیسے وہ اس میں سونا چاہتا ہو۔ اس کے بعد اس نے مجھے گائے کی دیکھ بھال اور چارے کے بارے میں ہدایات دیتے ہوئے کہا۔

"گراہم تو تمہارے پڑوس میں رہتا ہے۔ وہ اسے دیکھ لیا کرے گا۔"

اگلے چند روز میں نے پولی پر پوری توجہ دی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ بھی میرے جذبات سمجھتی ہے۔ جب میں اسے کھانے کے لیے ڈالتی تو وہ مجھے ہلکے ہلکے ٹکر سے جیسے شکریہ ادا کرتی۔ گراہم اپنے بہت سے مویشیوں کی دیکھ بھال کے بعد شام کو وقت نکال کر باڑے تک آ جاتا اور میرے ساتھ پولی کے بارے میں باتیں کرتا رہتا۔

اب مجھے پتا چلا کہ کسان باڑوں کے گیٹ پر جھکے کیوں کرتے رہتے ہیں۔ دراصل مویشیوں کے بارے میں بات چیت ہی ان کی دوستی کا وسیلہ بن جاتی ہے۔

دوسرے ہفتے جمعہ کو میں پولی کی دیکھ بھال کے بعد شب دیر سے کھانا کھا رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے

بروس بول رہا تھا۔ "ہیلو! تم سے بات کیے عرصہ گزر گیا ہے سارہ!"

حیرت ہے کہ مجھے اس کی آواز سن کر خوشی ہوئی نہ دکھ۔ میں نے کہا۔ "پاپی کی وجہ سے اب میں کہاں جا سکتی ہوں۔"

"پاپی اور کون ہے؟"

"پاپی میری گائے ہے۔" میں نے اسے بتایا۔ "میں نے اسے باڑے میں رکھا ہوا ہے۔"

"گائے اور باڑہ! تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے سارہ؟" بروس نے تعجب سے کہا۔ "خیر چھوڑو۔ بات یہ ہے کہ میں نے لِلی سے تعلقات ختم کر دیے ہیں۔ وہ میری غلطی اور غلط انتخاب تھی۔ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"کیا تمہارا مجھ سے ملنا ضروری ہے؟"

"فون پر ملامت کرو سارہ! میں تمہیں اس وقت تفصیل نہیں بتا سکتا کہ ایک پبلک فون بوتھ سے بات کر رہا ہوں اور فون کے انتظار میں کھڑے آدمی کے تیور ٹھیک نظر نہیں آ رہے۔ میں تمہارے پاس آ رہا ہوں۔ کل صبح تمہارے ساتھ گزاروں گا اور اتوار کی سہ پہر تک رہوں گا۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

میں سوچ میں پڑ گئی کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ وہ ہفتہ اور اتوار کی تعطیل میرے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔ چند مہینے قبل یہی بات میرے لیے بڑی مسرت کی ہوتی مگر اب نہیں۔ اب تو میں اسے بھول چکی تھی۔ اس کی آمد مجھے خواہ مخواہ ڈسٹرب کرنے کا باعث بنتی۔ میں اسے فون کر کے روکنا چاہتی تھی مگر پھر میں نے ایسا کرنا مناسب نہ سمجھا اور سوچا کہ وہ آ جائے تو اچھا ہے۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں نے سب سے پہلے دروازے کا لاک دیکھا۔ وہ ٹھیک تھا۔ پھر میں نے کھانے کی میز تیار کی۔ رات کو میں نے گراہم کے نام ایک رقعہ لکھا کہ ہفتہ اور اتوار کی تعطیل کے لیے زیادہ دودھ دوہ کر جائے۔

صبح گراہم نے دروازہ کھٹکھٹایا اور پوچھا۔ "کیا تمہارے ہاں مہمان آ رہے ہیں۔ اگر کوئی کام ہو تو بتاؤ۔"

"نہیں، شکریہ گراہم۔ میرا دوست بروس لندن سے ہفتہ اور اتوار کی تعطیل منانے آ رہا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے دروازہ بند کر دیا اور کچن میں چلی گئی۔

بروس لنچ کے وقت پہنچ گیا۔ وہ شرٹ اور جینز میں بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ابھی میں بروس سے ٹھیک طرح بات بھی نہیں کر پائی تھی کہ پاپی ڈکرانے لگی۔ یہ اس کے چارہ دینے کا وقت نہیں تھا۔ میں اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر اندر آئی تو وہ پھر ڈکرانے لگی۔ مجھے اس کے بے وقت اور یوں بری طرح ڈکرانے سے خیال آیا کہ کہیں وہ بروس سے جیلس تو نہیں ہو گئی۔ مگر پھر میں نے اپنے خیال احمقانہ تصور کرتے ہوئے رد کر دیا۔

جب میں کمرے میں داخل ہوئی تو بروس بڑی بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "تمہاری گائے ڈکرا ڈکرا کر کانوں کے پردے پھاڑ رہی ہے۔ کیا تم اسے خاموش نہیں کرا سکتیں؟"

"اس نے پہلے تو کبھی ایسا نہیں کیا۔ اس کے ساتھ ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ اگر اس نے ڈکرانا بند نہ کیا تو مجھے گراہم کے پاس جا کر پوچھنا پڑے گا۔"

"یہ گراہم کون ہے؟" بروس نے پوچھا۔

"میرا ہمسایہ ہے۔ بہت اچھا آدمی ہے۔ ہمیشہ میری مدد کرتا ہے۔"

"تم اس سے خاصی متاثر لگتی ہو۔ اچھا ہوا کہ میں آ گیا۔"

میں اس سے آگے کچھ نہ سن سکی کیونکہ پاپی نے پھر ڈکرانا شروع کر دیا تھا اور اس کی آواز بہت قریب سے آ رہی تھی۔ میں نے چیختے ہوئے کہا۔ "تم کیا کہہ رہے ہو بروس؟ مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا۔"

"میں چیخ چیخ کر بات کرتے کرتے تھک گیا۔ مجھے ہی تمہاری گائے کو ٹھیک کرنا پڑے گا۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکلا اور گائے کو گالیاں بکنے لگا۔

میں بھی باہر نکل آئی۔ میں نے دیکھا کہ بروس گائے کو صرف گالیاں ہی نہیں بک رہا بلکہ اسے پتھر بھی مار رہا ہے اور وہ باڑے میں ادھر ادھر دوڑتے ہوئے ڈکرائے جا رہی ہے۔

"اسے مت مارو۔" میں چلائی۔ "تمہیں اس کے ساتھ یہ سلوک نہیں کرنا چاہیے۔ میں گراہم کو بلاتی ہوں۔"

"گراہم! جب سے میں یہاں آیا ہوں تمہاری زبان پر یہی نام ہے۔ میں شہر جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکلا۔ چند لمحوں بعد مجھے کار کا دروازہ بند ہونے اور کار اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔

جب میں گھر سے باہر آئی تو گراہم کی گائیں کار کے آگے آگے بھاگ رہی تھیں اور ان کے رکھوالے انہیں روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اتنے میں گراہم بھی بروس کی کار کے پاس پہنچ گیا اور دونوں کے درمیان تلخ کلامی ہونے لگی جو ہاتھا پائی میں بدل گئی۔ میں جلدی سے گھر اور باڑے میں آ گئی۔ پاپی ابھی تک ڈکرائے جا رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد گراہم وہاں آ گیا اور مجھ سے بولا۔ "میں نے تم سے کئی بار کہا ہے کہ تم اپنی گائے کی دیکھ بھال ٹھیک سے نہیں کر رہیں۔ تمہاری اس گائے کی وجہ سے میری گائیں بھی جوش میں آ گئیں۔ اگر میں بروقت نہ پہنچ جاتا تو تمہارا پاگل بوائے فرینڈ انہیں مار ڈالتا۔"

"وہ میرا بوائے فرینڈ نہیں اور پلیز ذرا پاپی کو دیکھو۔ وہ کس بری طرح ڈکرا رہی ہے۔ کیا ہو گیا ہے اسے؟"

"کیا تم واقعی نہیں جانتیں کہ اسے کیا ہو گیا ہے؟" گراہم نے تعجب سے کہا۔ "یہ بھی اس طلب کی وجہ سے بے تاب و بے چین ہے جس میں میں مبتلا ہو گیا ہوں۔"

"کس طلب میں مبتلا ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ساتھی کی۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور وہ ساتھی تم ہو۔"

میں بھی مسکرا دی۔ میری یہ مسکراہٹ اس بات کا اقرار تھی کہ میں بھی اس کی ساتھی بننے کو تیار ہوں۔

❀❀❀

میری اور گراہم کی شادی کو ایک ماہ ہونے والا ہے۔ جو اس ٹوٹے ہوئے مینار والے چرچ میں ہوئی تھی جس کی تعمیر کے لیے ہم نے لاٹری کے ٹکٹ خریدے تھے۔ گراہم نے وہ کار مجھ سے لی اور میں نے اپنی گائے گراہم کو۔ وہ مجھ سے کہتا ہے کہ مجھے تو لاٹری میں کار نہیں تم ملی ہو اور میں اس سے کہتی ہوں کہ مجھے انعام میں بچھیا نہ ملتی تو تم میرے شوہر کیسے بن سکتے تھے؟

تب وہ اثبات میں سر ہلا کر اعتراف کرتا ہے کہ ہاں جب تک بچھیا نہیں آئی تھی، تم مجھے لفٹ ہی نہیں دیتی تھیں۔ میں بچھیا کا شکر گزار ہوں کہ جس نے تمہیں میری بیوی بنا دیا۔

[illegible]

اقبال بھٹی

[illegible]

سڈنی سے لیورپول تک کے راستے میں بحری علاقے کا وہ واحد ہوٹل تھا جو غریب اور کم اجرت پانے والوں کا مرکز تھا اور اس بندرگاہ پر کوئی جہاز کم از کم ہفتہ لنگر انداز ہوتا ہی تھا۔ اس عرصے میں کم اجرت پانے والے مزدوروں کے لیے نام ورتھ کا یہ ہوٹل کسی جنت سے کم نہیں ہوتا تھا۔ اس بندرگاہ سے جہازوں میں سامان لادا جاتا تھا۔ مقامی لوگ سامان لادنے کا کام کرتے تھے اور اپنے کام کے بدلے میں اجرت کے علاوہ کچھ ایڈوانس بھی مانگ لیتے تھے اور شہر میں جا کر ہوٹلوں میں مزے اڑاتے تھے۔ جب کہ جہاز پر ملازمت کرنے والے ملاح صرف ایک شلنگ کمانے کے لیے ایک ایک مہینے کام کرتے تھے پھر بھی اپنی مرضی کی اجرت ملنے پر انہیں خوشی رہتا تھا اور اگر انہیں اجرت مل جاتی تھی تو وہ اپنا وقت مرچنٹ پر واقع نام ورتھ کی جنت میں بیٹھ کر چلے جاتے تھے۔ یہ جگہ نام ورتھ اور اس کی بیوی نے جنہیں ملاح پیار سے آنٹی ام کہتے تھے چند سال پہلے قائم کی تھی۔ ان دونوں میاں بیوی کا پیار سارے علاقے میں مشہور تھا پھر بھی اگر کبھی ان دونوں میں لڑائی بھی ہوتی تب بھی آنے والے ملاحوں کو بڑی گرمجوشی سے خوش آمدید کہا جاتا تھا۔ آنے والوں کو مناسب قیمت پر اچھا کھانا فراہم کیا جاتا تھا۔ نہانے کے لیے گرم پانی اور پرسکون کمرہ جہاں قیام کرنے والا سکون سے سو سکے یا جو بھی کام چاہے کر سکے۔

یہاں ایک سہولت اور میسر تھی اور وہ یہ کہ اگر کسی ملاح کی حالت مستحکم نہ ہوتی تو وہ یہاں اپنا حساب کھول سکتا تھا اور مہینوں ادھار پر گزارا کر سکتا تھا جب تک کہ اسے کوئی معقول ملازمت نہ مل جائے۔ اس سے رقم کا مطالبہ بھی نہیں کیا جاتا تھا لیکن بیشتر ملاح ایسا کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔

ایک رات... جیف اور ہارکلے اس ریسٹورنٹ میں پہنچے۔ اس رات ان کے پاس ایک چھوٹی سی رقم تھی اور وہ اس سے عیش کرنا چاہتے تھے۔ دونوں نے اپنا بہترین لباس زیب تن کیا ہوا تھا اور نام ورتھ کے ریسٹورنٹ میں میز پر پہنچے تھے۔

جیف بھی ایک جہاز میں منتظم اور نرس تھا۔ آئندہ اسے ایک اہم عہدہ ملنے کی توقع تھی لیکن اسے سمندر سے نفرت تھی پھر بھی وہ پیسوں کی خاطر ملازمت کرتا رہا اور آج وہ ایک مسافر بردار بحری جہاز کا کموڈور اسٹیورڈ تھا لیکن جن دنوں میں وہ محض ایک نرس تھا اس کے پاس پیسوں کی قلت رہا کرتی تھی۔ جب وہ اپنے دوست کے ساتھ اس ریسٹورنٹ میں پہنچا تو اس نے چند منٹ میں کھانا منگوایا تھا اور اپنے دوست کے ساتھ بیٹھ کر ان دنوں کی سے بھوک مٹاتی تھی۔ اس کے بعد وہ جوا کھیلتے رہے تھے اور ریسٹورنٹ میں بجنے والی موسیقی سے لطف اندوز ہوتے رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ

بور ہو گئے اور انہوں نے واپس اپنے جہاز پر جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ پھر وہ لوگ ریسٹورنٹ سے باہر نکل ہی رہے تھے کہ انہیں آنٹی ام نے روک لیا تھا۔

"بیٹاؤ، کو اتنی جلدی جا رہے ہو؟" انہوں نے ہمیشہ کی طرح نرم لہجے میں کہا۔

"ہم دراصل بور ہو گئے تھے چنانچہ واپس جانے کا فیصلہ کیا تھا۔" جیف نے کہا۔

"ارے تو ایسی بھی کیا بات ہے بچو۔ تم لوگ میرے شوہر اور میرے ساتھ آج رات کا کھانا کھاؤ، تم آج ہمارے گھر میں ہمارے مہمان بن کر رہ سکتے ہو۔"

"ٹھیک ہے ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ہم ضرور کھانے میں شریک ہوں گے۔" جیف کے دوست ہارکلے نے جیف کے بولنے سے پہلے کہا۔

ہارکلے کے جواب پر آنٹی ام بہت خوش ہوئی تھیں اور دونوں واپس اپنی میز پر آ بیٹھے تھے۔ پھر وہ گھنٹے بعد جب وہ دونوں وہاں بیٹھے بیٹھے بور ہو گئے اور ریسٹورنٹ سے تمام گاہک جا چکے تب آنٹی ام نے ریسٹورنٹ بند کیا تھا اور ان کے بوڑھے شوہر نے اپنی پرانی فورڈ گاڑی نکال کر اسٹارٹ کی اور ان دونوں کو اس میں بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر وہ دونوں کو اپنے چھوٹے سے فلیٹ میں لے گئے جو لانگ بیرٹ میں واقع تھا۔ اس علاقے میں یوں تو ایسے بہت سے لوگ بستے تھے جو بندرگاہ پر کام کرتے تھے لیکن ہارکلے اور جیف اس علاقے میں پہلی بار آئے تھے۔ آنٹی ام نے ان کے لیے کھانا تیار کیا تھا جس میں گوشت کے علاوہ بہت سی سبزیاں بھی شامل کی گئی تھیں۔ کھانا بہت مزیدار تھا اور ہارکلے اور جیف نے خوب سیر ہو کر کھایا تھا۔ کھانے کے بعد آنٹی ام انہیں مختلف قسم سے [illegible] کرتی رہیں۔ یہاں کافی دیر تک وہ لوگ باتوں میں مشغول رہے تھے۔

آنٹی زیادہ وقت اپنی بیٹی کے بارے میں باتیں کرتی رہی تھیں جو نیوبرائن میں رہتی تھی اور جس کی شادی ایک بینک کلرک سے ہوئی تھی۔ ان کے بچے بھی تھے جن کی یاد آنٹی کو بہت ستاتی تھی۔ آنٹی نے اپنے نواسے نواسیوں کی تصاویر بھی ان دونوں کو دکھائیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور وہ بہت جذباتی ہو گئی تھیں پھر کچھ دیر بعد آنٹی کے شوہر نے گفتگو کا رخ موڑ دیا اور ان دونوں کے بارے میں باتیں کرنے لگے تھے۔ جب بحری سفر کرنا ایک بہت ہی مشکل کام ہوتا تھا آنٹی کے شوہر بھی ایک زمانے میں بندرگاہ پر کام کرتے رہے تھے پھر انہوں نے اپنی ریٹائرمنٹ کے لیے اس علاقے کو منتخب کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اب بھی وہ بے کار نہیں ہیں بلکہ ان کے کاندھوں پر کچھ ذمے داریاں ہیں جنہیں وہ پورا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ بندرگاہ پر کام کرنے والے لوگوں کے لیے خدمات انجام دے رہے تھے۔ جب وہ کام کرنے والے بھوکے پیاسے ہوتے تو وہ انہی کے ریسٹورنٹ کا رخ کرتے تھے اور آنٹی کے شوہر کو ان کی خدمت کر کے سکون ملتا تھا۔ ان کی ان باتوں نے ہارکلے پر بہت اثر چھوڑا تھا اور جیف بھی متاثر نظر آ رہا تھا۔

جیف اور ہارکلے تقریباً ساری رات ہی وہاں ٹھہرے تھے اور اس عرصے میں آنٹی اور ان کے شوہر نے ان سے بہت سی باتیں کی تھیں پھر آنٹی کے شوہر نے پیشکش کی تھی کہ وہ ان دونوں کو بندرگاہ تک چھوڑنے خود جائیں گے۔ ہارکلے نے انہیں منع بھی کیا تھا کیونکہ وہ خاصے تھک چکے تھے اور ان کی عمر بھی اتنی تھی کہ اپنے فلیٹ میں پہنچنے کے لیے انہیں جو سیڑھیاں چڑھنا پڑتی تھیں ان کے لیے وہ بھی کافی تھکن کا باعث تھا لیکن ہارکلے اور جیف کے منع

کرنے کے باوجود نہیں مانے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ بارکلے اور جنیفر وہاں سے یونہی چلے جائیں۔ آنٹی نے ان دونوں سے وعدہ لیا تھا کہ وہ جب بھی اس علاقے سے گزریں گے جہاں ان کی بیٹی رہتی ہے تو وہاں سے ملتے ضرور جائیں گے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ بہت سے لوگوں کو پہلے بھی اپنی بیٹی کی خیریت معلوم کرنے کے لیے بھیج چکی ہیں اور ان کا اپنی بیٹی سے ملنے کا یہی ایک راستہ ہے۔ وہ لوگوں کو اکثر کچھ چیزیں بھی دے دیتی تھیں جو وہ ان کی لڑکی تک پہنچاتے تھے چنانچہ انہوں نے ان دونوں کو بھی چند چیزیں دی تھیں جو انہیں ان کی لڑکی تک پہنچانی تھیں۔ ان چیزوں میں آنٹی کے ہاتھ سے بنے ہوئے کوٹ اور ایک کیک شامل تھا جو آنٹی نے اپنے نواسے کی سالگرہ کے لیے بنایا تھا۔ انہوں نے وہ کیک کھول کر ان دونوں کو بھی دکھایا تھا۔ اس کا رنگ براؤن تھا اور وہ بہت خوش رنگ لگ رہا تھا۔ اس کی سطح پر آئسنگ شوگر سے ڈیزائن بنایا گیا تھا۔ آنٹی نے وہ کیک ایک ڈبے میں پیک کر دیا تھا اور واپسی پر ان دونوں کے ساتھ کر دیا تھا۔ انہوں نے اس ڈبے پر ایک کاغذ کی چٹ پر اپنی بیٹی کا نام اور پتا لکھ کر چپکا دیا تھا۔

اپنے جہاز پر پہنچنے کے بعد بارکلے نے وہ کیک کا ڈبا اپنے صندوق میں رکھ کر لاک کر دیا تھا اور سفر کے دوران اس کی بہت حفاظت کی تھی کیونکہ ان کی اجرت بہت کم تھی اور بعض اوقات ان کے پاس پینے کے لیے اپنے سگریٹ بھی نہیں ہوتے تھے۔ ایسے حالات میں بھی بارکلے تو گزارا کر لیتا تھا لیکن جنیفر سے بھوک برداشت نہیں ہوتی تھی اور جب اسے بھوک لگتی تھی تو وہ بارکلے سے درخواست کرتا تھا کہ وہ آنٹی کے کیک میں سے ایک ٹکڑا کاٹ کر اسے دے دے۔ اس طرح اس کی بھوک بھی مٹ جائے گی اور ایک سلائس کٹ جانے سے کوئی فرق بھی نہیں پڑے گا لیکن پھر بھی کہ وہ درخواست کرتا کہ لیور پول پہنچنے کے بعد وہ ایسا ہی دوسرا ایک خرید کر ان کی بیٹی کو دے دیں گے لیکن بارکلے اس کی بات نہیں مانتا تھا اور اس نے لیور پول پہنچنے تک اس کیک کی اپنی جان کی طرح حفاظت کی تھی اور اپنے صندوق کی چابی بھی جنیفر سے چھپا کر رکھتا تھا۔

جب ان کا جہاز لیور پول پہنچا تھا تو ان دونوں کو ہی فرصت نہیں ملی تھی کہ کسی اور معاملے پر سوچ سکیں سوائے اس کے کہ جہاز پر لدا ہوا مال گودی پر اتاریں اور گودی سے نیا مال جہاز پر سوار کریں تاکہ اسے آگے پہنچایا جا سکے دوسری صبح جہاز کو لیور پول سے روانہ ہو جانا تھا۔

ان لوگوں نے کام کی زیادتی کی وجہ سے دوپہر کو کھانا بھی نہیں کھایا تھا اور بڑی مستعدی سے کام میں مصروف تھے کہ انہیں اچانک ایک شخص اپنی طرف آتا نظر آیا جس کا تعلق ہرگز بھی جہاز کے عملے سے نہیں تھا۔ وہ ان کے قریب آ کر رک گیا تھا اور انہیں بغور دیکھ رہا تھا۔

"کیا تمہارا نام بارکلے ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔" بارکلے نے جواب دیا۔

"تم سے مل کر خوشی ہوئی۔" اس نے کہا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"ہمیں ایک خط ملا ہے جو میری ساس نے بھیجا ہے انہوں نے لکھا ہے کہ تم لوگ ہمارے بچوں کے لیے ان کا بھیجا ہوا ایک کیک لائے ہو۔"

"وہ میرے بکس میں ہے لیکن۔"

"تم کیا کر رہے ہو؟ تمہیں باتوں سے فرصت نہیں ہے۔" بارکلے کی بات اس آواز سے ادھوری رہ گئی تھی اور اس نے سر اٹھا کر دیکھا تھا جہاں اس کا افسر اعلیٰ کھڑا تھا وہ کام کرنے والوں کی نگرانی کر رہا تھا اور بارکلے کو باتیں کرتا دیکھ کر اسے ڈانٹ رہا تھا۔

"میں کام ہی کر رہا ہوں۔" بارکلے نے کہا اور پھر اجنبی کی طرف متوجہ ہوا۔

"میں جتنی جلدی ممکن ہوا وہ کیک اپنے بکس سے نکال کر دیتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے میں تمہیں گودی کے دروازے کے قریب ہی ملوں گا۔" اجنبی نے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ اس پر بارکلے نے شکر ادا کیا کیونکہ وہ اپنے افسر کو غصہ دلانا نہیں چاہتا تھا۔

پھر تقریباً شام سات بجے کے قریب بارکلے اور جنیفر کو فرصت ملی تھی اور وہ نہا دھو کر تیار ہو گئے تھے پھر بارکلے نے کیک کا ڈبا اپنے صندوق سے نکالا تھا اور وہ دونوں گودی کے دروازے پر پہنچے تھے جہاں دروازے کے نگراں نے انہیں روک کر تلاشی لی تھی اور کیک کا ڈبا بارکلے کے ہاتھ سے لے کر اس کی پیکنگ کھول دی تھی پھر مطمئن ہونے کے بعد واپس اسے پکڑا دیا تھا لیکن انہیں وہ اجنبی کہیں نہیں ملا تھا چنانچہ بارکلے نے اس پتے کا سہارا لیا تھا جو آنٹی مم نے اسے لکھ کر دیا تھا اور وہ دونوں تھوڑی ہی تگ و دو کے بعد اس پتے پر پہنچ گئے تھے۔ راستے کے اخراجات بارکلے ہی نے ادا کیے تھے کیونکہ جنیفر کے پاس بالکل رقم نہیں تھی۔

گھر کے دروازے پر جنیفر نے دستک دی تھی جس کا جواب ذرا تاخیر سے ملا تھا۔ دروازہ کھولنے والی کوئی عورت تھی اور اس نے دروازے کی جھری سے جھانک کر باہر دیکھا تھا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"مسز ٹیلفل ہم بندرگاہ پر کام کرنے والے ہیں ہمیں آپ کی والدہ نے سڈنی سے ایک کیک دے کر بھیجا ہے۔" بارکلے نے کہا۔

"کیا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟" اندر سے پوچھا گیا۔

"میرے ساتھ میرا دوست ہے اور بس۔" بارکلے نے کہا اور اس کے جواب کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا اور اندر کی روشنی میں بارکلے کو ایک چہرہ نظر آیا وہ خاتون بہت سراسیمہ سی لگ رہی تھی۔

"ٹھیک ہے تم جلدی سے اندر آ جاؤ۔" سرگوشی میں کہا گیا اور دونوں دروازے میں قدم رکھ کر ایک تاریک سے ہال میں داخل ہو گئے پھر انہیں کچھ دیر انتظار کرنا پڑا تھا اور خاتون نے کمرے کی کھڑکیوں پر پڑے ہوئے دبیز پردے برابر کر دیے تھے۔ اس کے بعد اس نے کمرے کی لائٹ آن کی تھی اور بارکلے اور جنیفر کی حیرت کی انتہا نہ رہی تھی کیونکہ وہ کمرہ کسی طرح بھی ایک معمولی کلرک کا کمرہ نہیں لگتا تھا۔ اس کمرے میں بیش قیمت سامان سجا ہوا تھا اور خاتون بھی اپنے لباس اور رکھ رکھاؤ سے بہت امیر معلوم ہوتی تھی۔ بارکلے نے جنیفر کی آنکھوں میں دیکھا تھا وہ بھی اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ انہیں آنٹی مم کی باتیں یاد آ رہی تھیں جو انہوں نے اپنی بیٹی کے بارے میں انہیں سڈنی میں بتائی تھیں۔

خاتون نے بارکلے کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پیکٹ کی طرف دیکھا اور پھر اسے لینے کے لیے اپنے ہاتھ بڑھا دیے۔

"کیا یہی ہے؟" اس نے پوچھا۔ بارکلے نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پیکٹ اس کے حوالے کر دیا۔ پیکٹ لینے کے بعد اس عورت نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا تھا۔ اس کی نظروں میں سوالیہ تاثر تھا۔

"ٹھیک ہے۔ تم ایک سیکنڈ رکو۔" اس نے کہا اور کمرے سے چلی گئی۔

"اوہ..... بے چاری غریب آنٹی۔ یہاں کی بیٹی تو بہت مختلف ہے۔" حنیف نے کہا۔

وہ لوگ تھوڑی دیر بے آنٹی سے کمرے میں اس کا انتظار کرتے رہے۔ ان کی ٹوپیاں ان کے ہاتھوں میں تھیں اور وہ کمرے کے وسط میں کھڑے ہوئے تھے۔ چند منٹوں کے بعد وہ خاتون واپس آ گئی تھی لیکن اب اس کا انداز مختلف تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی اور اس کے ہاتھوں میں کافی کی ٹرے تھی۔

"میں تمہیں انتظار کروانے کی معافی چاہتی ہوں۔ بھلا تم بھی کیا سوچ رہے ہو گے؟ بیٹھو میں تمہارے لیے کافی لائی ہوں۔"

"نہیں شکریہ۔" بارکلے نے کہا۔ "دراصل ہمیں فوراً ہی واپس جانا ہے۔"

"ارے ایک کپ کافی سے تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔" اس نے پیالوں میں کافی ڈالتے ہوئے کہا۔

"دراصل ہم کھانے سے پہلے کافی نہیں پیتے۔" حنیف نے ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میں معافی چاہتی ہوں۔ دراصل میرے پاس اس وقت کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے جو میں پیش کر سکوں۔" اس عورت نے کہا۔ "کیا ہو سکتا ہے کہ میں تمہیں تھوڑا سا کیک پیش کروں۔" اس نے پیالوں میں کافی انڈیل کر انہیں ان دونوں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ کیک تمہارے لڑکے کی سالگرہ کے لیے ہے۔" حنیف نے پوچھا۔

"اوہ..... میری لڑکی۔" ایک لمحے کو وہ عورت حیرت زدہ سی نظر آئی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے خود پر قابو پا لیا تھا۔

"تمہیں اس بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ دراصل اس کوٹھی کی چیزیں مجھ تک ہیں اور میں نے یہ بات اپنی ماں سے چھپائی ہوئی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ انہیں دکھی کروں۔ تم اگر چاہو تو کیک کھا سکتے ہو۔ میں نے تھوڑا سا چکھا ہے۔ وہ بہت مزیدار ہے۔"

"نہیں شکریہ۔ اب ہمیں چلنا چاہیے۔" حنیف نے بارکلے کی توقع کے خلاف کہا اور بارکلے کو بھی بدذوقی کا احساس ہوا۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہاری بہت مشکور ہوں۔" اس عورت نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا اور چند قدم ان دونوں کی طرف بڑھ آئی۔

"یہ تمہارے کام کا حقیر سا معاوضہ ہے۔" اس نے رقم حنیف کے ہاتھ میں دے دی اور حنیف کا رنگ حیرت سے سفید پڑ گیا۔

"اس رقم کو اپنے پاس ہی رکھو میڈم! آپ نے ہمیں کیا سمجھا ہے؟" حنیف نے غصے سے کہا۔

"ارے تم بار ناراض ہو گئے۔ اس میں ایسی غلطی کی کیا بات ہے۔" اس عورت نے کہا اور ان کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھی۔

"آپ کے شوہر آج جہاز پر مجھ سے ملے تھے اور مجھ سے کیک کے بارے میں پوچھا تھا۔" بارکلے نے چلتے چلتے اس عورت سے کہا۔

"میں اس وقت بہت مصروف تھا چنانچہ کیک انہیں نہیں دے سکا۔ پھر انہوں نے کہا کہ وہ ڈیک کے گیٹ کے پاس مجھے ملیں گے لیکن جب میں کیک لے کر وہاں پہنچا تو وہ وہاں نہیں تھے۔"

"اوہ..... اچھا اگر تم اب ان سے ملو تو انہیں میری طرف سے شکریہ کہنا اور کہنا کہ وہ گھر جلدی آ جائیں۔" اس عورت نے ہنستے ہوئے کہا اور وہ

دونوں اس کے مکان سے باہر آ گئے۔

"اچھا بارکلے تم حنیف کا خیال رکھنا اور اسے رات کا کھانا وقت پر کھلانا۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا اور دروازہ بند کر لیا۔

واپسی پر وہ دونوں آنٹی وم اس کی بچی کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے واپس آ رہے تھے جو ان کی توقعات پر پوری نہیں اتری تھی۔

جہاز پر واپس آنے کے بعد انہیں پتا چلا تھا کہ ان کا جہاز فوراً ہی کولمبو کے لیے روانہ ہونے والا ہے۔

اس کے بعد چونکہ ان کی یادداشت اتنی اچھی بھی نہیں تھی چنانچہ کچھ ہی عرصے بعد وہ لوگ اس واقعے کو تقریباً بھلا بیٹھے تھے پھر انہیں اس بات کی یاد ایک واقعے نے دلائی تھی اور یہ واقعہ حنیف کے ساتھ پیش آیا تھا۔

پورٹ سعید کی بندرگاہ پر جہاز میں سامان لادنے والے مختلف پیکٹ اور ڈبے اور میگزین جہاز پر لا رہے تھے۔ حنیف کی نظر ایک میگزین پر پڑی اور وہ اس پر چھپی ہوئی تصویر غور سے دیکھنے لگا۔ اس کے بعد اس نے وہ میگزین بارکلے کو دکھایا تھا اور ہاتھ سے اس تصویر اور اس کی خبر کی طرف بارکلے کی توجہ دلائی تھی۔ اس میگزین میں آنٹی وم کی بیٹی مسز فاضل کی تصویر تھی اور خبر میں لکھا تھا کہ وہ اپنے گھر میں مردہ حالت میں پائی گئی ہے اور اسے [illegible] گیا ہے کہ اس کی موت واقع ہوئی ہے۔ اس کی موت کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی لیکن پولیس چند شبہات کی بنا پر تحقیقات کر رہی ہے اور جلدی قاتل کی گرفتاری متوقع ہے۔ خبر میں یہ بھی لکھا تھا کہ پولیس جلدی ان دو ملاحوں تک بھی پہنچنے والی ہے جو مسز فاضل کی موت والی رات اس کا پتا پوچھتے ہوئے پائے گئے تھے۔ پولیس ان سے سوالات کرنا چاہتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ مسز فاضل کا شوہر بھی شک کی بنا پر کسی اور کیس میں پولیس کی حراست میں تھا چنانچہ وہ اپنی بیوی کے قتل کے شبے سے آزاد قرار دیا گیا تھا۔

"آخر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" حنیف نے بارکلے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں نہ ہم انسپکٹر سے ملیں اور جو کچھ ہم جانتے ہیں اسے بتا دیں۔"

"اس سے کیا فائدہ ہو گا؟" چند لمحے سوچنے کے بعد بارکلے نے کہا۔

"نہ تو ہم نے جرم کیا ہے اور نہ ہی ہم اس کے بارے میں انہیں کچھ معلومات پہنچا سکتے ہیں سوائے اس کے کہ جب ہم وہاں سے واپس ہوئے تھے تو وہ ٹھیک ٹھاک تھی لیکن ہماری بات پر بھلا کون یقین کرے گا پھر انسپکٹر کو یہ سب کچھ بتانے کا مطلب ہوگا کہ ہمارا باقی کا سفر بھی اچھا نہیں کٹے گا۔ اور ہمیں بار بار پولیس کا سامنا کرنا پڑے گا بہتر یہی ہے کہ ہم کچھ نہ کہیں اور سڈنی پہنچنے کے بعد ہی کوئی قدم اٹھایا جائے۔ ممکن ہے اس وقت تک پولیس بھی اصل مجرم کو گرفتار کر چکی ہو اس طرح ہم شک سے بھی آزاد ہو جائیں گے اور اگر ایسا نہیں بھی ہوا تو ہم آنٹی وم سے تو مل ہی سکیں گے اس کے بعد ہم پولیس کو بھی سب کچھ بتا دیں گے۔"

پھر انہوں نے یہی کیا تھا وہ سڈنی پہنچنے تک خاموش رہے تھے پھر جہاز کے لنگر انداز ہوتے ہی وہ آنٹی وم کے ریسٹورنٹ پہنچے تھے جہاں معمول کے مطابق کاؤنٹر کا کام جاری تھا۔ ابھی وہ ریسٹورنٹ کے باہر ہی تھے کہ نیلے رنگ کی یونیفارم میں ایک پولیس افسر ان کی طرف بڑھا۔

"تم بارکلے اور حنیف ہو؟" اس نے پوچھا اور ان دونوں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اثبات میں

سر ہلا دیا۔

"تمہیں چند سوالات کے جواب دینے کے لیے ہمارے ساتھ ہیڈ کوارٹر چلنا ہوگا۔" اس افسر نے کہا اور ان دونوں کو قریب کھڑی گاڑی میں سوار ہونے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئے تھے۔ گاڑی میں پہلے سے دو پولیس مین اور موجود تھے ایک تو اسٹیئرنگ وہیل پر بیٹھا تھا اور دوسرا اس کے برابر بیٹھا ہوا تھا۔

"میں جانتا ہوں کہ آپ شاید میری بات پر یقین نہ کریں اور آپ کو میری بات احمقانہ لگے لیکن ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ ہم آتی دم سے ملنے کے بعد آپ کے پاس آئیں گے۔" بارکلے نے نیلی وردی والے آفیسر سے کہا۔

"واقعی۔" آفیسر نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "اب جب تک ہم ہیڈ کوارٹر پہنچ جائیں تم اپنی انرجی ضائع مت کرنا۔"

ہیڈ کوارٹر کا راستہ طویل نہیں تھا۔ انہیں ایک بڑی سی بلڈنگ کے سامنے اتارا گیا تھا اور پھر آفیسر اپنے ساتھ اندر لے گیا تھا اور ایک خالی کمرے میں لے جانے کے بعد دونوں کو دھکا دے کر کرسیوں پر بٹھا دیا گیا تھا۔

"پولیس یہ نہیں کر سکتی۔" بارکلے نے چیخ کر کہا تھا۔

"پولیس والے یہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ ویسے ہمارا تعلق پولیس سے نہیں ہے۔" نیلی وردی والے نے کہا اور دوسرا اپنی جیکٹ اتارنے لگا اس کے بعد اس نے اپنے ہاتھوں میں ایک آتی دم دستانہ پہن لیا تھا۔

"میں سچائی اگلوانا چاہتا ہوں۔" اس نے کہا اور جنید کی گھگی بندھ گئی۔

"میرا کوئی قصور نہیں ہے۔" جنید نے کہا۔ "یہ سب کیا دھرا اسی کا ہے۔" اس نے بارکلے کی طرف اشارہ کیا۔

"اس نے مجھے بھی اپنے ساتھ شریک کر لیا تھا۔ میں کہتا ہوں یہ سب اس نے کیا ہے۔ تم اس سے پوچھو یہ تمہیں خود بتائے گا۔" جنید نے پھر کہا اور اس کی بات سنتے ہی وہ تینوں بارکلے کی طرف مڑ گئے۔ بارکلے خاموش بیٹھا تھا اور اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے کانوں میں اب بھی جنید کی سسکیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بارکلے نے جتنا بچتا اپنے ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ کر چہرہ چھپا لیا۔ وہ منتظر تھا کہ اب کسی بھی لمحے اس کے چہرے پر ضرب پڑنے والی ہے۔ اچانک اس کے کانوں سے جنید کی تیز آواز ٹکرائی۔

"تم سب اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔" اس آواز پر بارکلے نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اس کے سامنے جنید کسی پولیس آفیسر کی طرح کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا جو اس نے ان تینوں میں سے کسی کے ہولسٹر سے نکالا تھا۔ اس کے کھڑے ہونے کا انداز ویسا ہی تھا جیسے کوئی ماہر نشانہ باز ہو۔

"تینوں فوراً کرسی کی طرف کھسکنے لگے تھے۔

"احمقانہ باتیں مت کرو لڑکے چلو کیوں نہ ہم آپس میں معاملہ نمٹا لیں۔" ان میں سے سب سے بڑے شخص نے جنید سے کہا۔ ان تینوں کے ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے۔

"کیوں نہیں۔" جنید نے پستول ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے کہا اور دوسرے ہی لمحے کے بعد ایک ہاتھ سے اس شخص کے منہ پر زوردست مکا مارا اور وہ شخص پیچھے جھکتا چلا گیا۔

"اب بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

جنید نے غصے سے کہا اور انہیں بے تحاشا مارنے لگا۔ وہ ہاتھ میں پکڑے ہوئے ریوالور کو بالکل ہی بھول گیا تھا پھر بارکلے بھی اس کے ساتھ لڑائی میں شامل ہو گیا لیکن وہ دونوں جہاز پر محنت کی وجہ سے بہت تھکے ہوئے تھے چنانچہ زیادہ دیر تک لڑ نہیں سکتے تھے اور تھوڑی ہی دیر بعد ان کے بازو جواب دے گئے اور ایسے میں موقع ملتے ہی وہ دونوں بھاگتے ہوئے اس عمارت سے باہر آ گئے پھر جو بھی پہلی کار انہیں نظر آئی اس سے انہوں نے لفٹ مانگ لی اور سیدھے اپنے جہاز پر پہنچ گئے۔ ریوالور اب بھی ان کے پاس تھا جسے انہوں نے لاکر میں رکھ دیا تھا اور ڈر کے مارے ان دونوں کا برا حال تھا وہ دونوں اپنے کیبن تک محدود ہو گئے تھے۔

"آخر تم نے یہ کیوں کہا تھا کہ میں اس سارے چکر کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ بھلا سارے چکر سے تمہارا مطلب کیا تھا؟" بارکلے نے کچھ دیر بعد جنید سے پوچھا۔

"بھلا میں کیسے جان سکتا ہوں۔" جنید نے جواب دیا۔

"میں تو ان لوگوں کی توجہ پہلے خود سے ہٹانا چاہتا تھا تاکہ میں ان کے ریوالور پر قبضہ کر سکوں اور پھر میں اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو گیا تھا اور تم پاگل احمقوں کی طرح بیکار بیٹھے ہوئے تھے۔" جنید نے چڑانے والے انداز میں کہا۔

اگلے روز بارکلے اور جنید نے یہ خبر بڑے اطمینان سے سنی تھی کہ آتی دم اور ان کے شوہر چونکہ اپنے ریسٹورنٹ کی آمدنی کا ٹیکس ادا نہیں کر سکتے تھے چنانچہ ان کا ریسٹورنٹ چند ہفتوں کے لیے بند کر دیا گیا تھا۔ بارکلے اور جنید کے خیال میں یہ ان کے لیے ایک نیک شگون تھا۔

وہ دونوں کئی ہفتوں تک آپس میں اس الجھن پر بحث کرتے رہے تھے اور طرح طرح کی ترکیبیں سوچتے رہے تھے کہ اس الجھن سے کیسے نجات حاصل کی جائے اور پھر اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ وہ سڈنی سے نکلیں اور چلے جائیں۔ ان چند ہفتوں میں انہوں نے نیلے سوٹ والے کو بھی کئی بار جہاز کے آس پاس منڈلاتے دیکھا تھا۔ وہ ان دونوں ہی کی تلاش میں تھا لیکن جہاز پر نہیں آیا تھا اور آخر کار جہاز سڈنی سے روانہ ہو گیا تھا اور ان دونوں کی جان میں جان آئی تھی۔

لیور پول پہنچنے کے بعد وہ دونوں ایک بار پھر خوفزدہ ہو گئے تھے۔ یہاں پہنچتے ہی جنید کو کام کرنے کے لیے تجارتی سامان کے حصے میں بھیج دیا گیا تھا اور بارکلے کو دوسری پر کام میں لگا دیا گیا تھا۔ اتفاقی طور پر وہ ایک بار پھر اس مسئلے کو بھول گئے تھے اور وہ مسئلہ پھر حل شدہ رہ گیا تھا۔

پھر ایک روز جنید اور بارکلے کی ملاقات ساؤتھ کوریا کے علاقے میں ہوئی۔

"یہ ساری مصیبت اس کیک کی وجہ سے آئی ہے۔" جنید نے بارکلے سے کہا۔

"میں نے اس سوچ میں بہت وقت لگایا ہے کہ آخر ہم سے کون سی غلطی سرزد ہوئی ہے کہ ہم اس مصیبت میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ میں نے تمہیں پہلے نہیں بتایا تھا لیکن جب تم کیک اپنے صندوق میں چھپا کر لے جا رہے تھے تو ایک روز میں نے تمہارے صندوق کی چابیاں حاصل کر لی تھیں اور چپکے سے تمہارے کیبن میں پہنچ گیا تھا۔ تم بے خبر سو رہے تھے میں نے تمہارا صندوق کھول کر کیک باہر نکالا اور پھر میں نے اس کیک کی جگہ پیکٹ میں ایک لکڑی کا ٹکڑا رکھ دیا تھا اور وہ کیک کھا گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے فیصلہ کیا تھا کہ جوں ہی جہاز لیور پول کی بندرگاہ پر پہنچے گا میں تم سے الگ ہو جاؤں گا پھر تمہیں بھی اس بارے میں نہیں بتاؤں گا اور جہاز کے لنگر انداز ہوتے ہی ایک دوسرا بالکل ویسا ہی کیک خرید کر پیکٹ میں سے لکڑی کا ٹکڑا نکال کر رکھ دوں گا اس طرح کبھی بھی کسی کو اس کے بارے میں معلوم نہیں ہو سکے گا پھر میں نے کیک ابھی بیچا تھا لیکن میرے ساتھ ایک مشکل تھی۔"

"کیسی مشکل؟"

"موتی۔"

"کیسے موتی؟"

"کیا میں نے تمہیں نہیں بتایا تھا کہ اس کیک کے درمیان میں اصلی موتیوں کی ایک مالا تھی جس نے مجھے مشکل میں ڈال دیا تھا۔"

"کیا تم وہ بھی کھا گئے تھے؟"

"نہیں احمق میرا مطلب ہے کہ ان موتیوں نے مجھے بیکار اور سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ بے چاری بوڑھی آنٹی نے موتیوں کی وہ مالا اپنی بچی کو چھپانے کے لیے اس کیک میں رکھی ہوگی جیسے بعض لوگ پڈنگ یا کسٹرڈ میں سکے ڈال کر رکھتے ہیں۔ میں نے سوچا کیوں نہ نئے کیک کا کچھ حصہ کاٹ کر اس میں وہ مالا رکھ دی جائے۔"

"پھر؟"

"میں پھر مشکل میں پھنس گیا کیونکہ جب جہاز لنگر انداز ہوا تھا تو میرے پاس میری رقم خرچ ہو چکی تھی اور میں ایک بار پھر قلاش ہو گیا تھا چنانچہ میں نے موتیوں کی وہ مالا ایک شخص کو فروخت کر دی۔ وہ شخص اپنی بیٹی کے لیے ایسی جیولری خریدتا رہتا ہے۔ میں نے وہ مالا اسے فروخت کرنے کے بعد ایک ویسی ہی سستی سی مالا خرید کر اس کیک میں رکھ دی۔ اس طرح

کم از کم رقم خرچ کر کے مجھے ایک اچھی رقم بھی ہاتھ آ گئی اور سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔"

"لیکن اس بات سے تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"دیکھو بارکلے غور سے سنو میں تمہیں پھر سے سمجھاتا ہوں۔ جو موتیوں کی مالا میں نے کیک سے نکالی تھی وہ اصل میں سچے موتیوں کی مالا تھی۔ تقریباً آٹھ ہزار پاؤنڈ کی مالیت کی تھی۔"

"کیا؟"

"ہاں یہ حقیقت ہے۔ میرا خیال ہے کہ آنٹی ام اور ان کے شوہر سچے موتیوں اور قیمتی اشیا کی اسمگلنگ کا کام عرصے سے کرتے رہے تھے۔ وہ اسی طرح سے چیزیں ایک جگہ سے دوسری جگہ بھجواتے تھے جب ہم وہ خاص کیک لے کر آنٹی ام کی بیٹی کے پاس پہنچے تھے تو اس کی تاک میں کوئی اور بھی تھا کوئی ایسا شخص جس کو اس کاروبار کا علم ہو چکا تھا اور اس کا تعلق پولیس کے محکمے سے تھا۔ جب ہم وہ کیک آنٹی ام کی بیٹی پامیلا کو دے کر آئے تو دوسرا شخص اسے حاصل کرنے وہاں پہنچا اور اس نے اس کیک کی خاطر پامیلا کو ہلاک کر دیا۔ دوسری طرف آنٹی کی بیٹی کا شوہر دوسرے کسی جرم میں پولیس کے ہاتھ لگ گیا۔"

"نہیں۔" بارکلے نے حیرت سے پوچھا۔

"آخر تم نے یہ بات مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی تھی؟"

"اس لیے کہ تم خود کو بہت امانت دار سمجھتے ہو اور ایک دانے کے قصے میں تم آسمان سر پر اٹھا لیتے۔"

"لیکن تمہیں یہ ساری حقیقت کیسے معلوم ہوئی جو تم مجھے بتا رہے ہو۔"

"یہ سب مجھے خود بہ خود سمجھ میں نہیں آئی بلکہ میں نے کیپ ٹاؤن کے علاقے میں یہ باتیں آنٹی کے پڑوسی شوہر سے معلوم کیں جن سے میری وہاں اتفاقی ملاقات ہوئی تھی۔"

"لیکن وہ وہاں کیا کر رہے تھے؟"

"وہ آنٹی کے وہاں پہنچنے کا انتظار کر رہے تھے جنہیں ہیروں کی چوری کے سلسلے میں سات سال کی سزا سنائی گئی تھی اس کے علاوہ آنٹی ام خوب صورت لڑکیوں کی مدد سے منشیات کا کاروبار چلاتی تھی اور اس کا یہ کاروبار برسوں سے دنیا کے مختلف حصوں میں چل رہا تھا۔"

جنید کی اس بات کے بعد دونوں کے درمیان طویل خاموشی رہی بالکل یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ دونوں اپنے اپنے ماضی میں جھانکنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

"مجھے یہ پریشانی ہے کہ اصل سچے موتیوں کے ساتھ کیا ہوا ہوگا۔" بارکلے نے کچھ دیر بعد کہا۔

"وہ سچے موتی اب بھی یقیناً لیور پول کی کسی خوب صورت لڑکی کی گردن میں سجے ہوں گے۔" جنید نے جواب دیا۔

"لیکن اس لڑکی کو شاید پتا بھی نہ ہو کہ وہ سچے موتی ہیں؟" اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ "کیونکہ وہ موتی میں نے نقلی سمجھ کر ہی ایک غریب شخص کو بیچے تھے۔ کاش میں جان سکوں کہ وہ خوش قسمت لڑکی کون ہے۔" جنید نے حسرت سے کہا اور مسکرانے لگا۔

□



قسط نمبر 3

حسام بٹ

وقت سب سے بڑا مداری گر ہے۔ اس کی بازی گری اور رنگا رنگی انسانوں کو عجیب تماشے دکھاتی ہے۔ جو لوگ وقت کی آواز نہیں سمجھتے وہ اس کا شکار ہو کر حالات کی بھول بھلیوں میں کچھ ایسے بھٹکتے ہیں کہ ان کا نام و نشان مٹ جاتا ہے۔

ایک آشفتہ سر نوجوان کی سرگزشت' اس نے پھولوں کی چاہ کی تھی مگر حالات نے اس کا دامن کانٹوں سے بھر دیا مگر اس نے وقت کے آگے سر نگوں کی بجائے اس سے مقابلے کی ٹھان لی تھی۔

میرا دماغ کسی خوف ناک سونامی کی زد پر تھا۔ پورے وجود میں دھماکے ہو رہے تھے۔ تاریکی میری سوچ کو زہریلا اور سانسوں کو بوجھل بنا رہی تھی۔ اگر میں خود کو نہ سنبھالتا تو مجھے ختم ہونے میں چند سیکنڈ ہی لگتے۔ دوسری جانب سے امی کی گھبرائی ہوئی آواز مسلسل میری سماعت پر دستک دے رہی تھی۔

"بیٹا تم خاموش کیوں ہو؟ کیا تم نے میری بات سن لی ہے۔"

"جی امی!" میں نے اپنے حواس کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ پریشان نہ ہوں میں پہلی فرصت میں آپ کے پاس پہنچ رہا ہوں۔"

فون بند کر کے میں نے وحید صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ وحشت زدہ نظروں سے مجھے ہی گھور رہے تھے۔ میرے متوجہ ہونے پر انہوں نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

"یہ تو میری سمجھ میں آ گیا کہ آپ کے گھر سے فون تھا لیکن پرابلم؟"

"اے بگ پرابلم!" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے ابھی اور اسی وقت گھر جانا ہوگا وحید صاحب۔"

"کیا میں آپ کی مشکل جان سکتا ہوں۔" وہ بڑی اپنائیت سے بولے۔

"فرحانہ کو غنڈوں نے اغوا کر لیا ہے۔" میں نے بتایا۔

ان کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں نمودار ہو گئیں۔

"کون فرحانہ؟"

"ابھی چند لمحے جس کی ذات کے حوالے سے آپ مجھ سے سوالات کر رہے تھے۔" میں نے بتایا۔ "میں جس لڑکی کو چاہتا ہوں اس کا نام فرحانہ ہے۔"

"اوہ۔۔۔" انہوں نے ہونٹ سکیڑے اور ہمدردی بھرے لہجے میں بولے۔ "پھر تو آپ کو فوراً گھر پہنچنا چاہیے۔ آپ کے پاس کوئی کنوینس نہیں ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں آپ کو اپنی گاڑی میں ڈراپ کر دیتا ہوں۔"

وحید صاحب کی پرخلوص پیشکش کے سامنے میں نے گردن جھکا دی۔

وحید صاحب نے آئندہ دس منٹ میں خالد رشید صاحب کو تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا پھر مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر میرے گھر کی جانب روانہ ہو گئے۔

میرا ذہن مسلسل اسی سوال کی کھوج میں لگا ہوا تھا کہ وہ غنڈے کون ہو سکتے ہیں جنھوں نے فرحانہ کو اغوا کیا تھا۔ فرحانہ یا اس کے باپ عبدالخالق کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ یہ لوگ برسوں سے میرے پڑوس میں آباد تھے۔ میں نے کسی کے ساتھ ان کا معمولی سا جھگڑا بھی ہوتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

پھر فرحانہ کا اغوا کیا معنی رکھتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ کہیں فرحانہ کو میری وجہ سے اغوا تو نہیں کیا گیا۔ آج کل میری ایک فسادی اور شرابی "صاحب" سے ٹھنی ہوئی تھی۔ پچھلے دنوں میں نے اور شاذی نے اس کے بھیجے ہوئے دو غنڈوں کی خوب درگت بنائی تھی۔ عین ممکن تھا کہ یہ قبیح حرکت اسی نے کی ہو۔

فرحانہ میری رگ رگ اور نس نس میں رواں دواں تھی۔ اس کے اغوا کی خبر نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کسی نے میرے دل کو شکنجے میں کس دیا ہو۔ دماغ دھواں دھواں ہو رہا تھا اور میری آنکھوں میں نیلی آگ کی اذیت ناک تڑپ جاگ اٹھی تھی۔ ان لمحات میں مجھے جوش نہیں ہوش سے کام لینا تھا۔ اگر لومڑی نے شیر کے منہ میں ہاتھ دے دیا تھا تو شیر کو اب اپنی جبلی وحشت اور درندگی دکھانے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ میرا نام اسد اللہ ہے۔ یعنی اللہ کا شیر۔ جس کسی نے بھی میری ذات کے حوالے سے فرحانہ کو اغوا کیا تھا وہ میرے غیظ و غضب سے بچ نہیں سکتا تھا۔ ان شاء اللہ۔

"مسٹر اسد اللہ!" وحید صاحب کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی؟"

"کون سی بات وحید صاحب؟" میں نے ان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"آپ کی محبوبہ کو غنڈوں نے اغوا کیا مگر یہ اطلاع آپ کی والدہ تک پہنچائی۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولے۔ "کیا فرحانہ کی رہائش آپ کے قریب ہی ہے؟"

"جی سر!" میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "وہ میری پڑوسن ہے۔"

"اوہ آئی سی" وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولے۔ "آپ ان غنڈوں کے بارے میں کوئی قیاس لگا سکتے ہیں مسٹر اسد اللہ؟"

میں نے کینہ پرور صفت بد شخص کا ذکر کرنا مناسب نہ جانا اور سرسری انداز میں کہا۔ "فی الحال تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا جناب۔ وہ لوگ نہایت امن پسند اور شریف النفس لوگ ہیں۔ گھر پہنچ کر ہی اندازہ ہو گا۔ یہ کیا ماجرا ہے۔"

"ان کی کسی سے دشمنی نہیں لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ انہیں کسی اور کی دشمنی کی بھینٹ چڑھا دیا گیا ہو۔" وحید صاحب نے قدرے تیز انداز میں کہا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" میں نے الجھن زدہ انداز میں ان کی طرف دیکھا۔

"پتا نہیں کیوں۔ بار بار میرا دھیان ایک ہی طرف جا رہا ہے۔"

"آپ پہیلیاں نہیں بجھوائیں وحید صاحب۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"آپ کے ذہن میں جو کچھ ہے کھل کر بیان کریں۔"

"پچھلے دنوں آپ نے فیکٹری کے معاملات کی خاطر بہت زیادہ سرگرمی دکھائی ہے۔" وہ ڈرائیونگ پر توجہ

مرکوز رکھتے ہوئے متفکر لہجے میں بولے۔ "جس کے نتیجے میں کئی افراد کو ذلت اور نقصان اٹھانا پڑا۔ یہ کارروائی ان میں سے بھی تو کسی کی ہو سکتی ہے۔"

"میں نے یہ نہیں سوچا تھا۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "ان لوگوں کی دشمنی مجھ سے زیادہ میری فیملی سے ہو سکتی ہے۔ فرحانہ ایک انتہائی غیر متعلق کردار ہے۔ یہ بات میرے اور فرحانہ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا کہ ہمارے درمیان دلی نوعیت کا ارمان بھرا رشتہ استوار ہو چکا ہے حتیٰ کہ ہم دونوں کے گھر والوں کو بھی اس کی خبر نہیں۔"

اس نوعیت کی گفتگو کے دوران میں ہم گھر پہنچ گئے۔ اس وقت سہ پہر بلکہ شام کے پانچ بج رہے تھے۔ میں نے وحید صاحب کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور خود گھر کے اندرونی حصے میں امی کے پاس پہنچ گیا۔ ابو امی بھی وہیں موجود تھیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ فرحانہ کے ابو کو بھی اس سانحے کی اطلاع دے دی گئی تھی اور وہ بس پہنچنے ہی والے تھے۔ عبدالخالق کی صدر میں وال کلاک اور گھڑیوں کی دکان تھی۔

امی کچھ پریشان سی اور شازیہ بے انتہا خوف زدہ نظر آ رہی تھیں۔ میں ان کے درمیان جا بیٹھا اور گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

"امی! یہ سب کیسے ہوا؟"

"شازیہ اور فرحانہ مارکیٹ گئی تھیں۔" امی نے لرزتی ہوئی سانس کے ساتھ بتایا۔ "واپسی میں ایک گاڑی ان کے ساتھ آ کر رکی اور ------؟"

کہتے کہتے امی کی حالت بگڑنے لگی۔ میں نے جلدی سے انہیں سہارا دیا اور تین تکیوں کی ٹیک لگا کر انہیں بیٹھنے میں مدد کرتے ہوئے کہا۔ "آپ سکون سے رہیں۔ میں شازیہ سے پوچھ لیتا ہوں۔"

امی نے روہانسی آواز میں کہا۔ "بیٹا! انہیں تمہارا ہی سہارا ہے۔ فرحانہ کے ابو تو ہم عورتوں سے بھی زیادہ کمزور دل کے ہیں۔ فرحانہ کی واپسی کے لیے جو کچھ کرنا ہے تمہیں ہی کرنا ہے۔"

"آپ بالکل بے فکر ہو جائیں امی!" میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ "فرحانہ کو کچھ نہیں ہو گا۔ میں اس کا ایک بال بھی بیکا نہیں ہونے دوں گا۔ اس کی صحیح سلامت واپسی کے لیے مجھے اگر جان کی بازی بھی لگانا پڑی تو میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کروں گا۔ آپ مطمئن ہو جائیں۔"

پھر میں شازیہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "شازی! ڈرنے اور خوف زدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم فرحانہ کے ساتھ مارکیٹ گئی تھیں مجھے بتاؤ وہاں کیا واقعہ پیش آیا تھا۔"

"بھائی جان!" میرے حوصلہ دلانے پر وہ خاصی حد تک سنبھل گئی تھی۔ "ہم مارکیٹ سے واپس آ رہی تھیں کہ ایک گاڑی ہمارے ساتھ آ کر رکی۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر بتانے لگی۔ "پھر ایک دم اس گاڑی کے دروازے کھلے اور اندر سے دو خطرناک افراد باہر آ گئے۔ ان کے پاس کلاشنکوفیں بھی تھیں۔ ان میں سے ایک کلین شیو اور دوسرا بھاری مونچھوں والا تھا اور وہ دونوں شکل ہی سے خطرناک غنڈے دکھائی دیتے تھے۔"

"پھر ------ پھر کیا ہوا؟" میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

"ان میں سے جو کلین شیو تھا اس نے گہری نظر سے ہم دونوں کا جائزہ لیا اور کرخت لہجے میں پوچھا۔

'تم میں سے شازیہ کون ہے؟'

میں تو ان شیطانوں کو دیکھتے ہی گھبرا گئی تھی۔ اس شخص کے سوال پر فرحانہ جلدی سے بولی۔ 'میں ہوں شازیہ ------'"

شازیہ کا اتنا کہنا تھا کہ میں سمجھ گیا اس اغوا کی

واردات کی حقیقت کیا تھی۔ میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔ "ہاں شازی! اس کے بعد کیا ہوا؟"

"فرحانہ نے جیسے ہی خود کو شازیہ کہا۔ مونچھوں والے غنڈے نے مجھے دھکا دے کر پیچھے گرا دیا۔" وہ جھرجھری لیتے ہوئے بولی۔ "پھر انہوں نے آن واحد میں فرحانہ کو زبردستی اٹھا کر گاڑی میں ڈالا اور اس سے پہلے کہ میں اٹھ کر کھڑی ہوتی وہ گاڑی تیز رفتاری سے آگے بڑھ گئی تھی۔"

"اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ وہ غنڈے شازیہ کو اغوا کرنے آئے تھے لیکن وہ اس کی صورت آشنا نہیں تھے۔" آنٹی امینہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میری بچی قربانی کی بکری بن گئی۔"

"بعض اوقات بہت زیادہ ہوشیاری دکھانا بھی مصیبت کا باعث بن جاتا ہے آنٹی۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اگر اس موقع پر فرحانہ جوش میں آ کر غلط بیانی سے کام نہ لیتی تو وہ غنڈے یقیناً شازیہ کو اٹھا لے جاتے۔ بہرحال......" میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "فرحانہ اور شازیہ میری نظر میں ایک جیسی اہمیت کی حامل ہیں۔ میں بہت جلد فرحانہ کو ان غنڈوں کے چنگل سے چھڑا لاؤں گا۔"

"اللہ تمہاری زبان مبارک کرے بیٹا!" آنٹی امینہ نے تہ دل سے کہا۔

میں نے شازیہ سے پوچھا۔ "کیا تم مجھے ان غنڈوں کے حلیوں کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہو؟"

"دونوں کے چہرے کرخت اور آنکھیں سفاک تھیں۔" وہ سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "لیکن ایک غنڈا گورا چٹا، دبلا پتلا اور دراز قامت تھا۔ جبکہ بھاری مونچھوں والا سانولا اور درمیانہ قد تھا۔ وہ دیکھنے میں بڑا کمزور نظر آتا تھا۔ بس میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتی۔"

"اور گاڑی؟" میں نے پوچھا۔ "گاڑی کیسی تھی؟"

"وہ اندھے شیشوں والی ایک سیاہ جیپ تھی۔" شازیہ نے بتایا۔ "اس کے اندر کچھ بھی دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔"

"جیپ کا نمبر؟ تو تمہاری نگاہ پڑی ہوگی؟"

وہ فوراً میرے سوال کی تہ میں پہنچ گئی۔ جلدی سے بولی۔ "نہیں بھائی جان! حالات اتنی تیزی سے پیش آئے تھے کہ میں اس جیپ کا نمبر نوٹ نہیں کر سکی۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے پژمردہ سی سانس خارج کی پھر بڑا تشویش بھرا سوال کیا۔

"بھائی جان! میری تو کسی سے کوئی دشمنی نہیں پھر وہ غنڈے مجھے کیوں اغوا کرنا چاہتے تھے۔"

شازیہ کے استفسار پر میرا دل خون ہو گیا۔ میں نے خود پر جبر کرتے ہوئے بس اتنا کہا۔ "فی الحال میں کوئی اندازہ قائم کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں شازی! اغوا کنندگان کی جانب سے کوئی رابطہ ہو تو پتا چلے......" پھر میں نے روئے سخن امی کی جانب پھیرتے ہوئے اضافہ کیا۔

"امی! کیا اس واقعے کے بعد اغوا کنندگان میں سے کسی نے کوئی فون کیا؟"

"نہیں......" امی نے مجھے ٹٹولتی ہوئی نظر سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "البتہ......؟"

انہوں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے پوچھا۔ "البتہ کیا؟"

وہ بدستور کھوجتی ہوئی نگاہ سے مجھے دیکھتے ہوئے بولیں۔ "آج کل تمہاری فیکٹری میں کیا چل رہا ہے۔"

امی کا سوال سن کر میں بری طرح چونکا اور مضطربانہ انداز میں کہا۔

"کیا چل رہا ہے؟ آپ کو تو سب خبر ہی ہے۔"

"نہیں۔" انہوں نے قطعیت سے نفی میں گردن ہلائی۔ "مجھے سب خبر نہیں ہے۔ تم نے بہت کچھ مجھ سے چھپا رکھا ہے۔ آج دن میں ایک پراسرار فون آیا تھا......"

"پراسرار فون؟" میں نے چونک کر امی کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔" انہوں نے اثبات میں گردن ہلائی اور بتانے لگیں۔ "لگ بھگ دو بجے وہ پراسرار فون کال آئی تھی شازیہ پڑوس میں گئی تھی۔ میں نے بہ مشکل اٹھ کر فون اٹینڈ کیا۔ میرے ہیلو کے جواب میں دوسری جانب سے ایک کرخت مردانہ آواز میں پوچھا گیا۔

"آپ اسد کی ماں بات کر رہی ہیں؟"

"ہاں! میں اسد کی والدہ ہوں آپ کون؟"

"میں جو کوئی بھی ہوں آپ مجھے اپنا دشمن نمبر ایک سمجھیں۔" اس شخص نے نہایت ہی ڈھٹائی سے کہا۔

"اس دشمنی کی وجہ؟" میں پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"تمہارا بیٹا۔" وہ پھنکارا۔

غصے کی شدت میں اس شخص نے ادب آداب کو بھی چھوڑ دیا تھا۔ میں نے تشویش بھرے لہجے میں دریافت کیا۔ "میرے بیٹے نے ایسا کیا کر دیا ہے؟"

"تفصیل تو تم اپنے بیٹے سے ہی پوچھنا۔" وہ سرد مہر لہجے میں بولا۔ "میں صرف اتنا بتا دینا چاہتا ہوں کہ اسد نے جس راستے پر چلتے ہوئے ترقی کی منزل پانے کی کوشش کی ہے وہ اسے راس نہیں آئے گا۔ میں عنقریب اس کی ناک میں دم کر کے رکھ دوں گا اور اسے ایسا عبرت ناک سبق سکھاؤں گا کہ اس کی آنے والی نسلیں میرا نام سنتے ہی تھر تھر کانپنے لگیں گی۔"

"تم کون ہو...... اور کیا بکواس کر رہے ہو؟" مجھے بھی غصہ آ گیا۔

"میں کون ہوں بہت جلد تم لوگوں کو پتا چل جائے گا۔"

اس کے ساتھ اس بدبخت نے فون بند کر دیا تھا۔ میں نے تمہیں اسی وقت مطلع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ یہ سوچا تھا کہ جب شام میں تم گھر واپس آ جاؤ گے تو بات کروں گی لیکن اس سے پہلے ہی......" امی کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ بھیگی ہوئی آواز میں بولیں۔ "اسد! یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ بتاؤ مجھے تمہاری فیکٹری میں کیا گڑبڑ چل رہی ہے۔ تم نے کن خطرناک لوگوں کو اپنا دشمن بنا لیا ہے؟"

"امی! یہ ایک طویل کہانی ہے اور یہ موقع ایسے قصوں کو لے کر بیٹھنے کا نہیں ہے۔ ذرا فرصت ملے تو پھر آپ کو اس کی تفصیل سناؤں گا۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "یہ ممکن ہے شازیہ کے بجائے فرحانہ کا اغوا میری وجہ سے ہوا ہو لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں امی کہ آپ کا بیٹا کسی ایسی ویسی کارروائی میں ملوث نہیں۔ اللہ کے فضل و کرم سے میرے ہاتھ اور دامن صاف ہیں۔"

"مجھے اپنے دودھ اور تربیت پر پورا بھروسا ہے اسد!" امی نے فخریہ لہجے میں کہا۔ "لیکن یہ تو بتا دو کہ آج کل تمہاری فیکٹری میں ہو کیا رہا ہے؟"

"مختصراً اتنا سمجھ لیں امی!" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "فیکٹری کے تین ملازم اکاؤنٹنٹ انور، فورمین عظیم اور مارکیٹنگ منیجر یاسین بیگ نقلی ادویات کے گھناؤنے دھندے میں ملوث تھے وہ فیکٹری میں تیار ہونے والی اصلی ادویات کے ساتھ نقلی ادویات ڈسٹری بیوٹرز تک پہنچاتے تھے۔ مجھے ان کی مذموم سرگرمیوں کا پتا چلا تو میں نے فیکٹری مالکان کو اس کی خبر کر دی۔ پھر میرے تعاون سے مالکان نے

ان تینوں افراد کو ٹھوس ثبوت کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ اس کے بعد پہلی فرصت میں انہیں نوکری سے نکال دیا گیا۔" میں نے لمحاتی توقف کر کے اپنی سانس کو ہموار کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"جی! میں اپنے کیے پر ذرا بھی شرمندہ نہیں ہوں۔ میں نے جو کیا وہ میرے فرائض کا حصہ تھا اور آئندہ بھی میں اپنا فرض پورا کرتا رہوں گا اور جہاں تک فرحانہ کے اغوا کا معاملہ ہے تو اسے بھی سچ و صداقت والی انا میری ذمے داری ہے۔"

"کمال ان ناسوروں کو غارت کرے جو اسی درخت کو کاٹ ڈالتے ہیں جس کا وہ پھل کھا رہے ہوتے ہیں۔" ان کا اشارہ ان تینوں افراد کی طرف تھا جو میری اور ونی کی مشترکہ کوششوں سے اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچے تھے۔ "میری دعا ہے بیٹا۔ پاک پروردگار تمہیں ہر محاذ پر فتح دے۔"

"آمین ----" میں نے تہ دل سے کہا۔

آنٹی ناہید نے کہا۔ "بیٹا! اب تم جلدی سے فرحانہ کی تلاش میں سرگرم ہو جاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ اسے تمہارے ہی دشمنوں نے شازیہ سمجھ کر اغوا کیا ہے۔"

"انہوں نے فرحانہ کو شازیہ نہیں سمجھا تھا بلکہ خود فرحانہ نے اپنے آپ کو شازیہ کی حیثیت دے کر ان کا کام آسان کر دیا تھا۔" میں نے صاف اور کھرے الفاظ میں کہا۔ "اور فی الحال حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ فرحانہ کے اغوا میں میرے ہی دشمن ملوث ہیں جن کا ابھی ذکر ہوا ہے یا کوئی اور ہی لوگ ہیں۔ جب تک اغوا کنندگان کی طرف سے کوئی فون نہیں آتا صورت حال واضح نہیں ہوگی۔"

اسی لمحے بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ شازیہ دیکھنے گئی اور واپس آ کر بتایا کہ خالق انکل آئے ہیں۔

"میں نے انکل کو ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔"

"ٹھیک ہے میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔" میں نے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

---☆☆☆---

خالق انکل کا رنگ اڑا ہوا تھا اور وہ بڑی مصیبت میں دکھائی دیتے تھے۔ وہ ایک دھان پان اور پستہ قامت شخص تھے اور نظر کا نسبتاً موٹا چشمہ بھی لگاتے تھے۔ وہ عام حالات میں بھی خاصے نروس رہا کرتے تھے کجا یہ کہ ان کی اکلوتی بیٹی کو اغوا کر لیا گیا تھا۔

"اسد بیٹا!" وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولے۔

"مجھے بتاؤ یہ سب ہوا کیا ہے؟"

وحید صاحب کی سوالیہ نگاہ بھی مجھ پر لگی ہوئی تھی۔ میں نے اندرون خانہ سے حاصل ہونے والی معلومات کو جامع مگر مختصر الفاظ میں ان دونوں کے گوش گزار کر دیا۔ وحید صاحب نے سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا اور سرسراتی ہوئی آواز میں بولے۔

"اس کا مطلب ہے بلی تھیلے سے باہر آ گئی ہے۔ مجھے جو شک تھا یہ اسی سلسلے کی کڑی ہے بیٹا ---؟"

میں ان کے اشارے کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ وہ یہی کہنا چاہ رہے تھے کہ فرحانہ کے اغوا میں ان لوگوں کا ہاتھ ہے جنہیں خالد صاحب نے ایک ساتھ فیکٹری سے نکال دیا تھا۔ اسی کا دھیان بھی اسی طرف گیا تھا۔ موجودہ صورت حال میں جو بھی اس قصے کو سنتا وہ لامحالہ اسی انداز میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا مگر میں ابھی تک کسی حتمی فیصلے پر پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔

"نہیں وحید صاحب۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"اغوا کنندگان عموماً رقم کے حصول کے لیے کسی کو اغوا کرتے ہیں۔" وحید صاحب نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن اگر میرا شک درست ہے تو فرحانہ کو اغوا کرنے والے رقم کا مطالبہ نہیں کریں گے۔"

"جب تک اغوا کنندگان کی طرف سے رابطہ نہیں ہو جاتا کچھ بھی کہنا ممکن نہیں۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے مسٹر اسد! مجھے اجازت دیں۔" وحید صاحب اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ "آپ کو جب بھی میری مدد کی ضرورت پیش آئے بس ایک فون کر دیجیے گا۔ ویسے میں خالد صاحب کو صورت حال سے آگاہ کر دوں گا۔ آپ کو زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اللہ بہتر کرے گا۔"

رخصت ہونے سے پہلے وحید صاحب نے مجھے اپنا وزیٹنگ کارڈ دے دیا۔ جس پر ان کے گھر کا اور موبائل فون کا نمبر درج تھا۔ میں وحید صاحب کو سی آف کر کے واپس آیا تو خالق صاحب نے اضطرابی لہجے میں کہا۔

"اسد بیٹا! جہاں تک میں سمجھ رہا ہوں۔ فیکٹری میں تمہاری کسی سے دشمنی تھی۔ اس بندے کو تمہاری وجہ سے نوکری سے نکال دیا گیا۔ اس بات کا انتقام لینے کے لیے وہ تمہاری بہن شازیہ کو اغوا کرنا چاہتا تھا مگر غلطی سے وہ فرحانہ کو اٹھا لے گیا۔"

"انکل! آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔" میں نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ "لیکن فرحانہ اپنی غلطی کی وجہ سے اغوا ہوئی ہے۔ اسے اسمارٹ بننے کی کیا ضرورت تھی؟"

بات کے اختتام پر میرے لہجے میں تلخی در آئی تھی۔ عبدالخالق نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بیٹا! جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب یہ سوچو کہ فرحانہ کو ان شیطانوں کے چنگل سے کیسے آزاد کرانا ہے۔ ہماری ساری امیدیں تم ہی سے جڑی ہوئی ہیں۔"

"آپ بالکل پریشان نہ ہوں انکل۔" میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ "میں ان شاء اللہ آپ کی امیدوں پر پورا اتر کے دکھاؤں گا۔ بس ایک بار اس کیس کا سرا میرے ہاتھ لگ جائے۔"

"بیٹا! میں تم سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔" عبدالخالق لجاجت بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔

"کیسی درخواست انکل؟" میں نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔

"تم فرحانہ کو ڈھونڈنے اور واپس لانے کے لیے چاہے جو بھی راہ اختیار کرو مگر ایک کام ہرگز ہرگز نہیں کرنا۔"

عبدالخالق کے پراسرار لجاجت بھرے انداز نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے بے حد حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

"کون سا کام انکل؟"

"تم اس معاملے میں پولیس کو بالکل ملوث نہ کرنا۔" وہ حتمی انداز میں بولے۔

"کیوں انکل؟" میری الجھن دوچند ہو گئی۔ "اغوا کنندگان نے ایک سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ یہ معاملہ قابل دست اندازی پولیس ہے۔ ہم پولیس کو اس واقعے سے بے خبر رکھ کر جرم کے مرتکب ہوں گے۔"

وہ باقاعدہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے غم زدہ لہجے میں بولے۔ "بیٹا! یہ قانون اور قاعدے کی باتیں وہاں اچھی لگتی ہیں جہاں قانون اپنی اصل شکل میں موجود ہو اور معاشرے پر اس کا کماحقہ اطلاق بھی ہوتا ہو۔ مجھے ایک سال پہلے اپنے ملک کی پولیس کا ایک تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ میں مرتے مر جاؤں گا مگر ان پر بھروسا نہیں کروں گا۔"

میرے علم میں ایسا کوئی واقعہ نہیں تھا جو پچھلے سال

ڈیڑھ سال میں خالق صاحب کے ساتھ پیش آیا ہو۔
میں نے خاصے تعجب سے پوچھا۔

"انکل! آپ کس واقعے کا ذکر کر رہے ہیں؟"

"اس واقعے کا ذکر میں نے صرف تمہاری آنٹی سے کیا تھا۔" وہ دھیمے سے بولے۔ "اور انہیں کو بھی سختی سے منع کر دیا تھا کہ اس بات کا کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے فرحانہ کو بھی نہیں۔"

"ایسا کیا ہوا تھا؟" میں نے متذبذب لہجے میں کہا۔ "مجھے کچھ بتائیں۔"

"ضرور بتاؤں گا۔ تمہیں میں ضرور بتاؤں گا۔" وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولے۔ "کوئی سال بھر پہلے مجھے بھتے کی ایک پرچی موصول ہوئی تھی۔ جس میں مجھ سے ایک لاکھ روپے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک پر اسرار کال کے ذریعے مجھے میری اور میری بچی کی تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے وارننگ دی گئی تھی کہ اگر میں نے اس معاملے کی پولیس کو بھنک بھی پڑنے دی تو بہت برا ہوگا۔ اتنا برا جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔" بات کے اختتام پر انہوں نے ایک جھرجھری لی۔

"جہاں تک میرا اندازہ ہے" میں نے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ نے اس بارے میں پولیس کو بتا دیا تھا؟"

"ہاں۔" انہوں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "یہ میری زندگی کی پہلی اور آخری بھیانک غلطی تھی۔ اس غلطی کا کیا نتیجہ برآمد ہوا تھا؟"

"نہیں پتا آپ بتائیں؟" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"میں نے جب پولیس کو بھتے کی اس پرچی کے بارے میں بتایا تو انہوں نے مجھے بہت حوصلہ دیا اور سختی سے منع کر دیا کہ مجھے ایک پیسہ بھی ادا نہیں کرنا۔

میں نے آفیسر سے کہا۔

"سر! یہ لوگ بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ عدم ادائیگی کی صورت میں اگر انہوں نے میرے یا میری بچی کے ساتھ کوئی مہلک معاملہ کر دیا تو میں کیا کروں گا؟"

"آپ اس سلسلے میں بالکل بے فکر ہو جائیں۔ وہ لوگ کتنے بھی خطرناک کیوں نہ ہوں لیکن قانون سے زیادہ طاقت ور نہیں ہو سکتے۔" پولیس آفیسر نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "آپ یہ بتائیں انہوں نے رقم کی ادائیگی کے لیے آپ کو کتنا وقت دیا ہے؟"

"دو دن۔" میں نے جواب دیا۔

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔" آفیسر بڑے اطمینان سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

"آپ اپنی بچی کے لیے تو قطعاً پریشان نہ ہوں انہوں نے دو دن کا وقت دیا ہے تو وہ دو دن کے بعد ہی آپ کی دکان پر ہی آئیں گے اور اسی وقت ہم انہیں گرفتار کر لیں گے۔"

"وہ کیسے سر؟" میں نے حیرت بھری نظر سے آفیسر کو دیکھا۔

"میں آج ہی سے دو سادہ لباس اور مستعد پولیس اہلکاروں کی ڈیوٹی لگا دیتا ہوں۔" وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔ "آپ سے میں ان لوگوں کا تعارف کرا دوں گا۔ یہ لوگ آپ کی دکان کھلنے سے پہلے وہاں موجود ہوں گے اور جب تک آپ دکان بند کر کے گھر نہیں چلے جاتے یہ اپنی ڈیوٹی پر موجود رہیں گے۔" وہ ایک لمحے کے لیے سانس ہموار کرنے کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"بھتا خور جب آپ کے پاس ایک لاکھ کی رقم وصول کرنے آئے گا تو آپ ان سادہ لباس اہلکاروں کو بس ہلکا سا اشارہ کر دیجیے گا۔ یہ چیتے کی مانند لپک کر

اسے رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیں گے ان شاء اللہ خیر سلا۔"

"ٹھیک ہے سر۔" میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی پھر پوچھا۔ "سر! کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوگی؟"

"بالکل نہیں۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "جو لوگ قانون کے لیے پولیس کے پاس آتے ہیں ہم انہیں تحفظ بھی فراہم کرتے ہیں اور بہر حال ان کی مدد بھی کرتے ہیں۔ ویسے خالد صاحب! آپ بہت خوش قسمت انسان ہیں۔"

آفیسر کی بات میری عقل کے اوپر سے گزر گئی۔
میں نے حیرت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔
"خوش قسمت وہ کیسے سر؟"

"وہ ایسے کہ انہوں نے آپ سے صرف ایک لاکھ کا مطالبہ کیا ہے۔" آفیسر قدرے تیز انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "ورنہ یہ لوگ تو پانچ دس لاکھ سے کم کی بات ہی نہیں کرتے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر!" میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور آفیسر کا شکریہ ادا کر کے واپس آ گیا۔

اگلے روز سے میری دکان کے قریب وہ سادہ لباس پولیس اہلکار تعینات کر دیے گئے۔ جب بھی میری دکان پر کوئی گاہک آتا تو وہ مجھ سے اشارہ میں پوچھتے اور نظروں ہی نظروں میں مجھ سے پوچھتے کہ کیا یہ وہی بھتا خور تو نہیں جس کی سرکوبی کے لیے انہیں وہاں متعین کیا گیا ہے۔ میں بھی نظروں ہی نظروں میں انہیں منع کر دیتا۔

میں اس انتظام سے بہت خوش تھا اور دل ہی دل میں پولیس کی فرض شناسی کو دعائیں بھی دے رہا تھا۔ ساتھ ہی مجھے ان لوگوں پر شدید غصہ بھی آتا تھا جو بلا سوچے سمجھے پولیس کے خلاف اناپ شناپ بولتے رہتے ہیں۔ میں نے تو انہیں انتہائی مخلص اور فرض شناس پایا تھا۔

میرا اطمینان اس وقت غارت ہو کر رہ گیا جب بھتا خور پرچی پر درج ایک لاکھ کی رقم وصول کرنے آ گیا۔ میں نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ یہ وہی شخص تھا جو مجھے پرچی دے کر گیا تھا۔

میں نے اس سفاک شخص کو اپنے سامنے پاتے ہی اپنے محافظوں کی جانب نگاہ اٹھائی لیکن تاحد نظر وہ مجھے کہیں دکھائی نہ دیے۔ میری نگاہ مایوس اور نامراد واپس لوٹ آئی۔ بھتا خور نے غراہٹ آمیز لہجے میں کہا۔

"منع کیا تھا نا پولیس کو بیچ میں نہیں ڈالنا لیکن یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔ خیر میں خالی ہاتھ تو واپس نہیں جاؤں گا۔ اس وقت تمہاری دکان میں جتنی رقم ہے وہ فوراً میرے حوالے کر دو اور اس کے ساتھ ہی تمام قیمتی رسٹ واچ بھی ایک شاپنگ بیگ میں ڈال کر مجھے دے دو۔ جلدی کرو۔"

بات کے اختتام پر اس نے گن بھی نکال لی تھی۔

میں نے آخری مرتبہ اپنے محافظوں کی جانب نگاہ دوڑائی لیکن لاحاصل۔ اسی لمحے بھتا خور کی دھمکی آمیز آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"اگر تم نے ایک منٹ میں میرے حکم کی تعمیل نہ کی تو اس دکان کے اندر تمہاری لاش تڑپتی دکھائی دے گی۔"

کسی بھی انسان کے لیے سب سے قیمتی شے اس کی جان ہوتی ہے۔ میں اس بھتا خور کی بات ماننے کے لیے مجبور ہو گیا۔ وہ سہ پہر کا وقت تھا اور میری میز کی دراز میں ساٹھ ہزار سے زیادہ کا کیش تھا۔ اس کے علاوہ میں نے شاپنگ بیگ میں جو رسٹ واچ بھر کر اس شیطان کے حوالے کیں ان میں بعض بہت قیمتی اور نایاب گھڑیاں تھیں۔ میرے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ وہ خطرناک آدمی گن کے زور پر مجھے لگ بھگ سوا لاکھ کی [illegible] دے کر اطمینان سے فرار ہو گیا۔

میں نے ابھی اپنی بربادی کا ماتم شروع بھی نہیں کیا تھا کہ مجھے وہ دونوں آتے نظر آگئے جو تھوڑی دیر پہلے تک میرے ساتھ رہے تھے۔ میں نے غصیلے لہجے میں ان دونوں کو اپنے پاس بلایا۔

"کیا ہوا انکل؟" ایک نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

دوسرا جلدی سے بولا۔ "انکل! آپ خاصے پریشان نظر آرہے ہیں۔ خیریت تو ہے؟"

"میری پریشانی کو تم لوگ جہنم میں ڈالو۔" میں نے جلے بھنے لہجے میں کہا۔ "یہ بتاؤ تم دونوں کہاں مر گئے تھے؟"

"انکل! میں تو عصر کی نماز پڑھنے گیا تھا۔" ایک مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ "کچھ بتائیں تو سہی آخر ہوا کیا ہے؟"

"اور تم؟" میں نے پہلے کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے دوسرے سے پوچھا۔

"میں... میں واش روم گیا تھا؟"

ان دونوں کے چہروں کے تاثرات سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ بھتا خور کے ساتھ ملے ہوئے تھے اور انہوں نے دانستہ اسے سیف بیچ دیا تھا جب میں نے انہیں بتایا کہ وہ بھتا خور آیا تھا اور میرا بچہ اٹھا کر چلا گیا ہے تو ان کے چہروں پر مصنوعی حیرت نمودار ہوئی اور وہ دونوں بہ یک زبان ہو کر بولے۔

"کدھر گیا ہے وہ؟"

وہ جدھر گیا تھا میں نے اسی سمت اشارہ کر دیا۔ ان دونوں کمینوں نے میری بتائی ہوئی سمت میں دوڑ لگا دی۔ وہ دن اور آج کا دن میں نے پھر ان کی شکل نہیں دیکھی۔" یہاں تک بتانے کے بعد خالق صاحب نے ایک طویل اور گہری سانس خارج کی پھر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے التجا آمیز لہجے میں بولے۔

"اسد! اس دن سے پولیس کے محکمے پر سے میرا یقین اٹھ گیا ہے۔ اگر یہ لوگ مجرموں کو تحفظ نہ دیں، ان کے ہاتھ مضبوط نہ کریں تو ہمارا ملک جنت کا نمونہ بن جائے۔ اس لیے بیٹا! میری تم سے درخواست ہے کہ فرحان والے معاملے میں پولیس کو ہرگز ہرگز ملوث نہیں کرنا۔"

ادھر عبدالخالق صاحب کی التجا ختم ہوئی ادھر میرے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اسکرین پر اجنبی نمبر فلیش ہوتے دیکھ کر میں چونکا۔ میں نے خالق صاحب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کال ریسیو کا بٹن دباتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہیلو...؟"

"ہیلو سودا! کیسے ہو؟" دوسری جانب سے طنزیہ لہجے میں کہا گیا۔

یہ آواز مجھے جانی پہچانی سی لگی مگر فوری طور پر یاد نہ آسکا کہ میں نے اس شخص کو کہاں سنا ہے۔

میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "کون ہو تم؟"

"کمال ہے آپ تو اپنے باپ کو پہچاننے سے انکار کر رہے ہو۔" وہ بڑے بے ہودہ انداز میں قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ "یاد کرو، ہماری پہلی ملاقات جب تم ایک بکرا چھیننے والے بچے کی حمایت میں میرے سامنے تن کر کھڑے ہو گئے تھے۔"

سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں صورت حال مجھ پر روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی۔ یہ وہی منہ زور کمینہ تھا میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

"میں تم جیسے دو ٹکے اور گھٹیا لوگوں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ بتاؤ کس مقصد سے فون کیا ہے۔"

"میں تم سے رشتے داری کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں

اپنا سالا بنانا چاہتا ہوں۔ اس مقصد کے لیے میں نے تمہاری اکلوتی بہن شازیہ کو اغوا کر لیا ہے۔" وہ بڑے فخر سے اپنے کالے کرتوتوں کی تفصیل بیان کرنے لگا۔ "ہماری شادی میں آؤ گے نا؟"

"یہ کیا بکواس کر رہے ہو۔" میں نے تیکھے انداز میں کہا۔

"میری بہن شازیہ تو اس وقت گھر میں میرے پاس موجود ہے۔"

"مجھے چکما دینے کی کوشش نہ کرو یہ کام تم پہلے ہی بہت کر چکے ہو۔" وہ چمکارنے کے مشابہ آواز میں بولا۔ "بکرے والے بچے کی حمایت میں تم نے مجھ سے جو بدتمیزی کی تھی اس کا بدلہ لینے کے لیے میں نے اپنے دو آدمیوں کو تمہارے پیچھے بھیجا مگر وہ دونوں تمہارے سامنے بھیگے چوہے بن گئے۔ تم نے مار مار کر ان کا بھرکس نکال دیا تھا۔ یہ تو شکر ہے جس فائر کے نتیجے میں خنجر لگا اس کی جان بچ گئی ہے۔ ابھی مجھے احساس ہوا کہ تمہیں لائٹ نہیں لینا چاہیے... چنانچہ..." وہ لمحاتی توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔ "چنانچہ میں نے اپنے آدمیوں کی مدد سے بڑی خاموشی کے ساتھ تمہارے بارے میں تحقیقات کرائیں اور یہی بات سمجھ میں آئی کہ تمہارا غرور توڑنے کے لیے مجھے تمہاری بہن پر ہاتھ ڈالنا ہوگا۔ بولو آئیڈیا کیسا ہے؟"

"تم، تمہارا یہ خبیث آئیڈیا اور تمہارا تحقیقاتی مشن سب الو کے پٹھے اور جاہل کے لگتے ہیں۔" میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔ پھر ایک خاص مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ "میری بہن شازیہ اللہ کے فضل و کرم سے میرے پاس محفوظ ہے اور اللہ نے چاہا تو وہ ہمیشہ محفوظ ہی رہے گی۔ تمہارے آدمیوں نے الو کا گوشت کھایا ہے۔ جھک ماری ہے۔"

"تم اس طرح کے پینترے بدل کر مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "تمہاری بہن اس وقت میرے قبضے میں ہے۔ اگر اس کی سلامتی چاہتے ہو تو میں جہاں بلاؤں چپ چاپ چلے آؤ اور بالکل اکیلے۔"

"لگتا ہے تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" میں نے اس کی باتوں کو لااہمیت دیتے ہوئے کہا "اگر تمہیں میری باتوں کا یقین نہیں آرہا تو میں تمہیں اپنی بہن شازیہ کی آواز سنا دیتا ہوں۔"

"میرا نام مرزا شیر دل ہے۔" وہ بڑے فخر سے بولا۔ "اور تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ میں کتنا خطرناک انسان ہوں۔ تم نے میرے ساتھ دشمنی مول لے کر اپنی زندگی کو اذیت اور کرب کے حوالے کیا ہے۔"

"تم اگر شیر دل ہو تو میں بہت جلد تمہارا گوشت یا واسکٹ بناؤں گا۔" میں نے اس کے زخموں پر مرچیں چھڑکتے ہوئے کہا۔ "اور جہاں تک تمہاری خطرناکی کا تعلق ہے تو وہ میں نے دو واقعات میں ہی توڑ کر دی ہے۔ پہلی مرتبہ میں نے تمہاری ناک سے خون کا فوارہ جاری کیا اور تم کچھ نہ کر سکے دوسری دفعہ میں نے تمہارے بھیجے ہوئے غنڈوں کو بھری دوپہر میں ذلیل و رسوا کر ڈالا اور تم ہاتھ ملتے رہ گئے اور اب..." میں نے سانس ہموار کرنے کے لیے رکا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"اب تیسری بار تم نے ایک نہایت ہی گری ہوئی حرکت کی ہے۔ میری بہن کے مقابلے میں تم نہ جانے کس کو اٹھوا لے گئے ہو۔"

"تمہاری بکواس بند کرانے کا ایک ہی طریقہ ہے۔" وہ غصے سے گویا پاگل ہوتے ہوئے بولا۔ میرے الفاظ نے جلتی پر تیل کا کام دکھایا تھا۔

"نہیں میں تمہیں شازیہ کی آواز سناتا ہوں۔"

میں نے معنی خیز انداز میں عبدالخالق کی طرف دیکھا اور دوبارہ انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کرنے کے بعد سیل فون کا اسپیکر آن کر دیا۔ اگلے ہی لمحے وہاں مدیم شیر دلی کی کرخت آواز ابھری۔ وہ فرحانہ سے مخاطب تھا۔

"لو اپنے بھائی جان سے بات کرو۔"

میں اس بے طرح چونک پڑا تھا۔ فرحانہ کے اغوا نے مجھے اندر ہی اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ان نازک لمحات میں، میں بڑی مشکل سے اپنے حواس اور اعصاب کو قابو میں رکھے ہوئے تھا۔ یہ بہت ضروری تھا اگر میں اس مرحلے پر مدیم شیر دلی کے سامنے خود کو مشتعل ظاہر کرتا تو یہ کھیل بری طرح بگڑ سکتا تھا۔ سیل فون کے اسپیکر سے فرحانہ کی لرزتی ہوئی آواز ابھری۔

"بھائی جان آپ کیسے ہیں؟"

"او فرحانہ!" میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تم نے کیا حماقت کی ان غنڈوں کے سامنے خود کو شازیہ کیوں ظاہر کیا؟"

"سر شازیہ تو خیریت سے ہے؟" اس نے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا۔

"ہاں ہاں وہ خیریت سے ہے۔" میں نے بیزاری سے کہا۔ "تم میرے سوال کا جواب دو۔"

"سر! میں ان غنڈوں کو دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی کہ وہ کسی برے ارادے سے شازیہ کو پوچھ رہے ہیں۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "شازیہ میری دوست ہے بس سر پتا نہیں اس وقت میرے دماغ میں کیا آئی کہ......؟"

بولتے بولتے فرحانہ کی آواز معدوم ہو گئی مجھے یہ اندازہ لگانے میں قطعاً کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا کہ مدیم شیر دلی نے اسے فون سے دور ہٹا دیا ہوگا۔ اگلے ہی لمحے میرا اندازہ درست ثابت ہوا اور سیل فون کے اسپیکر پر مدیم کی چہکتی ہوئی شکست خوردہ آواز سنائی دی۔

"تمہاری قسمت بہت اچھی ہے اسد! میرے آدمی اس لڑکی کی چالاکی کی وجہ سے دھوکا کھا گئے۔ خیر بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔"

"دیکھو شیر دلی!" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "تمہاری دشمنی مجھ سے ہے بہتر ہوگا کہ اس میں غیر متعلق لوگوں کو گھسیٹنے کی کوشش نہ کرو۔ اگر تمہارے اندر ذرا سی بھی انسانیت موجود ہے تو فرحانہ کو چھوڑ دو...."

"میرے اندر ذرا سی نہیں بلکہ بہت زیادہ انسانیت موجود ہے۔" وہ مضحکہ اڑانے والے انداز میں بولا۔ "لیکن میں کسی بھی قیمت میں اپنا نقصان نہیں کرتا۔ فرحانہ کو میں چھوڑ دوں گا مگر اس کے لیے تمہیں مجھ سے تعاون کرنا ہوگا۔"

"بولو کیا تعاون چاہیے مجھ سے۔" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"یہ تو ثابت ہو گیا کہ فرحانہ تمہاری بہن کی دوست ہے۔" وہ مکاری سے بولا۔ "اور یہ جس طرح تمہیں سر سر کہہ کر پکار رہی تھی اس سے لگتا ہے کہ یہ تمہاری اسٹوڈنٹ بھی ہے؟"

"ہاں میں پارٹ ٹائم ٹیوشن پڑھاتا ہوں۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "دوسرے اسٹوڈنٹس کی طرح فرحانہ بھی میری ایک اسٹوڈنٹ ہے۔"

"مجھے تم سے کس قسم کا تعاون چاہیے میں کہ یہ بتاتا رہوں گا۔" وہ ایک قدم اور آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ "فی الحال مجھے فرحانہ کے گھر والوں کا رابطہ نمبر چاہیے میں انہیں فون کر کے معاملات طے کرنا چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے تم چند منٹ کے بعد دوبارہ مجھے فون کرو جب تک میں ان کا نمبر تلاش کر کے رکھتا ہوں۔" میں نے تعاون آمیز انداز میں کہا۔ "یا پھر ایسا کرتے ہیں کہ میں تم سے خود رابطہ کرتا ہوں۔"

"نہیں۔" وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے قطعیت سے بولا۔ "تم مجھے فون نہیں کرو گے۔ تم اس بات پر خوش ہو رہے ہو گے کہ میرا نمبر تمہارے پاس آ گیا ہے تو اس خوش فہمی کو ذہن سے نکال دو۔ یہ نمبر اب تمہیں انگیج ملے گا۔ میں یہی کہوں گا کہ تم بس انتظار کرو۔"

"او کے تم چند منٹ کے بعد مجھے فون کرو۔"

ادھر میری بات ختم ہوئی ادھر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ میں نے فون بند کرنے کے بعد عبدالخالق کی طرف دیکھا اور کہا۔

"انکل! آپ نے فرحانہ کی آواز سن لی۔ وہ زندہ سلامت ہے۔"

"ہاں بیٹا!" انہوں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "لیکن اسے اس ظالم شخص کے چنگل سے چھڑانا بھی تو ہے۔"

"سب ہو جائے گا۔ میں آپ کی بیٹی کو آپ کی آنکھوں کے سامنے صحیح سلامت لا کر کھڑا کروں گا۔" میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "وہ میری دشمنی کی نذر ہوئی ہے۔ اس کی واپسی اب میری ذمہ داری ہے لیکن اس کے لیے آپ کو مجھ سے بھرپور تعاون کرنا ہوگا۔"

"بیٹا میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"بس ٹھیک ہے بیٹا۔" وہ چپ کر رہے۔ "تم جو کہو گے میں وہی کروں گا۔"

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "نمبر ایک آپ آنٹی کو لے کر فوراً اپنے گھر چلے جائیں نمبر دو محلے میں کسی کو یہ خبر نہیں ہونی چاہیے کہ فرحانہ کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ یہ بات آنٹی کو بھی اچھی طرح سمجھا دیں۔ نمبر تین میں بھی تھوڑی دیر میں آپ ہی کے پاس آ رہا ہوں۔"

میری ہدایات سننے کے بعد انکل خالق کی کوٹھی میں بیٹھ گئیں۔ وہ آنٹی کو لے کر اپنے گھر چلے گئے۔ مجھے امی نے گھیر لیا۔

"کیا ہوا فرحانہ کا پتا چلا؟"

"سب پتا چل گیا ہے۔" میں نے ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "وہ بالکل خیریت سے ہے اور بہت جلد واپس بھی آ جائے گی۔"

"کیا اغوا کنندگان سے تمہارا کوئی رابطہ ہوا؟"

"جی امی!" میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "ابھی ان سے مذاکرات کر کے آ رہا ہوں۔"

"کون ہے وہ بدبخت؟" امی جلال میں آ گئیں۔ "کیا یہ مزدوروں میں کوئی ہے جنہیں فیکٹری میں سے نکالا گیا ہے؟"

"نہیں امی یہ کوئی دوسرا چکر ہے۔"

"دوسرا چکر!" وہ الجھن زدہ نظروں سے مجھے تکنے لگیں۔ "کہاں کہاں دشمنیاں پال رکھی ہیں تم نے......؟"

"امی آپ کو یاد ہوگا......" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "دو ماہ پہلے جب میں اس نوکری کے لیے انٹرویو دینے گیا تھا تو میرا ایک آدمی سے جھگڑا ہو گیا تھا اور میں نے مکا مار کر اس کی ناک سے خون جاری کر دیا تھا۔"

"ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" وہ سیدھی ہو کر بیٹھتے ہوئے بولیں۔ "وہ جو کسی پکڑے والے بچے کو زد و کوب کر رہا تھا اور تم بچے کی حمایت میں اس سے الجھ گئے تھے۔"

"جی امی میں اسی کی بات کر رہا ہوں۔" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "اس شیطان کا نام مدیم شیر دلی معلوم ہوا ہے۔ اسی نے فرحانہ کو اغوا

کرلیا ہے۔"

امی چند لمحات تک نواتی نظروں سے مجھے دیکھتی رہیں پھر عجیب سے لہجے میں بولیں۔ "اسد! کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں نے یہ بال دھوپ میں سفید کیے ہیں؟"

"نہیں امی....." میں ایک دم گڑبڑا گیا۔ "کیا ہوا ہے؟"

"کوئی اتنی معمولی بات پر تمہاری بہن کے اغوا جیسا سنگین قدم نہیں اٹھا سکتا۔" وہ بدستور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولیں۔ "تمہاری آنکھیں چغلی کھا رہی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم بہت کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔ سچ سچ بتاؤ اس بار شیروانی کے ساتھ تمہاری بات اس حد تک کیسے بڑھ گئی؟"

میں امی سے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا لہٰذا انہیں من وعن وہ واقعہ سنا دیا جب میں نے اور خوش دلی نے مل کر شیروانی کے غنڈوں کی دھلائی کی تھی۔ میرے خاموش ہونے پر امی نے کہا۔

"کوئی فائدہ نہیں ہے بیٹا! آج وہ شازیہ کے مقابلے میں فرحانہ کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ کل وہ تمہاری بہن کے ساتھ بھی کوئی اوچھی حرکت کرسکتے ہیں۔ تم کیوں ایسے لوگوں کو اپنا دشمن بناتے پھر رہے ہو....؟"

امی کے آخری الفاظ کرب اور اذیت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ ان لمحات میں وہ بہت آزردہ اور ٹوٹی پھوٹی نظر آ رہی تھیں۔ انہوں نے زندگی بھر شوہر کے بے حساب دکھ اٹھائے تھے اور ہمیں پال پوس کر جوان کیا تھا۔ آج میری وجہ سے انہیں دکھ ہو رہا تھا لیکن اندازہ نہ تھا کہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ میں نے ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے اور ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"امی! میں نے تو ظلم اور زیادتی کا ہاتھ روکنے کی کوشش کی تھی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ معاملہ اتنی سنگین صورت اختیار کرلے گا۔ شیروانی بڑا ہی کمینہ اور کمینہ پرور انسان ہے ذرا سی بات کو اس نے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا ہے۔"

"بیٹا! یہ انا بڑی عجیب و غریب شے ہے۔" امی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اگر اس کا مثبت استعمال کیا جائے تو یہ انسان کو فرش سے عرش تک لے جاتی ہے مگر منفی انا ایک اچھے خاصے انسان کو بھی شیطان بنا دیتی ہے۔ میں نے تمہیں ایک بار سمجھایا کہ برے لوگوں سے دور رہو مگر تمہیں تو ہیرو بننے کا کچھ زیادہ ہی شوق ہے۔ بیٹا یہ تمہاری وجہ سے...." بولتے بولتے امی کی آنکھیں چھلک آئیں۔ لمحاتی توقف کے بعد وہ اضافہ کرتے ہوئے بولیں۔

"تمہاری وجہ سے آج پہلی مرتبہ پڑوس کے سامنے میری گردن بھی جھکی ہے اس واقعے کی وجہ سے اس سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکی۔"

"مجھے آپ کی تکلیف کا پورا احساس ہے امی!" میں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اگرچہ اس معاملے میں ذاتی طور پر میرا کوئی قصور نہیں لیکن یہ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ فرحانہ کو اگر میری وجہ سے اغوا کیا گیا ہے تو میں بہت جلد اسے صحیح وسلامت واپس بھی لے کر آؤں گا۔ مجھے شیروانی جیسے بدبختوں سے نمٹنا خوب آتا ہے۔"

"تم کس کس سے نمٹو گے بیٹا!" امی نے بڑے کرب کے ساتھ کہا۔ "ابھی دن میں جو فون آیا تھا میں اس کے لیے ابھی سے پریشان ہو رہی ہوں۔ یہ شیروانی تو ایک ہے اور وہ تو ہے پکا شیطان..... بیٹا تمہیں پتا بھی ہے کہ ہم کتنے خطرناک حالات میں گھرتے چلے جا رہے ہیں۔"

"کچھ نہیں ہوگا امی!" میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "آپ کو فکر مند ہونے کے بجائے اپنے بیٹے پر بھروسا کرنا چاہیے۔ میں اپنی جان پر کھیل کر آپ لوگوں کی حفاظت کر سکتا ہوں۔"

"میں بھی تو یہی نہیں چاہتی ہوں بچے۔" وہ روتے ہوئے لہجے میں بولیں۔ "ایک ماں کے سامنے تم اپنی جان پر کھیلنے کی بات کر رہے ہو۔ اللہ پاک نے اگر تمہیں صحت اور جوانی دی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ زندگی کو لاحاصل... بے مقصد کر دیا جائے۔ نہیں ہرگز نہیں۔" انہوں نے بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلائی پھر بڑے مضبوط لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں آگ اور خون کے اس کھیل کا حصہ نہیں بننے دوں گی۔" وہ بڑے جذباتی اور حساس لمحات تھے میں امی کو یہ نہیں سمجھا سکتا تھا کہ ہم یوٹوپیا کے باسی نہیں ہیں۔ ہمارا ملک بلکہ پوری دنیا ہی درندوں کا ایک جنگل ہے جہاں ہر رنگ و نسل کے جانور پائے جاتے ہیں۔ بکری اور بھیڑ کی زندگی گزارنے سے تو بہتر ہے انسان خودکشی ہی کرلے۔ یہاں وحشی درندوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہی ان کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ زندگی اور موت تو اس قادر مطلق کے ہاتھ میں ہے۔ مظلوم کی مدد کرنے کے دوران میں اگر ظالم کے ہاتھوں کوئی تکلیف کوئی نقصان بھی پہنچ جائے تو اسے کھیل کا حصہ سمجھتے ہوئے مسکرا کر قبول کر لینا چاہیے۔

مگر یہ ایسی باتیں کرنے کا موقع نہیں تھا۔ امی پہلے ہی بہت دکھی تھیں۔ میری جرأت اور بہادری کی کوئی بھی تقریر انہیں مزید غم زدہ کر سکتی تھی لہٰذا صورت کے تقاضے نبھاتے ہوئے میں نے کہا۔

"امی! آپ جیسا چاہیں گی ویسا ہی ہوگا۔ اب آپ اطمینان سے گھر میں آرام کریں۔ میں نائک انکل کے پاس جا رہا ہوں۔ اغوا کنندگان سے جو بھی معاملہ ہوگا وہ میری موجودگی میں ہونا چاہیے۔ میں تھوڑی دیر میں واپس آ کر آپ کو رپورٹ پیش کرتا ہوں۔"

"چلو بیٹا اللہ تمہاری مدد کرے گا۔"

"آمین۔" میں نے تہہ دل سے کہا۔

میں اٹھ کر کھڑا ہوا تو شازیہ نے پہلی مرتبہ لب کشائی کرتے ہوئے کہا۔ "بھائی جان میں بھی آپ کے ساتھ چلوں؟"

میں نے سوالیہ نظروں سے امی کی طرف دیکھا۔ وہ جلدی سے بولیں۔

"ہاں ٹھیک ہے شازیہ کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔"

میں نے کہا۔ "آپ گھر میں اکیلی رہیں گی؟"

"کچھ نہیں ہوگا مجھے۔" امی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "فرحانہ شازیہ کی وجہ سے اغوا ہوئی ہے۔ اس کا بچی پر بڑا اثر ہوگا۔ یہ ساری کارروائی دیکھنا......"

میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

☆☆☆

مجھے فرحانہ کے گھر آنے کا بہت کم اتفاق ہوا تھا۔ شاید اس سے پہلے میں ایک دو بار ہی آیا ہوں گا لیکن اس وقت فرحانہ محض میری ایک چھوٹی بہن کی سہیلی تھی اس سے میرا دور دور کا کوئی بھی تعلق قائم نہیں ہوا تھا۔ اب صورت حال قطعی مختلف تھی۔ میں اس کے گھر کے اندر داخل ہوا تو اس کے وجود کی مخصوص مہک نے اپنے حصار میں لے لیا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا اس گھر کی ہر ہر شے کے اندر وہ موجود ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ وہاں موجود نہیں تھی مگر میرا تصور اسے جا بجا کھوج رہا تھا۔

یہ تصور اور تخیل بڑی عجیب و غریب چیزیں ہیں۔ انسان کا جس شے میں دل لگا ہوتا ہے وہ ہر لمحہ اسے اپنے آس پاس نظر آتا ہے یہی وجہ ہے کہ کسی عزیز ترین ہستی کی موت کا یقین نہیں آتا۔ ہمارا تصور اس

بات سامنے کے لیے تیار نہیں ہوتا کہ کوئی ہم سے جدا ہو چکا ہے۔ بات در اصل یہ ہے کہ تصور کا تعلق خالصتاً روحانی دنیا سے ہے۔ یہ حقیقت کو نظر میں نہیں لاتا۔ جب کوئی شے ہمارے پاس نہیں رہتی تو اس کا مطلب ہے وہ جسمانی طور پر ہم سے الگ ہو چکی ہے کیونکہ موت صرف اس کے جسم کو ہی فنا کرتی ہے۔

میں بھی ان لمحات میں تصور کی کرشمہ سازیوں میں الجھا ہوا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ فرحانہ ابھی گھر کے کسی گوشے سے نمودار ہو کر حیرت سے مجھے دیکھے گی اور بے ساختہ اس کے لب تھرتھرائیں گے۔

"آپ آ گئے۔"

کیا ہو سکتا ہے۔ وہ اور میں اپنے دل و دماغ کو فرحانہ کی یاد سے مہکاتے ہوئے انکل آنٹی کے پاس پہنچ گیا۔ وہ ڈنر کے ابتدائی ایام تھے اور رات میں ابھی خاصی خنکی ہو جاتی تھی لہٰذا ایک اندرونی کمرے کو "بیڈ کوارٹر" بنا لیا گیا۔ اتفاق سے فون کی لائن بھی اسی کمرے میں تھی۔

میں نے قلم اور رف پیڈ سنبھال لیا پھر عبدالخالق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "انکل میں نے آپ کو ہر زاویے سے تفصیل سے سمجھا دیا ہے۔ آپ میری ہدایت کے مطابق عمل کریں گے۔ یہیں میں آپ کی مدد کے لیے موجود ہوں۔ میں پیڈ پر لکھ کر آپ کو گائیڈ کرتا رہوں گا۔ پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں نے عبدالخالق کو اپنے ڈرائنگ روم ہی میں اغوا کنندگان سے گفتگو کرنے کے اسرار و رموز اچھی طرح ازبر کروا دیے تھے۔ میں ان کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ شیر دلی کا ایک اور حربہ ناکام کیا تھا۔ وہ مجھے کوئی نقصان پہنچانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اب اس گھٹیا شخص سے یہ امید کی جا سکتی تھی کہ وہ فرحانہ کو آزاد کرنے کے لیے رقم کا مطالبہ کریں گے۔ یہ میرا اندازہ تھا۔ آنے والے لمحات میں در حقیقت کیا پیش آنے والا تھا اس کے بارے میں قبل از وقت حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

میری ہدایت کے جواب میں انکل خالق نے اثبات میں گردن ہلائی اور بڑی فرمانبرداری سے بولے۔ "بیٹا جب ہم نے تمہیں اپنا وکیل مان لیا ہے تو پھر تمہاری ہر بات بھی مانیں گے۔"

"یہ تو آپ کی بڑائی ہے انکل آپ اس قسم کی باتیں کر کے تو الٹا مجھے گناہ گار نہ کریں۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "یہ معاملہ ایسا ہے کہ اگر آپ نے اپنا دماغ چلایا تو کوئی بھی گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ میں اپنے دشمن کے انداز اور عادت کو اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"بے فکر ہو جاؤ بیٹا!" سعیدہ آنٹی نے کہا۔ "ہم تمہیں کسی شکایت کا موقع نہیں دیں گے۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ فرحانہ کو کوئی نقصان نہ ہو۔"

"دنیا کی کوئی طاقت فرحانہ کا ایک بال بھی بیکا نہیں کر سکتی۔ نقصان پہنچانا تو بہت بڑی بات ہے۔" میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔

ان لمحات میں مجھے خود بھی اپنی آواز عجیب سی لگی تھی۔ میرا یہ دعویٰ میرے سچے جذبات کا ترجمان تھا۔ فرحانہ میری جان تھی۔ میری زندگی تھی بلکہ میری زندگی کا حاصل تھی۔ میں اسے ذرہ بھر نقصان پہنچتے ہوئے بھی بھلا کیسے دیکھ سکتا تھا۔ ان کے سامنے میں نے بڑے صبر و سکون کا مظاہرہ کیا تھا لیکن مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ اس وکیل شیر دلی نے میرے ساتھ جو دشمنی داری شروع کی تھی وہ بہت دور تک جانے والی تھی۔ آگ اور خون کا یہ خطرناک کھیل آسانی سے رکنے والا نہیں تھا۔

میں ابھی انہی خیالات کے ساتھ الجھا ہوا تھا کہ میرے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ انکل آنٹی اور شازیہ نے ایک بے چینی سے چونک کر مجھے دیکھا۔

میں نے فون اٹینڈ کیا۔ وہ وحید صاحب کی کال تھی۔ میرے "ہیلو" کے جواب میں انہوں نے پوچھا۔

"مسٹر اسد! کیا ہوا، اغوا کنندگان کی طرف سے کوئی رابطہ کیا گیا؟"

"جی وحید صاحب! رابطہ ہو چکا ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "لیکن اغوا کنندگان سے میری تفصیلی بات بھی ہوئی ہے۔"

"کیا وہ ملازم ابھی میں سے کوئی ہے جنہیں خالد صاحب نے فارغ کیا تھا؟" وحید صاحب نے پوچھا۔ "میرا ذہن بار بار ادھر ہی جا رہا ہے۔"

"نہیں وحید صاحب" میں نے کہا۔ "اغوا کی اس کارروائی میں ان تینوں میں سے کسی کا ہاتھ نہیں۔ یہ میرے کسی اور دشمن کا کارنامہ ہے۔"

"کیا آپ اپنے اس دشمن کو جانتے ہیں؟"

"بہت اچھی طرح۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ بدذات ایک ایسا شخص ہے جسے نت نئی دشمنیاں پالنے اور پھر انہیں نبھانے کا شوق ہے۔ وہ پہلے ایک ذرا سی بات پر میری اس سے دشمنی ہوئی تھی۔ اس نے اس واقعے کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا اور چند روز قبل مجھے اپنے غنڈوں سے پٹوانے کی کوشش بھی کی۔ اس وقت میرا دوست خوش دلی بھی میرے ساتھ ہی تھا۔ ہم دونوں نے مل کر اس کے بھیجے ہوئے بدمعاشوں کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی تھی۔ اس کے چند روز بعد یہ فرحانہ کا اغوا والا واقعہ پیش آیا ہے۔"

"اس نامعقول کے نام سے واقف ہیں آپ؟" وحید صاحب نے پوچھا۔

"جی ہاں واقف ہوا ہوں۔" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ "اس نے اپنا نام شیر دلی بتایا ہے اور خود کو وہ [illegible] کا بھی ڈیلر کہہ رہا تھا۔" میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"وحید صاحب! میں نے اس بندے کو صرف دو بار دیکھا ہے اور دونوں مرتبہ آئی آئی چندریگر روڈ پر "میرانی ٹریڈ سینٹر" والی بلڈنگ کے بہت قریب اس کے پاس سفید رنگ کی ہنڈا سٹی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اسی علاقے میں کوئی بزنس کرتا ہے۔"

"اس کا حلیہ بتا سکتے ہیں؟" وحید صاحب نے سوال کیا۔

میں نے جواب میں انہیں شیر دلی کا قد کاٹھ، وضع قطع اور حلیے سے تفصیلاً آگاہ کر دیا۔ میری بات مکمل ہونے پر انہوں نے کہا۔

"میں اپنے طور پر اس بندے کو چیک کرانے کی کوشش کروں گا۔ اگر اس کا آفس عاطف صاحب کی فرم کے آس پاس ہی ہے تو وہ زیادہ عرصے تک میری نظر سے اوجھل نہیں رہ سکے گا۔" لمحاتی توقف کر کے انہوں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"مسٹر اسد! ان حالات میں، میں آپ کی جو بھی مدد کر سکتا ہوں بلا تکلف بتائیں۔"

"بس آپ میرے حق میں دعا کرتے رہیں۔" میں نے کہا۔ "باقی میں سب سنبھال لوں گا۔ اس کمینے کو ہینڈل کرنا میرے لیے مشکل بات نہیں ہوگی۔"

"او کے۔" انہوں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ "جیسے ہی معاملہ آگے بڑھے اور کوئی نئی بات سامنے آئے آپ فوراً مجھے اطلاع دیں گے۔"

"جی ضرور۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "وحید صاحب! جب تک فرحانہ بخیر و عافیت گھر واپس نہیں آجاتی۔ میں بے فکری نہیں ہو سکوں گا۔"

"فکری کوئی بات نہیں۔ آپ ذہن سے نکال دیں۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ "میں نے خالد صاحب کو ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا ہے۔"

"ٹھیک ہے وحید صاحب۔" میں نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔

وہ خلوص دل سے بولے۔ "یو آر آلویز ویلکم مسٹر اسد۔"

اس کے بعد ہمارے درمیان قائم سیلولر رابطہ ختم ہو گیا۔

ادھر میرا فون کال سے فری ہوا اور ادھر اس کی گھنٹی بج اٹھی۔ نمبر اجنبی تھا۔ میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے "ہیلو" کہا۔

"تمہارا فون اتنا بزی کیوں جا رہا تھا۔" شیر ولی کی بھاری بھرکم آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ "میں کافی دیر سے ٹرائی کر رہا ہوں۔ کیا پولیس کو اس معاملے میں گھسیٹنے کی کوشش کر رہے تھے؟"

"یہ تمہارا وہم ہو سکتا ہے ورنہ ایسی کوئی بات نہیں۔" میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔ "فرحانہ کے گھر کا نمبر نوٹ کرو۔ میرا مطلب ہے فون نمبر۔"

اس نے نمبر نوٹ کرنے کے بعد کہا۔ "اس لڑکی نے مجھے بتایا ہے کہ تم اس کے پڑوسی ہو اور یہ تمہاری اسٹوڈنٹ بھی ہے۔"

"فرحانہ نے تمہیں جو بھی بتایا ہے وہ غلط نہیں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "اب اس بات کا کیا مقصد ہے۔"

میں نے شیر ولی کے ساتھ شروع ہی سے ایسا رویہ اپنا رکھا تھا۔ جیسے مجھے فرحانہ کی زیادہ پروا نہیں ہے۔ یہ بہت ضروری تھا۔ اگر اسے پتا چل جاتا کہ فرحانہ میری کمزوری ہے تو اس کا پلڑا بھاری ہو جاتا۔ ابھی تک تو میں نے اسے جوتے کی نوک پر رکھا ہوا تھا۔ میری کمزوری کا احساس ہو جانے کے بعد وہ مجھے ذلیل کرنے کی ہر کوشش کرتا۔ اس موقع پر فرحانہ کو عقل مندی کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔ اسے اپنی کسی بھی بات سے شیر ولی کو یہ احساس نہیں ہونے دینا چاہیے تھا کہ ہمارے بیچ کوئی گہرا رشتہ قائم ہو چکا ہے۔

"کیا تم اس وقت فرحانہ کے گھر ہی میں بیٹھے ہوئے ہو۔" شیر ولی نے پوچھتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

"نہیں۔" میں نے قطعیت سے جواب دیا۔ "میں اپنے گھر میں ہوں۔ فرحانہ کے گھر کا فون نمبر تمہارے پاس پہنچ چکا ہے۔ اب تم میرے کان کھانے کے بجائے ان لوگوں سے رابطہ کرو۔"

"تم اتنی آسانی سے خود کو اس معاملے سے الگ نہیں کر سکتے اسد!" وہ سنسناتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں ذرا فرحانہ کے گھر والوں سے بات کر لوں پھر بتاتا ہوں تمہیں مجھے کیا کرنا ہے۔"

"جب کی جب دیکھی جائے گی۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "میرا فون آن ہے۔ جب جی چاہے کال کر لینا۔ چوہے کی طرح بل میں چھپ کر بیٹھنا مجھے نہیں آتا۔" اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

میں نے شازیہ سے کہا کہ وہ گھر سے میرے سیل فون کا چارجر لیتی آئے۔ مسلسل استعمال سے اس کی بیٹری لو ہو رہی تھی۔ ابھی پتا نہیں مجھے اور کتنی لمبی کالیں ریسیو کرنا تھیں۔

شازیہ "جی بھائی جان!" کہتے ہوئے اٹھی اور کمرے سے نکل گئی۔ اگلے ہی لمحے خالق صاحب کے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے انہیں فون اٹینڈ

کرنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اسپیکر فون آن کر دیجیے گا۔"

انہوں نے اثبات میں گردن ہلائی اور ریسیور کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ میں کھسک کر ان کے قریب جا بیٹھا اور احتیاطاً میں نے اپنا سیل فون [illegible] کر دیا تاکہ اگر وہ [illegible] چیک کرنے کے لیے مجھے کال کرے تو خالق صاحب کے فون سے اسے میرے سیل فون کی گھنٹی سنائی نہ دے۔

"ہیلو!" عبدالخالق بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔

"کیا تم فرحانہ کے باپ عبدالخالق ہو۔" اسپیکر فون سے شیر ولی کی تصدیق طلب آواز ابھری۔

عبدالخالق نے میری ہدایات کے مطابق عمل شروع کر دیا۔ سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہاں میں فرحانہ کا باپ ہوں۔ مگر تم کون ہو اور میری بچی کو کیسے جانتے ہو؟"

"فرحانہ اس وقت میرے قبضے میں ہے۔"

"تو تم وہی ہو جس نے میری بچی کو اغوا کیا ہے؟"

"بالکل پہچانا۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"ہم سے تمہاری کیا دشمنی ہے بھائی؟" خالق نے پریشانی بھرے انداز میں کہا۔ "ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ ہم تو تمہیں جانتے تک نہیں۔ ہم کیا ہے تمہارا؟"

"تم میرا نام اور دشمنی کا سبب جاننے کے چکر میں پڑ کر وقت برباد کرو گے۔" وہ سفاکی سے بولا۔ "اس سے تمہاری بچی کے لیے مشکلات کھڑی ہو سکتی ہیں۔ تمہیں صرف اس بات پر توجہ دینا چاہیے کہ میں کیا چاہتا ہوں۔"

"کک... کیا چاہتے ہو تم؟" خالق صاحب نے پوچھا۔

شیر ولی نے بھاری بھرکم آواز میں کہا۔ "صرف پانچ لاکھ روپے۔"

میں ساتھ ساتھ رف پیڈ پر خالق صاحب کے لیے ہدایات بھی تحریر کرتا جا رہا تھا۔ جو شیر ولی کے سوالات کے جواب میں خالق صاحب کو بولنا تھیں۔

"صرف پانچ لاکھ....؟" خالق صاحب نے اس کے الفاظ دہرائے۔ "یہ بات تو تم ایسے کہہ رہے ہو جیسے پانچ ہزار ہوں۔ بھائی! میری اتنی حیثیت نہیں ہے۔ میں کریانے کی ایک معمولی سی دکان چلاتا ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے تمہیں اپنی بچی سے محبت نہیں۔" وہ بے دردی سے بولا۔ "ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔"

"ایک منٹ....!" خالق صاحب نے میری ہدایت کے مطابق تڑپ کر کہا۔ "تم میری بات کا یقین کرو۔ میں اتنی بڑی رقم کا انتظام نہیں کر سکتا۔"

"میں تمہیں انتظام کرنے کے لیے وقت دیتا ہوں۔" شیر ولی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ "کل شام پانچ بجے تک کا وقت ہے تمہارے پاس۔"

"رقم بہت زیادہ ہے اور مہلت انتہائی کم۔" خالق صاحب نے بے بسی سے کہا۔ "بھائی! مجھ پر رحم کرو۔ میں تمہارا مطالبہ پورا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔"

"میں تمہیں رات بھر سوچنے کا موقع دیتا ہوں۔" وہ اٹل لہجے میں بولا۔ "صبح تک تم کسی فیصلے تک پہنچ ہی جاؤ گے۔ میں ٹھیک آٹھ بجے صبح تمہیں دوبارہ فون کروں گا۔ دیکھنا یہ ہے کہ تمہارے لیے بیٹی زیادہ اہم ہے یا پانچ لاکھ روپے اور ایک بات ذہن میں رکھتے ہوئے کوئی بھی فیصلہ کرنا۔" لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس لی پھر ڈرامائی انداز میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"پانچ لاکھ میں سے ایک پیسہ بھی کم نہیں ہوگا۔ میں نے تمہاری حیثیت کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہی یہ فیصلہ کیا ہے ورنہ پانچ لاکھ تو آج کل اوقات ہی کیا ہے۔ ہوکے اندر حافظ۔"

"ایک منٹ ایک منٹ......" خالق صاحب نے مضطرب انداز میں کہا۔

"فرحانہ کی ماں کا برا حال ہے۔ ذرا اسے فرحانہ کی آواز سنوا دو۔ اس طرح انہیں یقین آ جائے گا کہ ہماری بچی تمہارے قبضے میں ہے۔"

"ضرور ضرور یہ تو پارٹی کا حق بنتا ہے۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

"آپ لوگ اپنی بیٹی کی صرف آواز ہی سن سکیں گے۔ ابھی کچھ لمحے اس سے ایک دو باتیں بھی کر لو۔"

شیروانی کی بات ختم ہوئی تو اسپیکر فون پر فرحانہ کی آواز ابھری۔ "ابو! یہ بہت سفاک لوگ ہیں۔ آپ ان کی بات مان لیں اور مجھے یہاں سے لے جائیں۔"

اسی دوران میں آنٹی امینہ کپکپاتی ہوئی فون کے قریب آ گئی تھیں۔ میں نے بڑے واضح انداز میں شانہ ہلا کر اشارہ کر دیا تھا کہ اس کی آواز نہیں نکلنا چاہیے۔ اس نے اثبات میں گردن ہلا کر میری ہدایت پر عمل کرنے کا یقین دلایا تھا۔

"بیٹی میری جان! تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" خالق صاحب نے شفقت بھری میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں تمہیں ان ظالموں کے چنگل سے صحیح سلامت چھڑا لوں گا۔"

امینہ آنٹی نے ممتا سے لبریز آواز میں پوچھا۔ "بیٹی! تم خیریت سے تو ہونا۔ ان لوگوں نے تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں دی؟"

"نہیں امی......" فرحانہ نے مختصراً کہا۔

اس کے بعد شیروانی کی بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ "ابھی تک تو تم لوگوں کی بیٹی ٹھیک ٹھاک اور صحیح سلامت ہے لیکن اگر تم نے میرے مطالبے پر توجہ نہ دی تو میں اس کی زندگی کی ضمانت نہیں دے سکوں گا۔" اس دھمکی کے ساتھ ہی شیروانی نے رابطہ منقطع کر دیا۔

آنٹی امینہ کی سسکی نکل گئی۔ وہ روہانسی آواز میں بولیں۔ "وہ حرامی میری بچی کو مار ڈالے گا۔" پھر وہ روتے ہوئے خالق صاحب کی طرف پلٹتے ہوئے بولیں۔ "آپ کہیں سے بھی پانچ لاکھ کا بندوبست کریں۔ میں فرحانہ کو ذرا سی تکلیف پہنچتے نہیں دیکھ سکتی۔"

"آنٹی کچھ نہیں ہوگا۔" میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ "کل شام کے پانچ بجنے میں ابھی بہت وقت پڑا ہے۔ جب تک ہم کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی لیں گے۔ آپ نے اگر حوصلہ ہار دیا تو میرے لیے بڑی مشکل ہو جائے گی۔"

"میں اپنی بیٹی کی زندگی کی خاطر دکان بیچ ڈالوں گا۔" خالق صاحب جذباتی لہجے میں بولے۔ "جان ہے تو جہان ہے۔"

"اس کی نوبت نہیں آئے گی انکل!" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "مجھے تو امید ہے کہ میں اس معاملے کو بہ خوبی ہینڈل کر لوں گا اور بہ فرض محال......" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ایک گہری سانس خارج کی پھر بڑے اعتماد سے اپنی بات مکمل کر دی۔

"بہ فرض محال اگر ہمیں ان کمینوں کو پانچ لاکھ دینا بھی پڑے تو اس رقم کا میں خود انتظام کروں گا۔ آپ کی دکان ان شاء اللہ فروخت نہیں ہوگی۔"

"بیٹا!" دونوں نے بہ یک وقت الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ "تم اتنی بڑی رقم کا بندوبست کہاں سے کرو گے؟"

"میں جب کہہ رہا ہوں تو ایسا کر کے بھی دکھا دوں گا۔" میں نے بدستور اٹل لہجے میں کہا۔ "فرحانہ کو میری دشمنی کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اس کو ان لوگوں سے بحفاظت واپس لانا میری ذمے داری ہے۔ اب فرحانہ کی رہائی کے لیے پانچ لاکھ خرچ کروں یا اس کے بعد میں یہ رقم ان اغوا کنندگان کی ناک کے راستے نکال بھی لوں گا۔ آپ خاموشی سے تماشا دیکھتے جائیں کہ آگے ہوتا ہے کیا۔"

میری بات ختم ہوئی تو سیل فون نے ابھرتے ہوئے مخصوص ترنم کے ساتھ کسی کال کی آمد کا اعلان کیا۔ اب امکان اس بات کا تھا کہ وہ شیروانی کی کال ہوگی۔ میں نے سب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کال اٹینڈ کر لی۔ میری توقع کے عین مطابق وہ مردود شیروانی تھا۔

"ہیلو......" اس کی مخصوص آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

میں نے بے زار کن لہجے میں کہا۔ "ہاں بولو۔"

"میں نے فرحانہ کے باپ سے بات کر لی ہے۔" اس نے بتایا۔

"مبارک ہو۔" میں نے جلے بھنے لہجے میں کہا۔

وہ بولا۔ "میں نے خالق سے پانچ لاکھ کا مطالبہ کیا ہے۔"

"کیا اس رقم سے تمہارا جہنمی پیٹ بھر جائے گا؟" میں نے استفسار کی باتوں پر توجہ دیتے ہوئے کہا۔

"کیا تم ہر وقت مرچیں چباتے رہتے ہو؟" وہ تیکھے لہجے میں بولا۔ "کسی بات کا سیدھا جواب تمہارے پاس نہیں۔"

"آج تک تم نے مجھ سے کوئی سیدھی بات کی ہوتی تو پھر تمہارا یہ شکوہ بجا ہوتا۔" میں نے بے زاری کے عالم میں کہا۔ "ہمارا پہلا تعارف ہی خاصا خون خوار تھا۔ تم نے مجھے گالی دی تھی اور میں نے تمہاری ناک کو خون اگلنے پر مجبور کر دیا تھا۔" لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اس کے زخموں پر نمک پاشی کرتے ہوئے کہا۔

"کچھ یاد آیا کہ نہیں......؟"

"مجھے تمہاری ایک ایک بدتمیزی اور سرکشی اچھی طرح یاد ہے۔" وہ زہر خند لہجے میں بولا۔ "اور میں تم سے گن گن کر حساب لوں گا۔"

"لو بھلا! تم نے تو ابھی مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔" میں نے مسخری خیز انداز میں کہا۔ "لگتا ہے تمہارا قرض اتارنے کا جلد ہی موقع فراہم کرو گے۔"

وہ اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے بولا۔ "میں نے فرحانہ کے باپ سے جتنی رقم مانگی ہے کیا وہ کل شام پانچ بجے سے پہلے اس کا انتظام کر پائے گا؟"

"مجھے اس بات کا کوئی اندازہ نہیں۔" میں نے لاتعلقی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "اگر انکل خالق کو اپنی بیٹی کی زندگی عزیز ہوگی تو وہ کہیں سے بھی پانچ لاکھ اکٹھے کر کے تمہارے منہ میں ضرور ٹھونسے گا۔"

"وہ لوگ تمہارے پڑوسی ہیں۔" وہ عجیب سے انداز میں بولا۔ "کیا اس مشکل کی گھڑی میں تم ان کی مدد نہیں کرو گے؟"

"میں بھلا کسی کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟" میں نے روکھے لہجے میں کہا۔ "میں تو خود ایک غریب مسکین آدمی ہوں۔"

"میں بتاؤں کہ تم اپنے پڑوسیوں کی کس طرح مدد کر سکتے ہو۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "صبح ٹھیک آٹھ بجے میں دوبارہ خالق کو فون کروں گا۔ اگر اس موقع پر تم بھی وہاں موجود ہو تو اچھی بات ہے۔"

"میں کوئی تمہارا ملازم تو نہیں ہوں جو تم ڈکٹیشن دے رہے ہو۔" میں نے غصہ دلانے والے انداز میں کہا۔

"ای شیر ولی جیسے بدخصلت اور شیر ولی صفت شخص سے کوئی بھی گھٹیا سے گھٹیا حرکت سرزد ہو سکتی ہے۔" میں نے کڑواہٹ بھرے لہجے میں کہا۔

"لیکن میں بھی اسے من مانی کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ اس کا زہر نکالنے کے میرے پاس ایک سو ایک طریقے ہیں۔"

"تمہارے عزائم سے مجھے ڈر لگ رہا ہے بیٹا!" ای نے تشویش بھری نظر سے مجھے دیکھا۔ "تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

قبل اس کے کہ میں ای کے پرفکر سوال کا جواب دیتا، میرے سیل فون کے ڈسپلے پر نمبر نے کسی کال کی آمد کا اعلان کیا۔ میں نے فوراً کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

"ہیلو کون؟"

نمبر اجنبی تھا چنانچہ مجھے لفظ "کون" کا استعمال کرنا پڑا تھا۔ دوسری جانب سے ایک جانی پہچانی ونگ آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"مسٹر اسد، میں ہوں۔۔۔ عاطف رشید۔"

"اوہ۔۔۔!" میں ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔ "سر! آپ اور اس وقت؟"

"ہاں۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ "مجھے بھائی صاحب کی زبانی تمہارے تازہ ترین حالات کی خبر ہوئی ہے۔ تازہ پوزیشن کیا ہے؟"

"سر میں ابھی آپ کو تھوڑی دیر میں سے دیکھ کر بتاتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میں ای کے پاس سے اٹھا اور ڈرائنگ روم کی جانب قدم بڑھا دیے۔

"ہم میں سے دیکھ کر۔۔۔؟" عاطف صاحب کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔

"سوری سر!" میں نے جلدی سے کہا۔ "میں اس وقت ای کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور وہاں کھل کر بات نہیں ہو سکتی تھی اس لیے انہیں ستانے کے لیے میں نے وہ جملہ بول دیا تھا۔ اب میں ڈرائنگ روم میں آ گیا ہوں۔"

"ویری گڈ۔" وہ سراہنے والے انداز میں بولے۔ "آپ بہت موقع شناس اور معاملہ فہم ہیں مسٹر اسد!"

"تھینک یو سر!" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ پھر انہیں تفصیل سے آگاہ کرنے لگا۔ "اغوا کنندہ صبح آٹھ بجے معوی کے باپ سے رابطہ کرے گا اور بتائے گا کہ شام پانچ بجے کہاں پر تم پہنچا کر فرحانہ کو وصول کرنا ہے۔ اس نے پانچ لاکھ کا مطالبہ کیا ہے۔"

"آپ نے اس سلسلے میں کیا فیصلہ کیا ہے۔" عاطف صاحب نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ "یہ واقعہ آپ کی دشمنی کے سبب پیش آیا ہے اور مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ معوی کے والدین نے سب کچھ آپ پر چھوڑ دیا ہے۔" وہ لمحے بھر کو متوقف ہوئے پھر گہری سانس خارج کرتے ہوئے ان الفاظ میں اپنی بات مکمل کر دی۔

"کیا اس معاملے میں پولیس کو ملوث کرنے کی ضرورت ہے؟"

"ہرگز نہیں سر!" میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "فرحانہ کا باپ اس کے حق میں نہیں۔ وہ شخص کے ایک تیئے تجربے کی بنا پر وہ کسی بھی قیمت پر پولیس پر بھروسا کرنے کو تیار نہیں۔ اگر میں کہوں گا تو وہ کسی نہ کسی طرح پانچ لاکھ کا بندوبست بھی کر دے گا۔"

"اور آپ کے کیا ارادے ہیں؟"

"سر! میں اس کمینے بدذات کے چہرے پر سے چہرے کا نقاب نوچنا چاہتا ہوں کہ آئینہ دیکھ کر وہ خود کو پہچان پائے۔" میں نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ "اس شخص نے مجھے بہت زیادہ ذہنی اور روحانی اذیت پہنچائی ہے۔"

"ریلیکس مسٹر اسد!" عاطف صاحب کی گمبھیر

"تم جاؤ جہنم میں اپنی کھوپڑی سمیت۔" وہ بھنا کر بولا۔

میں نے یہ کہتے ہوئے لائن کاٹ دی۔ "سیم ٹو یو۔"

آنٹی اسمعیٰ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بیٹا! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"کون سی بات آنٹی؟" میں نے پوچھا۔

"بیٹا! تمہاری تمام گفتگو ہم لوگ یہاں تمہارے ساتھ ہیں اور تم فرحانہ کی واپسی کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے کے لیے بھی تیار ہو لیکن۔۔۔" انہوں نے توقف کر کے متذبذب انداز میں مجھے دیکھا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولیں۔

"لیکن جب تم اس شیطان سے بات کرتے ہو تو تمہارے انداز میں ہمارے لیے کھلی لاتعلقی پائی جاتی ہے۔ ایسا کیوں بیٹا۔۔۔؟"

"آپ نے اغوا کنندگان کو شیطان کہہ کر سارا مسئلہ ہی حل کر دیا ہے آنٹی۔" میں نے ایک پرسکون سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے لہٰذا ہمیں دشمن کی نظر سے اپنی کمزوریاں کو چھپا کر رکھنا چاہیے۔ اگر اس کمینے کو یہ احساس بھی ہو گیا کہ میں فرحانہ کی واپسی کے مشن میں سب سے زیادہ سرگرم ہوں تو پھر وہ آپ کے لیے ایسی ایسی مشکلات کھڑی کرے گا جس کا آپ لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ میں آپ سے لاتعلقی ظاہر کرتے ہوئے اپنا کام جاری رکھوں۔"

"اسد بیٹا بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔" عبدالخالق نے توصیفی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہماری بچی کا محافظ ابھی ہے اور مجھے اپنے پروردگار سے پوری امید ہے کہ ہماری بچی خیر و عافیت سے گھر لوٹ آئے گی۔"

"ان شاء اللہ!" میں نے تہہ دل سے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "انکل! صبح آٹھ بجے تک رابطہ ہی

بھگتن ہی بھگتن لکھ رہا ہے۔ آپ اطمینان سے نیند پوری کریں تاکہ کل حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے تازہ دم رہیں۔"

شازیہ بھی میری تقلید میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ آنٹی اسمعیٰ نے امید بھری نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"شازیہ بیٹی آج کی رات تم ہمارے گھر میں رک جاؤ۔ فرحانہ کے بغیر یہ گھر کتنا سونا سونا ہو رہا ہے۔"

شازیہ نے سوالیہ نظر سے میری جانب دیکھا۔ میں نے اسے فرحانہ کے گھر رات گزارنے کی اجازت دے دی اور خود اپنے گھر چلا آیا۔

ای میرے انتظار میں ابھی تک جاگ رہی تھیں۔ مجھ پر نگاہ پڑی تو قدرے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ پھر میرے عقب میں دور تک نگاہ دوڑاتے ہوئے بولیں۔

"شازیہ کہاں ہے؟"

"اسمعیٰ آنٹی نے اسے روک لیا ہے۔" میں نے بتایا۔ "وہ فرحانہ کو بہت مس کر رہی ہیں۔"

"یہ تم نے بہت اچھا کیا جو شازیہ کو وہاں چھوڑ دیا۔" ای نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔ "خالق آج ان کے گھر پر جو قیامت ٹوٹی ہے اسے الفاظ میں بیان کرنا اعصاب پر سہنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔"

میں نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔ ای مجھ سے اس ٹیلی فونک گفتگو کی تفصیل جاننے کو بے قرار تھیں جو تھوڑی دیر پہلے انکل خالق اور شیر ولی کے بیچ ہوئی تھی۔ میں نے انہیں من وعن احوال سنا دیا پھر سے خاموش ہوتے ہوئے ای نے کہا۔

"یہ شیر ولی بہت ہی کائیاں اور فتنہ پرور انسان ہے۔ جب اس نے دیکھا کہ تمہاری دشمنی کے حوالے سے اس کا تیر نشانے پر لگ گیا ہے تو اس نے پیچھے کر کے دوسری چال چل دی ہے۔"

آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ "یہ موقع جوش میں آنے کا نہیں، ہوش میں رہنے کا ہے۔" میں نے یہ پوچھا تھا کہ رقم کی ادائی کے سلسلے میں آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"میں اس شیطان کو پھوٹی کوڑی بھی نہیں دوں گا اور فرحانہ کو خیر و عافیت اس کے چنگل سے بھی نکال لاؤں گا۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"میں آپ کے جذبے اور ہمت کی قدر کرتا ہوں۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولے۔ "لیکن اس کے لیے بڑی مضبوط حکمت عملی کی ضرورت ہوگی۔"

"آپ کی صبح آٹھ بجے والی کال کے بعد ہی کوئی حتمی بات تو سامنے آسکتی ہے۔" میں نے کہا۔

"جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ وہ کس طرح رقم وصول کرنا چاہتے ہیں اور فرحانہ کی واپسی کیسے ہوگی۔ میں کوئی منصوبہ نہیں بنا سکتا۔"

"او کے صبح اغوا کنندہ سے جو بھی بات ہو تو آپ مجھے اس سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔" عاطف صاحب نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں آپ کے کسی بھی کام آسکا تو مجھے خوشی ہوگی۔"

"ٹھیک ہے سر!" میں نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔

"آپ ہمارے محسن ہیں اسد اللہ۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولے۔ "لہٰذا کسی بھی موقع پر تکلف سے کام نہیں لیجیے گا۔"

"سر! آپ سے ایک فوری فیور چاہیے۔" میں نے کہا۔

"ہاں بولیں۔" ان کی مخصوص آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"میں کل کا پورا دن خوش دلی کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اس کی موجودگی میں مجھے بڑا حوصلہ ملتا ہے۔"

"ٹھیک ہے آپ اس سے کانٹیکٹ کر کے پروگرام سیٹ کر لیں۔" وہ فراخ دلی سے بولے۔ الوداعی کلمات کے بعد ہمارے بیچ سلسلہ رابطہ ختم ہو گیا۔

میں واپس امی کے کمرے میں آگیا۔ امی نے تشویش بھری نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ "کس کا فون تھا؟"

"عاطف صاحب کا۔" میں نے جواب دیا۔ "برہانی ٹریڈرز کے مالک۔ میں نے آپ کو ان کے بارے میں سب کچھ بتا رکھا ہے۔"

"کیا کہہ رہے تھے وہ؟" امی نے بدستور تشویش بھرے انداز میں استفسار کیا۔

"میرے پاس ایک فائل میں ان کے کچھ کاغذات رکھے ہوئے ہیں۔" میں نے موقع محل کی مناسبت سے معاملات کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "انہی کے بارے میں کچھ پوچھ رہے تھے بہر حال....." میں نے ذرا رک کر ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"وہ جو کچھ جاننا چاہ رہے تھے میں نے انہیں بتا دیا ہے۔"

"بیٹا!" امی خاصی فکر مندی سے بولیں۔ "فرحانہ والا معاملہ خاصا الجھ نہیں گیا؟"

"اگر الجھ گیا ہے تو وقت آنے پر سلجھ بھی جائے گا۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں سب سنبھال لوں گا۔"

"ایک بات پوچھوں، سچ سچ بتاؤ گے؟" امی نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے گول مول جواب نہیں چاہیے۔"

"ٹھیک ہے امی۔" میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"آپ پوچھیں میں سیدھا اور کھرا جواب دوں گا۔"

"کیا فرحانہ کے ساتھ تمہارا کوئی خاص تعلق ہے۔" امی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

"کیوں.....؟" میں چونک اٹھا۔ "آپ کس وجہ سے پوچھ رہی ہیں؟"

امی کے لہجے میں شامل تشویش نیزی نے میرے ذہن کو الجھا کر رکھ دیا تھا۔ پتا نہیں انہوں نے یہ سوال کس مقصد سے کیا تھا۔ انسان کے دل میں جو ہوتا ہے اس کا چہرہ چغلی کھائے بغیر نہیں رہتا۔ مجھے نہیں معلوم ان لمحات میں میرے چہرے پر کس قسم کے تاثرات تھے البتہ امی کی کھوجتی ہوئی نگاہ مجھے بہت دور تک سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی کہ ان کے دل میں ضرور کچھ کھٹکا ہے۔

"سوال پر سوال نہیں کرتے۔" امی نے تنبیہی انداز میں کہا۔ "جو میں نے پوچھا ہے اس کا جواب دو۔ فرحانہ کی ذات کے حوالے سے تمہاری سرگرمی کچھ نارمل نہیں ہے۔"

"میں کب کہہ رہا ہوں یہ غلط ہے۔" میں نے دو ٹوک لہجے میں رکتے ہوئے جواب دیا۔ "ندیم شیر دلی میرا دشمن ہے میں نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو شدید نقصان پہنچایا ہے اگرچہ اس نقصان کا تعلق بعض معاملات سے نہیں تاہم ندیم شیر دلی نے میرے ہاتھوں خاصی ہزیمت اٹھائی ہے۔ وہ ایک مجرم ذہنیت کا شخص ہے۔ اپنی ذات کا بدلہ چکانے کے لیے اس نے میرے گھر کا سراغ لگایا اور پھر مجھے ذہنی اذیت میں مبتلا کرنے کے لیے میری بہن شازیہ کو اغوا کرنے کی کوشش کی۔ یہ الگ بات کہ شازیہ اپنی خوش قسمتی کے باعث اغوا ہونے سے محفوظ رہی اور فرحانہ کی غلطی نے اسے میرے دشمن کے پاس پہنچا دیا۔ یہ ٹھیک ہے فرحانہ اپنی غلطی کے باعث اس مصیبت میں گرفتار ہوئی ہے لیکن.....؟" میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں سمجھتا ہوں کہ فرحانہ کے ساتھ جو ناخوش گوار واقعہ پیش آیا ہے اس کا ذمے دار میں ہوں۔ لہٰذا اس کی بحفاظت بازیابی کے لیے اگر میں سرگرم ہوں تو اس میں اچنبھے کی کیا بات ہے۔"

"اچنبھے کی کوئی بات نہیں۔" میرے خاموش ہونے پر امی نے گمبھیر انداز میں کہا۔

"جو کچھ کر رہے ہو یہ تمہارا فرض بنتا ہے اس نازک موقع پر ہم اپنے پڑوسیوں کی جتنی بھی مدد کریں وہ کم ہے۔ اسی خیال کے تحت میں نے شازیہ کو فرحانہ کے گھر میں رات گزارنے کی اجازت بھی دی ہے۔ بیٹا! پڑوسیوں کے بہت زیادہ حقوق ہوتے ہیں۔ تمہیں سرگرم اور متفکر دیکھ کر مجھے قلبی سکون اور اطمینان حاصل ہو رہا ہے مگر....."

امی نے جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔ "مگر کیا امی؟"

"مگر یہ کہ.....!" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولیں۔ "میں نے جو سوال کیا تھا شاید تم اس کا زاویہ نہیں سمجھ سکے ہو۔"

امی پہیلیوں کے انداز میں اپنے استفسار کی پرتیں کھول رہی تھیں۔ ان کے اس پر اسرار انداز سے میرے دل کی دھڑکنوں کی بے ترتیبی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ پتا نہیں وہ کس کھوج میں تھیں۔ میں نے ان کی سوچ تک رسائی حاصل کرنے کی خاطر کہا۔

"آپ سمجھا سکیں گی تو آپ کا زاویہ میری سمجھ میں آئے گا امی؟"

"میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ کیا فرحانہ کی ذات میں تمہاری دلچسپی موجودہ واقعے کے سبب ہے یا اندر

خانہ کی اور معاملہ بھی ہے۔" امی نے ٹٹولنے والے انداز میں سوال کیا۔ "مجھے شازیہ کی زبانی اڑتی اڑتی بھنک پڑی ہے لیکن میں تمہارے منہ سے سننا چاہتی ہوں۔"

شازیہ کی بچی نے یہ باتیں امی کو کیا بتایا تھا۔ وہ مجھے بھی بڑے تجسس خیز انداز میں فرحانہ کے حوالے سے کچھ اڑتی اڑتی سی لگی۔ شازیہ اور فرحانہ میں گہری دوستی تھی۔ یقیناً فرحانہ نے میرے اور اپنے تعلقات کے بارے میں شازیہ کو بتایا ہوگا۔ یہ معاملہ شازیہ کے ذریعے امی تک پہنچ گیا تھا۔ امی نے ہم دونوں یعنی مجھے اور شازی کو دوستوں کی طرح رکھ کر پالا تھا اور ہم بے دھڑک اور بے جھجک ہر بات ان سے کرلیا کرتے تھے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ کسی بے تکلف اور مخلص دوست کا سا برتاؤ کیا کرتی تھیں لہٰذا ہمارے بیچ جھوٹ، مکر و فریب یا ریاکاری وغیرہ کا گزر نہیں تھا۔ منافقت سے امی کو سخت چڑ تھی۔

"جب شازیہ نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے تو آپ میرے منہ سے کیوں سننا چاہتی ہیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اس نے آپ سے کوئی غلط بیانی تو نہیں کی ہوگی۔"

"میں نے جس انداز میں تم دونوں کی پرورش کی ہے اس کے نتیجے میں کسی غلط فہمی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اسد!" امی نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ "مجھے اپنی تربیت پر پورا بھروسا ہے۔"

"پھر.....پھر الجھن کس بات کی ہے امی؟" میں نے متعجب نظر سے انہیں دیکھا۔

"الجھن کوئی نہیں ہے اور نہ ہی کوئی پریشانی ہے۔" وہ بدستور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولیں۔ "بس میں دو طرفہ تصدیق چاہتی ہوں۔"

اس مرتبہ میں نے امی کے ادھورے جملے پر خاموشی اختیار کیے رکھی۔ چند لمحات کے توقف کے بعد وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولیں۔

"اسد! کسی بھی معاملے کی ادھوری معلومات ہمیشہ خطرناک ثابت ہوتی ہیں۔ انسان آدھے سچ اور آدھے جھوٹ میں الجھ کر کہیں کا نہیں رہتا اور کوئی بہت بڑا نقصان اٹھا لیتا ہے۔ میں تمہاری ذہنی حالت کی نزاکت کو اچھی طرح محسوس کرسکتی ہوں۔ اس ہنگامی صورت حال میں تم خاصے متفکر اور پریشان ہو چنانچہ میں تمہارے ذہن کو کسی نئے امتحان میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ بات دراصل یہ ہے کہ....." امی نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولیں۔

"شازیہ کی زبانی مجھے معلوم ہوا ہے کہ فرحانہ صرف تمہاری اسٹوڈنٹ ہی نہیں بلکہ وہ ایک خاص زاویے سے تمہاری ذات میں بھی دلچسپی رکھتی ہے۔ وہ تمہیں پسند کرتی ہے میں بات گھما پھرا کر نہیں کرنا چاہتی۔ سادہ الفاظ میں یوں سمجھو کہ فرحانہ تمہیں اپنی زندگی کا ساتھی بنانا چاہتی ہے کیا یہ درست ہے؟"

میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "جی امی یہ درست ہے۔"

"اس سلسلے میں تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟" امی نے استفسار کیا۔ "میرے نزدیک تمہاری بات کی زیادہ اہمیت ہے اس لیے پوچھ رہی ہوں۔"

"میں بھی اسے پسند کرتا ہوں۔" میں نے جی کڑا کر کے کہہ دیا۔ "اور اس سے شادی کی خواہش رکھتا ہوں۔"

امی نے ایک سکون آمیز سانس خارج کی اور مطمئن انداز میں بولیں۔ "بس میں بھی یہی جاننا چاہتی تھی۔"

"امی!" میں نے متفکر انداز میں کہا۔ "میری خواہش اور خوشی اپنی جگہ لیکن اگر آپ کو میرا یہ فیصلہ

پسند نہ ہو تو میں آپ کی خواہش کے سامنے سر جھکا دوں گا۔"

"میں اپنی اولاد کا سر کسی قیمت پر جھکنے نہیں دوں گی۔" امی نے بڑے فخر سے کہا۔ "میں نے تم دونوں کو اعتماد کے ساتھ سر اٹھا کر جینا سکھایا ہے۔ میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی کہ تم دونوں میرے جذبات کا احترام کرتے ہو لہٰذا میں تمہارے جذبات کا خون کس طرح کرسکتی ہوں۔ تمہاری پسند مجھے بھی پسند ہے اسد! جتنی جلدی ہوسکے فرحانہ کو اس شیطان کے چنگل سے چھڑا لاؤ۔ میری دعائیں اور نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں۔"

"تھینک یو امی!" فرط جذبات سے میری آواز لرز کر رہ گئی۔

اسی لمحے میرے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے سیل کی اسکرین پر نگاہ ڈالی تو وہاں خوش دلی کا نام نظر آیا۔ میں نے امی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرا دوست خوش دلی ہے۔ آپ آرام کریں میں ڈرائنگ روم میں جا کر اسے حالات کی تبدیلی سے آگاہ کرتا ہوں۔"

امی نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

میں ان کے پاس سے اٹھ آیا اور خوش دلی کی کال ریسیو کرتے ہوئے ڈرائنگ روم کی جانب بڑھ گیا۔

"ہیلو خوش دلی!"

"ہاں اسد!" وہ تشویش بھرے لہجے میں بولا۔ "تھوڑی دیر پہلے عاطف صاحب نے مجھے فون کیا تھا اور انہوں نے مجھے ہدایت کی ہے کہ کل میں تم سے [illegible] ہے۔"

"ہاں اس کے لیے میں نے ہی عاطف صاحب سے درخواست کی تھی۔" میں نے ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تم صبح آٹھ کے بعد کسی بھی وقت میرے گھر آجانا۔"

"خیریت تو ہے نا.....؟" خوش دلی کی آواز سے فکر مندی جھلکی تھی۔

"خیریت نہیں ہے یار!" میں نے شکستہ لہجے میں کہا۔

"تمہاری امی اور شازیہ تو ٹھیک ہے نا؟" اس کی تشویش میں اضافہ ہوگیا۔

"ہاں وہ دونوں خیر و عافیت سے ہیں۔" میں نے بتایا۔ "مگر فرحانہ کے ساتھ تھوڑی گڑبڑ ہوگئی ہے۔"

"کیسی گڑبڑ؟" وہ تیز آواز میں مستفسر ہوا۔

"فرحانہ کو اغوا کرلیا گیا ہے۔" میں نے بکھرے ہوئے لہجے میں بتایا۔

"کک.....کیا کہہ رہے.....ہو یار.....؟"

"میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" میں نے حتی الامکان خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "مجھے کل تمہاری اشد ضرورت ہے۔"

"کل کیوں میں ابھی آجاتا ہوں۔" وہ جذباتی انداز میں بولا۔ "لیکن یہ تو بتاؤ کہ یہ سب ہوا کیسے؟"

میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں خوش دلی کو صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

"فرحانہ کو اغوا کرنے والا وہ منحوس شخص ہے پہلے میں نے جس کی ناک سے خون کا فوارہ چھڑایا تھا اور اس کے بعد ہم دونوں نے مل کر ریلے سائن پر اس کے بیٹھے ہوئے غنڈوں کی ٹھکائی کی تھی۔ وہ درحقیقت شازیہ کو اغوا کرنا چاہتا تھا۔ مگر فرحانہ کی شوخی نے اسے اس مصیبت میں ڈال دیا اور سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ وہ میرے اور فرحانہ کے تعلق سے آگاہ ہو چکا ہے۔"

"ہاں یہ تو واقعی تشویش ناک بات ہے۔" وہ تائیدی انداز میں بولا۔

"وہ مردود شازیہ کو اغوا کر کے تمہیں ذہنی اذیت میں مبتلا کرنا چاہتا تھا۔ فرحانہ کی شکل میں تمہاری ایک اہم کمزوری اس کے ہاتھے چڑھ گئی۔ وہ اس پوزیشن سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گا لیکن وہ۔" لمحاتی توقف کر کے خوش ولی نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

"کون سی بات؟" میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"جب اسے پتا چل چکا ہے کہ فرحانہ کے ساتھ تمہارا بھی ناتا ہے تو پھر اسے صرف اور صرف تم پر فوکس کرنا چاہیے تھا۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اس صورت میں فرحانہ کے باپ سے پانچ لاکھ تاوان کا مطالبہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

"اس نکتے نے ابتدا میں میرے ذہن کو بھی الجھایا تھا۔" میں نے کہا۔ "لیکن پھر یہ بات کھل گئی کہ اس خبیث کو بعد میں پتا چلا تھا کہ میرے اور فرحانہ کے بیچ کوئی سنجیدہ معاملہ ہے۔ اس سے پہلے وہ پانچ لاکھ تاوان کا مطالبہ کر چکا تھا۔"

"گویا وہ ایک تیر سے دو شکار کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔" خوش ولی نے پر سوچ انداز میں کہا۔ "آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام۔"

"مجھے بھی کچھ ایسی ہی صورت نظر آ رہی ہے۔" میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "اس عاقبت نا اندیش شیر ولی کو یہ پتا نہیں کہ اس نے کس بلا کو چھیڑ دیا ہے۔ میں اس چیتے کو وہ عبرت انگیز اور یادگار سبق سکھاؤں گا کہ اس کی آنے والی نسلیں میرا نام لے کر اپنے بچوں کو ڈرایا کریں گی۔ میرا نام اسد اللہ ہے یعنی اللہ کا شیر۔ میں اس شیر ولی کو جڑوں سمیت کچا چبا ڈالوں گا۔"

"تم بہت جذباتی ہو رہے ہو اسد۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "میں ابھی تمہارے پاس آ رہا ہوں۔ اس وقت تمہیں میری اشد ضرورت ہے۔"

"نہیں یار! پریشانی والی کوئی بات نہیں۔" میں نے صدق دل سے کہا۔ "تم صبح آ جانا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

اختتامی کلمات کے بعد ہمارے بیچ سلسلۂ رابطہ ختم ہو گیا۔

اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ میں فرحانہ کے اغوا کے سبب سخت ذہنی اذیت میں مبتلا تھا اور ہر لمحہ اسے شیر ولی کے پنجے سے آزاد کرانے کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن میرے اعصاب اتنے بھی کمزور نہیں تھے کہ رات گزارنے کے لیے مجھے کسی سہارے کی ضرورت پیش آتی۔ میں نے بچپن سے جوانی تک مشکلات اور سخت حالات کا سامنا کیا تھا اور زمانے کی ٹھوکروں نے مجھے اندر باہر سے خاصا مضبوط بنا دیا تھا۔ فرحانہ کا اغوا یقیناً پریشانی ضرور تھی تاہم مجھے یقین تھا کہ میں اس پریشانی کو اپنی تدبیر سے اپنے پاؤں کا جوتا بنا لوں گا۔ جو انسان کسی آزمائش کے لیے اسے پریشانی میں ڈالتا ہے وہی پریشانی سے نکلنے کا عزم اور حوصلہ بھی بخشتا ہے۔ ایک مسلمان ہونے کے ناتے اس بات پر میرا پختہ ایمان تھا اور مجھے اس فلسفے کا بارہا تجربہ بھی ہو چکا تھا۔

☆☆☆

آٹھ بجنے میں ایک منٹ باقی تھا۔ میں اس وقت فرحانہ کے گھر میں موجود تھا۔ میں، فرحانہ کی امی عدیلہ بیگم اور فرحانہ کا باپ عبدالخالق ٹیلی فون سیٹ کے قریب ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ شازیہ کو میں نے امی کے پاس بھیج دیا تھا۔ اغوا کار خبیث الخبیث ندیم

شیر ولی نے آٹھ بجے فون کرنے کو کہا تھا اور ہم اس کی کال کا انتظار کر رہے تھے۔

ٹھیک آٹھ بجے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ وہ کم بخت وقت کا بہت پابند ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے خالق صاحب کو اشارہ کیا کہ وہ فون اٹینڈ کریں۔ تیسری گھنٹی پر انہوں نے ریسیور اٹھایا اور اس کے ساتھ ہی اسپیکر کا مخصوص بٹن دباتے ہوئے فون کا اسپیکر بھی آن کر دیا تا کہ ان کے بیچ ہونے والی گفتگو میں ہم دوسری طرف کی آواز بھی سن سکیں۔ "ہم" سے میری مراد میں اور عدیلہ بیگم ہیں۔ عبدالخالق تو پہلے ہی فون کا ریسیور کان سے لگائے بیٹھے تھے۔

اسپیکر پر شیر ولی کی بھاری آواز ابھری۔ وہ عبدالخالق سے مخاطب تھا۔ "ریسیور اٹھانے میں اتنی دیر کیوں لگا دی؟"

"میں... فون سے تھوڑا دور بیٹھا تھا۔" عبدالخالق نے گھبراہٹ آمیز انداز میں کہا۔

"اس کا مطلب ہے تمہیں اپنی بیٹی کی ذرا بھی پروا نہیں۔" وہ سفاکی سے بولا۔ "تمہیں تو چاہیے تھا کہ ایک گھنٹہ پہلے ہی فون سیٹ سے لپٹ کر بیٹھ جاتے۔"

"آئندہ میں یہ غلطی نہیں کروں گا۔ پہلی گھنٹی پر ہی تمہاری کال ریسیو کروں گا۔" عبدالخالق نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "فرحانہ کیسی ہے؟ اس سے میری بات کراؤ۔"

"فرحانہ زندہ ہے اور میری قید میں ہے۔" وہ سنگ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ "اس سے تمہاری بات بعد میں کراؤں گا پہلے یہ بتاؤ میرا کام ہوا یا نہیں؟"

"تم نے جتنی رقم کا مطالبہ کیا ہے وہ میرے اختیار سے باہر ہے۔" عبدالخالق نے بے بسی سے کہا۔ "لیکن میں پھر بھی تمہاری دی ہوئی مہلت تک ارش

کرنے کی کوشش کروں گا۔ وعدہ کرو کہ تم فرحانہ کو ایک ذرا سی بھی گزند نہیں ---"

"میں رقم کے انتظام کے بارے میں تمہیں پوچھ رہا ہوں احمق انسان۔" وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ "یہ پانچ لاکھ تو میں ہر صورت میں وصول کروں گا۔ اس کے بعد ہی تمہاری بیٹی کی بخیریت واپسی ممکن ہو سکے گی۔"

"پھر ---" عبدالخالق نے شکست زدہ لہجے میں کہا۔ "تم --- کس کام کی --- بات کررہے ہو؟"

"لگتا ہے بیٹی کی جدائی نے تمہاری یادداشت کو بری طرح متاثر کیا ہے۔" وہ فیصلے لہجے میں بولا۔ "میں نے کل تمہیں ہدایت کی تھی کہ جب آج صبح آٹھ بجے میں فون کروں تو تمہارا چوہدری بھی فون کے پاس موجود ہونا چاہیے ---- کچھ یاد آیا کہ نہیں؟"

"ہاں ہاں! مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" عبدالخالق نے جلدی سے کہا۔ "میں نے تمہاری ہدایت پر عمل کیا ہے۔ اس وقت میرے پاس ہی بیٹھا ہے۔"

"تو اس کو دو ----" شیر ولی نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

عبدالخالق نے چپ چاپ ریسیور میری جانب بڑھا دیا۔

"ہیلو ---؟" میں نے ریسیور کان سے لگاتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا۔

"کیسے ہو سورما؟" وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ "محبوبہ کی جدائی نے تمہاری اکڑ میں کوئی کمی کی یا ابھی تک اسی طرح کلف لگے ہوئے ہو ---؟"

شیر ولی کے ریمارکس پر احمد بیگم اور عبدالخالق کے چہروں پر حیرت اور الجھن کے تاثرات نمودار ہوئے۔ اسپیکر آن ہونے کے سبب شیر ولی کی بے ہودہ گوئی نے فرحانہ کے والدین کی سماعت تک رسائی حاصل کرلی تھی۔ کمان سے نکلا ہوا تیر واپس نہیں آسکتا تاہم میں نے ترکش کے باقی تیروں کو فریز کرنے کی غرض سے ہاتھ بڑھا کر ٹیلی فون کا اسپیکر آف کردیا پھر ماؤتھ پیس میں کہا۔

"کیا تم نے اس بکواس کے لیے مجھے یہاں بلایا ہے؟"

"تمہی کو گرمی نہیں لگے۔" اس نے چوٹ کی۔ "میرے ساتھ تو کوئی بھی سخت بات کرنے سے پہلے یہ ذہن میں رکھو کہ تمہاری جان من اس وقت میرے قبضے میں ہے۔ کہیں یہ نہ ہو کہ تمہارے گناہوں کی سزا اس بے چاری کو بھگتنا پڑے۔"

"میں تمہاری ان گیدڑ بھبکیوں میں آنے والا نہیں ہوں شیر ولی!" میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "اس لیے اپنی توانائی اور میرا وقت ضائع کرنے کی حماقت سے باز آجاؤ تو یہ ہم دونوں کے لیے بہتر ہوگا۔"

"کون گیدڑ ہے اور کون چیتا ---" وہ پھنکارتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اس کا فیصلہ آج ہو جائے گا۔ میں تمہیں بھیگی بلی سے بھی زیادہ ذلیل و خوار کردوں گا۔"

"وہ تو تب ہوگا جب آمنا سامنا ہوگا شیر ولی!" میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔ "تم میں اگر تھوڑی سی بھی سمجھ بوجھ ہے تو گیدڑ اور چیتے کا فرق تم پر واضح ہو چکا ہوگا۔"

لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر دو ٹوک الفاظ میں استفسار کرتے ہوئے کہا۔

"اس لیے تم وقت برباد کرنے کے بجائے کام کی بات کرو تو اچھا ہے ---"

"کام کی بات ---؟" وہ الفاظ کو چباتے ہوئے بولا۔ "کام کی بات یہ ہے کہ پانچ لاکھ روپے کی رقم لے کر تم میرے پاس آ جاؤ گے ---- صرف تم ---- منظور ہے کہ نہیں ---؟"

"یہ رقم ایک ہزار والے نوٹوں کی شکل میں ہوگی۔"

اس نے بتایا۔ "یعنی ایک ایک لاکھ والی پانچ گڈیاں جنہیں تم کسی چھوٹے بریف کیس میں رکھ کر مجھ تک پہنچاؤ گے۔"

"اوہ!" میں نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ "میں تمہاری بات پوری توجہ سے سن رہا ہوں بولتے جاؤ۔"

"بیگ سرخ رنگ کا ہوگا ---" اس نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"اوکے ---" میں نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔

"اور ---- اور تم کسی ہوشیاری یا چالاکی کے بارے میں سوچنا بھی نہیں۔" وہ تنبیہ کرنے والے انداز میں بولا۔ "تمہاری کوئی بھی ایسی ویسی یا غیر تسلی بخش سرگرمی فرحانہ کی زندگی کا چراغ گل کر سکتی ہے۔"

"میں تمہیں کسی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔" میں نے اندرونی جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے نہایت تحمل سے کہا۔

"میری اس وارننگ کو خالی خولی دھمکی نہیں سمجھنا۔" وہ سفاکی سے بولا۔ "میں نے اپنے ایک خاص آدمی کو تمہاری نگرانی پر مامور کر دیا ہے۔ وہ مجھے تمہاری سرگرمیوں کی پل پل کی خبر دے گا۔ اگر تم نے پولیس سے رابطہ کرنے یا اپنے طور پر کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو سمجھ لینا کہ ---"

اس نے دھمکی آمیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا تو میں نے کہا۔ "بے فکر رہو۔ میں تمہاری ہدایت پر من و عن عمل کروں گا۔ اب یہ بھی بتا دو کہ پانچ لاکھ کی رقم لے کر مجھے کہاں آنا ہے؟"

"ابھی یہ بتانا اچھا نہیں ---" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ "پہلے تم لوگ رقم کا بندوبست کرلو۔ میں تین بجے سہ پہر دوبارہ فون کروں گا اور بتاؤں گا کہ تمہیں پیسے اور کہاں رقم پہنچانا ہے۔"

"شیر ولی!" میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے اور ٹھوس لہجے میں کہا۔ "میں تمہاری خواہش اور ہدایت کے عین مطابق پانچ لاکھ کی رقم کے ساتھ وہاں جہاں تم کہو گے تن تنہا آجاؤں گا لیکن تم بھی ایک بات اپنے ذہن میں محفوظ کرلو۔ فرحانہ کا ایک بال بھی بیکا نہیں ہونا چاہیے۔ میں فیئر ڈیل کا قائل ہوں اگر تمہاری طرف سے کوئی کھیل کھیلا گیا تو پھر مجھ سے کسی شرافت کی امید نہیں کرنا۔ میں فرحانہ کی خاطر کچھ بھی کر سکتا ہوں ---- کچھ بھی۔"

میں جذبات میں کچھ زیادہ ہی بول گیا تھا۔ عبدالخالق اور احمد بیگم کی آنکھیں تو ویسے ہی مجھ پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہ ایک مرتبہ پھر چونک کر مجھے دیکھنے لگے تھے۔ پہلے جب فون کا اسپیکر آن تھا اور شیر ولی نے میری محبوبہ کے حوالے سے فرحانہ کا ذکر کیا تھا تو بھی ان دونوں کے چہروں اور آنکھوں میں اچانک حیرت اور الجھن ابھر آئی تھی۔ بہرحال یہ اچھا ہوا کہ انہوں نے مجھ سے کچھ بھی استفسار نہیں کیا تھا۔ پتا نہیں یہ ان کی مصلحت تھی یا کوئی مجبوری!

شیر ولی نے میری بات کے جواب میں کہا۔ "تم بھی فکر نہ کرو میں کوئی گڑبڑ نہیں کروں گا۔ فرحانہ کے لیے تمہارے جذبات کو میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں لیکن مجھے حیرت ہے کہ ابھی تک تم نے اس سے بات کرنے کی خواہش ظاہر نہیں کی ---؟"

"چھوٹی چھوٹی باتوں پر حیران نہ ہوا کرو۔ اس سے تم مصائب امراض میں مبتلا ہو سکتے ہو۔" میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "تم فرحانہ کے ماں باپ سے اس کی بات کرادو تو تمہاری مہربانی ہوگی۔"

"تم بھی کیا یاد کرو گے ---؟" وہ فراخ دلی سے بولا۔

میں نے ریسیور عبدالخالق کی جانب بڑھاتے ہوئے فون کا اسپیکر آن کردیا تاکہ احمد بیگم بھی بیٹی کی •

آواز آسانی سے سن سکے۔ اگلے ہی لمحے اسپیکر پر فرحانہ کی ڈری سہمی آواز ابھری۔

"ابو۔۔۔۔ یہ بہت ظالم لوگ ہیں۔۔۔۔ پلیز۔۔۔۔ آپ ان کا مطالبہ پورا کر کے مجھے۔۔۔۔ جلد از جلد چھڑالیں۔۔۔۔"

"فکر نہ کرو بیٹی! تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔" عبدالخالق نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ "آج رات تم اپنے گھر میں اطمینان سے سوؤ گی۔"

"میری بچی! تم ٹھیک تو ہو؟۔۔۔۔" امینہ بیگم نے جذبات سے مغلوب آواز میں پوچھا۔

"جی امی۔۔۔۔" فرحانہ نے نہایت ہی مختصر جواب دیا۔

"تم رات کو اچھی طرح سوئی تھیں نا؟" امینہ بیگم بھرائے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوئیں۔ "ان لوگوں نے تمہیں کچھ کھانے کو دیا تھا۔۔۔۔ تم نے ناشتا کیا ہے یا۔۔۔۔"

امینہ بیگم کی بات پوری ہونے سے پہلے فون کا اسپیکر ڈیڈ ہو گیا۔ اب وہاں سے کسی قسم کی کوئی آواز نہیں ابھر رہی تھی جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ ندیم شیر ولی نے ٹیلی فونک رابطہ منقطع کر دیا تھا۔ اب تین بجے سے پہلے اس سے بات نہیں ہو سکتی تھی۔

عبدالخالق نے ریسیور کریڈل کیا اور تشویش بھری نظر سے مجھے تکنے لگا۔ فرحانہ کی امی کی آنکھیں بھی بھیگی ہوئی تھیں۔ میرے دل کا چور مجھے ڈرانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا کہ یہ لوگ مجھ سے پوچھیں گے کہ میں فرحانہ کے لیے اتنا جذباتی کیوں ہو رہا ہوں اور شیر ولی نے فرحانہ کے لیے میری محبوبہ کے الفاظ کیوں استعمال کیے تھے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میرے سارے خدشات بے بنیاد ثابت ہوئے تھے۔

"بیٹا اس نازک موقع پر ہمیں تمہارے تعاون اور مدد کی اشد ضرورت ہے۔" عبدالخالق کی نم زدہ آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ "تمہیں ہمت کر کے جانا ہوگا اور فرحانہ کو بخیریت واپس لانا ہوگا۔ ہم تمہارا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھیں گے۔"

"انکل! آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔" میں نے گمبھیر سنجیدگی سے کہا۔ "ایک پڑوسی ہونے کے ناتے یہ میرا فرض ہے کہ میں ان مشکل حالات میں آپ لوگوں کے کام آؤں اور پھر یہ بھی تو دیکھیں شیر ولی کی آپ سے کوئی دشمنی نہیں، فرحانہ میری وجہ سے اس مصیبت میں گرفتار ہوئی ہے۔"

"بیٹا! تم بار بار خود کو قصوروار ٹھہرانے کی کوشش نہ کرو۔" امینہ بیگم نے خلوص دل سے کہا۔ "جو پریشانی اور دکھ قسمت میں لکھے ہوتے ہیں، وہ مل کر رہتے ہیں۔ ہمیں تم جیسے پڑوسیوں پر فخر ہے۔"

"میں ان شاء اللہ تین بجے سے پہلے پانچ لاکھ روپے ارینج کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔" عبدالخالق نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔ "اور اس شیطان کا بتایا ہوا چھوٹا سا سرخ چیڈ بیگ بھی۔ تم ذہنی طور پر خود کو تیار کر لو۔"

"انکل! میں پوری طرح تیار ہوں۔" میں نے ایک عزم سے کہا۔ "اگر آپ کو رقم کا بندوبست کرنے میں کوئی دقت یا دشواری محسوس ہو تو میں اس معاملے میں کوشش کر سکتا ہوں۔"

یہ بات میں نے اس بنیاد پر کی تھی کہ رات عاطف رشید نے اس حوالے سے مجھے مطمئن رہنے کی یقین دہانی کروائی تھی۔ اگر میں ان سے کہتا تو وہ پانچ لاکھ کا انتظام کر سکتے تھے۔ میری کوششوں نے انہیں جتنے بڑے نقصان سے بچایا تھا، پانچ لاکھ اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھے لیکن سچی بات یہ ہے کہ میں شیر ولی کو ایک روپیا دیے بغیر اس کی شیخی اتروانے کے موڈ میں تھا۔

"نہیں بیٹا۔۔۔۔" عبدالخالق نے نفی میں گردن

ہلاتے ہوئے کہا۔ "تمہیں اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ مجھے صد فی صد یقین ہے کہ میں رقم کا بندوبست کر لوں گا۔"

میں ان میاں بیوی کو تسلی دلاسا دے کر واپس آ گیا۔

گھر کا دروازہ شازیہ نے کھولا اور مجھے بتایا۔ "بھائی جان! آپ کے دوست آئے بیٹھے ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے خوش ولی؟" میں نے سوالیہ نظروں سے شازیہ کی طرف دیکھا۔

"جی بھائی جان!" شازیہ نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "امی نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا ہے اور خود بھی وہیں موجود ہیں۔"

میں ڈرائنگ روم کی جانب بڑھ گیا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی امی نے خوش ولی سے کہا۔

"لو۔۔۔۔ اسد آ گیا۔"

رسمی علیک سلیک کے بعد خوش ولی نے مجھ سے پوچھا۔

"آنٹی بتا رہی تھیں تم شیر ولی سے بات کرنے گئے ہوئے تھے۔ کیا کہا اس نحوست نے؟"

"ہاں بیٹا!" امی نے بھی سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ "اس شیطان کی اولاد سے کیا باتیں ہوئیں؟"

میں نے بڑے سدھے ہوئے الفاظ میں ندیم شیر ولی سے ہونے والی ٹیلی فونک گفتگو کا خلاصہ ان دونوں کے گوش گزار کر دیا۔ امی نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے اسد! کیا عبدالخالق سہ پہر تین بجے سے پہلے پانچ لاکھ کا انتظام کر لے گا؟"

"انہوں نے مجھے یقین دلایا ہے کہ وہ بندوبست کر لیں گے۔" میں نے کہا۔

"تب تو ٹھیک ہے۔" امی نے اطمینان بھری سانس خارج کی پھر اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولیں۔ "تم لوگ آپس میں باتیں کرو میں ناشتا بھجواتی ہوں۔"

"آنٹی اس تکلف کی ضرورت نہیں۔" خوش ولی جلدی سے بولا۔

"اسد نے ابھی تک ناشتا نہیں کیا۔" امی بولیں۔ "تم بھی میرے بیٹے کی طرح ہو اسے ناشتا کرانے کے ساتھ ساتھ خود بھی کر لو گے۔"

خوش ولی لاجواب ہو کر امی کی طرف دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ "امی! اس مردود شیر ولی نے ہمارے گھروں کی نگرانی کا بندوبست کر رکھا ہے اس لیے ہمیں نارمل انداز میں ایکٹ کرنا ہے۔ محلے میں کسی کو نہیں پتا چلنا چاہیے کہ ہم اس وقت کتنے سنگین حالات سے گزر رہے ہیں۔ میں نے انکل اور آنٹی کو تو اس سلسلے میں ہدایات دے دی ہیں۔ آپ بھی اس نکتے کو ذہن میں رکھیے گا اور شازیہ کو بھی اچھی طرح سمجھا دیجیے گا۔"

"تم بے فکر رہو۔۔۔۔" امی نے تسلی آمیز انداز میں کہا اور ڈرائنگ روم سے نکل گئیں۔

"یار اسد! مجھے تو یہ بات بالکل بکواس لگ رہی ہے۔" امی کے جانے کے بعد خوش ولی نے کہا۔

"کون سی بات؟" میں نے بے ساختہ پوچھا۔

"یہی کہ شیر ولی نے ہمارے گھروں کی نگرانی کا بندوبست کر رکھا ہے۔" اس نے کہا۔ "میں سمجھتا ہوں یہ صرف اس نے تمہیں ڈرانے اور قابو میں رکھنے کے لیے شوشا چھوڑا ہے۔"

"مجھے اس کی یہ دھمکی کھوکھلی ہی لگتی ہے۔" میں نے خوش ولی کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن احتیاط کرنے میں کیا حرج ہے۔۔۔۔"

"کوئی مضائقہ یا حرج نہیں ہے۔" وہ سرسری انداز میں بولا پھر گہری سنجیدگی سے بولا۔ "کیا تم بھی پانچ لاکھ روپے چند بیگ میں رکھ کر شیر ولی کی خدمت میں پیش کرو گے؟"

"ہرگز نہیں!" میں نے پوری قطعیت سے کہا۔

"پھر تمہارے ذہن میں کیا ہے؟" وہ متوحش ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

"فرحانہ کا باپ مجھے جو پانچ لاکھ روپے دے گا میں ان میں سے صرف دس ہزار روپے استعمال کروں گا۔" میں نے خوش ولی کو اپنے ذہن میں ترتیب پانے والے منصوبے سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ "یعنی ہر گڈی کے اوپر اور نیچے ہزار کا اصلی نوٹ ہوگا۔ ان نوٹوں کے اندر پوری گڈی جعلی نوٹوں سے بھری ہوئی۔ اس طرح ایک لاکھ والی گڈی تیار کرنے میں صرف دو ہزار روپے خرچ ہوں گے اور پانچ لاکھ کی تیاری میں کل دس ہزار روپے۔ میں جانتا ہوں کہ جعلی نوٹ کہاں سے حاصل کرنا ہیں لیکن یہ راز صرف ہم دونوں کے بیچ رہے گا۔ میں عبدالخالق کو اس بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

"گڈ آئیڈیا!" وہ ستائشی انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "لیکن ہم یہ دس ہزار بھی ضائع کیے بغیر فرحانہ کو بحفاظت واپس لے آئیں گے۔"

"ان شاءاللہ!" میں نے پورے یقین سے کہا۔

خوش ولی نے بڑے اعتماد سے میری آواز میں آواز ملائی۔ "ان شاءاللہ!"

"خوش ولی!" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سنجیدہ انداز میں بولنا شروع کیا۔ "شیر ولی نے مجھے آج شام پانچ لاکھ کی رقم لے کر ٹھیک پانچ بجے اس مقام پر پہنچنے کا حکم دیا ہے جس کے بارے میں وہ تین بجے بتائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم ایک ساتھ اس مشن پر روانہ نہیں ہوسکیں گے۔"

"اس میں پریشانی والی کون سی بات ہے۔" وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ "جب وہ کمینہ تین بجے تمہیں مخصوص مقام کے بارے میں بتائے گا تو تم مجھے اطلاع کر دینا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے، اب انسان بڑی آسانی سے کراچی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ سکتا ہے۔" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے ٹھہرا پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ "میں تم سے پہلے مطلوبہ مقام پر پہنچ جاؤں گا۔"

"لیکن میں چاہتا ہوں کہ ہم اس مشن میں شانے سے شانہ ملا کر قدم بہ قدم ایک ساتھ رہیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"یہ کس طرح ممکن ہوسکے گا؟" وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے تکنے لگا۔

"دنیا میں کوئی بھی کام ناممکن نہیں ہے خوش ولی!" میں نے بدستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "اور میں نے جو کہا ہے اسے کر کے بھی دکھا سکتا ہوں۔"

"ہوں۔" خوش ولی کریدنے والی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "اس کا مطلب ہے تمہارے ذہن میں کوئی خاص منصوبہ ہے؟"

"بالکل۔۔۔!" میں نے سر ہلاتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ایسی ہی بات ہے۔"

"وہ بات میں بھی تو سنوں۔" وہ پُراسرار انداز میں بولا۔

میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے خوش ولی کو اپنے منصوبے سے آگاہ کرنے لگا۔ وہ حیرت اور دلچسپی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ مجھے سننے لگا۔

❀ ❀

وہ کم بخت اور کائیاں شیر ولی وقت کا بہت پکا تھا۔ ٹھیک تین بجے اس نے فرحانہ کے گھر فون کر کے

پہلے تو عبدالخالق سے اس بات کی تصدیق کی تھی کہ پانچ لاکھ کا بندوبست ہو گیا یا نہیں۔ عبدالخالق نے جواب میں جب اسے تسلی کرا دی تو پھر وہ مجھے ہدایات دینے لگا تھا۔ ظاہر ہے اس موقع پر میں بھی عبدالخالق کے پاس ہی موجود تھا۔ یہ ٹیلی فونک گفتگو بڑی اہمیت کی حامل تھی۔

اس کی ہدایت میں اہم پوائنٹ کچھ اس طرح تھے۔ میں گھر سے رقم لے کر بالکل اکیلا نکلوں گا اور مقررہ مقام تک پہنچنے کے دوران میں کوئی مجھے جوائن نہیں کرے گا۔ میں بس، ویگن یا موٹر سائیکل پر سفر نہیں کروں گا بلکہ مخصوص مقام تک رسائی کے لیے میں رکشا یا ٹیکسی استعمال کروں گا۔ میرے پاس رقم والے سرخ چمڑے بیگ کے سوا اور کوئی سامان نہیں ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بیچ بھی لگا دی تھی کہ اس کا ایک شاطر آدمی مسلسل میری نگرانی کر رہا ہے۔ اگر میں نے شیر ولی کی حکم عدولی کی تو پھر فرحانہ کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔

میں نے اپنے منصوبے کی روشنی میں اس کی ہدایت کو فالو کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ میرے ہاتھ میں صرف سرخ چمڑے بیگ تھا۔ لیکن اس بیگ کے اندر صرف دس ہزار کے اصلی نوٹ تھے۔ میں نے بڑی محنت سے یہ گڈیاں تیار کی تھیں۔ میرے گھر سے مخصوص مقام کا فاصلہ ڈھائی سے پونے گھنٹے کا تھا مگر میں ٹھیک چار بجے گھر سے نکلا تھا۔ گھر سے روانہ ہوتے وقت میں بالکل اکیلا تھا لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد مجھے خوش ولی نے بھی جوائن کر لیا تھا اور یہ میرے منصوبے کا انتہائی حساس حصہ تھا۔

خوش ولی نے پچھلے کچھ عرصے میں کئی جاب بدلی تھیں جن میں رکشا ڈرائیوری بھی شامل تھی اگرچہ یہ کام اس نے صرف دو ماہ ہی کیا تھا تاہم اس عرصے میں وہ ڈرائیونگ سیکھ گیا تھا۔ اس کے ایک دوست کا اپنا رکشا تھا آج وہی رکشا ہمارے مشن میں ایک اہم کردار ادا کرنے جا رہا تھا۔

میں گھر سے ٹھیک چار بجے نکلا اور ٹہلتے ہوئے بس اسٹاپ کی جانب بڑھنے لگا۔ سرخ چمڑے بیگ میرے ہاتھ میں تھا۔ بس اسٹاپ میرے گھر سے واکنگ ڈسٹنس پر واقع تھا۔ جلد ہی میں وہاں پہنچ گیا۔ خوش ولی مجھ سے پہلے وہاں موجود تھا۔ اس نے اپنا حلیہ اس طرح تبدیل کیا تھا کہ دیکھ کر میں بھی دنگ رہ گیا۔ وہ ایک رکشا کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا بالکل پہچانے میں نہیں آ رہا تھا۔ مجھے چونکہ اس کے رکشا کا نمبر ازبر تھا لہٰذا کسی دقت کا سامنا نہیں تھا۔

میں نے اس خیال سے کہ اگر واقعی شیر ولی نے اپنا کوئی آدمی میری نگرانی پر مامور کر رکھا ہے تو اسے کسی قسم کا شک نہ ہو خوش ولی کے پاس جانے سے پہلے دو تین اور رکشا والوں سے بھاؤ تاؤ کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ میں شیر ولی کی ہدایات پر من و عن عمل کر رہا ہوں۔ بالآخر میں خوش ولی والے رکشا کی جانب بڑھ گیا اور اس کے پاس پہنچ کر کہا۔

"ہمیں یونیورسٹی روڈ پر چلتے ہوئے گلستان جوہر کے آخری سرے پر اس علاقے میں پہنچنا ہے جہاں تعمیرات کا سلسلہ جاری ہے مگر لوگوں نے باقاعدہ رہائش اختیار نہیں کی۔ میں راستے میں تمہیں گائیڈ کرتا رہوں گا۔"

"ٹھیک ہے سمجھ گیا۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "بیٹھ جاؤ۔"

خوش ولی سے یہ باتیں میں اونچے لہجے میں کر رہا تھا تاکہ دیکھنے والوں کو بھی محسوس ہو کہ میں کرایہ وغیرہ کے سلسلے میں بارگیننگ کر رہا ہوں۔

"راستے میں ہم زیادہ بات نہیں کریں گے۔"

میں نے کہا۔ ”میں نے شیر دلی سے اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ ہم نے کس زیر تعمیر بنگلے میں جانا ہے۔ میں راہ نمائی کرتے ہوئے تمہیں اس بنگلے کے قریب پہنچا دوں گا اور کرایہ ادا کر کے رکشا سے اتر جاؤں گا۔ تم بھی مجھے وہاں چھوڑ کر نارمل انداز میں آگے بڑھ جاؤ گے لیکن ایک چکر کاٹنے کے بعد واپس آؤ گے اور مذکورہ بنگلے کے نزدیک ہی کہیں رک کر میرے فون کا انتظار کرو گے۔ میں نہیں جانتا بنگلے کے اندر کیا حالات پیش آئیں گے تمہیں میری فوری مدد کے لیے تیار رہنا ہے۔“

”یار! میں پوری تیاری کے ساتھ آیا ہوں۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے مخصوص انداز میں بولا۔ ”میرے رکشا میں کچھ ایسا سامان بھی موجود ہے جس کی کسی بھی ہنگامی صورت حال میں اچانک ضرورت پیش آ سکتی ہے۔“

خوش دلی نے لفظ ”سامان“ پر اچھا خاصا زور دیا تھا۔ مجھے سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ اس کا اشارہ کن اسلحے کی جانب تھا۔ میں نے اطمینان بخش سانس خارج کی اور رکشا پر سوار ہو گیا۔

ندیم شیر دلی نے مجھے جس بنگلے کا ایڈریس سمجھایا تھا اسے تلاش کرنا میرے لیے قطعی مشکل نہیں تھا۔ میں نے گلستان جوہر کا چپہ چپہ دیکھ رکھا تھا۔ اس کی چاؤ کی وجہ سے کہ دل چاہتا تھا کیونکہ مذکورہ بنگلہ زیر تعمیر ہونے کے ساتھ ساتھ الگ تھلگ بھی واقع تھا اس کے گرد و پیش میں کئی پلاٹ خالی پڑے ہوئے تھے۔ اس لوکیشن کا شیر دلی کو سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ وہاں سے محفوظ انداز سے رقم اور فرحانہ کی ڈلیوری عمل میں لائی جا سکتی تھی۔ علاوہ ازیں اگر میں اپنے ساتھ کسی کو لے کر آتا یا بعد میں کسی کو اپنی مدد کے لیے بلانے کا ارادہ رکھتا تو میرا مددگار فوراً شیر دلی کی نگاہ میں آ جاتا۔

خوش دلی نے درمیانی رفتار سے رکشا چلاتے ہوئے پانچ منٹ کم پانچ بجے مطلوبہ بنگلے کے سامنے پہنچا دیا۔ راستے میں ایک آدھ بار اس نے مجھے اپنے پاس سامان رکھنے کا بھی مشورہ دیا تھا لیکن میں نے بڑی خوب صورتی سے ٹال دیا تھا۔ یہ ”سامان“ کم بخت ایسی شے ہے کہ بے جا استعمال پر خود کو اڑا سکتی ہے۔

میں نے ہپ پاکٹ میں سے بٹوا نکال کر خوش دلی کو کرایہ ادا کیا۔ جب وہ رکشا آگے بڑھا لے گیا تو میں نے بنگلے کے گیٹ کی سمت قدم بڑھا دیے۔

شیر دلی نے مجھے بتایا تھا کہ بنگلے کا گیٹ اندر سے بند نہیں ہوگا۔ میں گیٹ پر تھوڑا سا دباؤ ڈالوں گا تو وہ گیٹ خود بخود کھل جائے گا۔ مجھے بنگلے کے ڈرائنگ روم میں پہنچ کر رقم والا ہینڈ بیگ سینٹر ٹیبل پر رکھنا ہوگا۔ شیشے کی ٹاپ والی اسی ٹیبل پر مجھے ایک چابی رکھی ملے گی۔ وہ چابی اندرونی کمرے کی ہے۔ مذکورہ کمرے کے دروازے پر چاک کی مدد سے بڑا سا کراس کا نشان بنا ہوگا۔ میں ڈرائنگ روم سے نکل کر اندر کی جانب قدم بڑھاؤں گا تو کراس والا کمرا میری نگاہ کے سامنے پڑے گا۔ اس کمرے میں فرحانہ بند ہوگی۔ میں چابی کی مدد سے وہ دروازہ کھولوں گا اور فرحانہ کو اپنے ساتھ لے کر وہاں سے روانہ ہو جاؤں گا یعنی اس بنگلے پر مجھے کسی سے ملنا ملانا یا بات چیت نہیں کرنا تھا۔ البتہ شیر دلی نے مجھے خطرناک انداز میں وارننگ دی تھی کہ اگر میں نے کوئی مکر و فریب یا حد سے بڑھ کر کوئی کارگزاری دکھانے کی کوشش کی تو یہ سراسر گھاٹے کا سودا ہوگا۔ اس احمق کو کیا پتا کہ میں وہاں کن عزائم کے ساتھ پہنچا تھا۔

شیر دلی کا بیان کردہ بنگلے کا اندرونی سیٹ اپ بظاہر ذہن میں نقش تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں

وہاں خاموشی سے جاؤں اور شرافت سے واپس آ جاؤں لیکن جب میں نے گیٹ پر ہاتھ کا دباؤ ڈالا اور وہ بڑی فرماں برداری سے کھلتا چلا گیا اور اندر بنگلے کے اندر خاموشی اور سناٹے نے میرا استقبال کیا تو ایک لمحے کے لیے شیر دلی کی باتوں کا یقین کرنے کو دل چاہا تھا۔ تاہم میں نے کسی مرحلے پر احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔

وسیع و عریض ڈرائنگ روم کے وسط میں گلاس ٹاپ ٹیبل پر ایک چابی رکھی نظر آ رہی تھی۔ میں دبے قدموں ٹیبل کے پاس پہنچا اور چوکنا نظروں سے چاروں جانب دیکھا۔ بنگلے کے سکوت سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہاں میرے سوا اور کوئی ذی روح موجود نہیں۔

میں نے مطمئن ہو کر سرخ ہینڈ بیگ سینٹر ٹیبل پر رکھا اور وہاں سے چابی اٹھا کر ڈرائنگ روم سے نکل کر بنگلے کے اندرونی حصے کی جانب بڑھنے لگا۔ خاموشی اور سناٹا اس قدر عمیق تھا کہ مجھے اپنے دل کی دھڑکنیں بڑی واضح سنائی دے رہی تھیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے دل میری کنپٹیوں میں دھڑک رہا ہو۔ گہرے سکوت کے باعث میرے قدموں کی چاپ بھی خاصی بلند آہنگ تھی۔

میں نے جیسے ہی ڈرائنگ روم سے باہر قدم نکالا کراس والا دروازہ میری نگاہ میں آ گیا۔ مذکورہ کمرا بھی ڈرائنگ روم کے سامنے ہی پڑتا تھا۔ کراس زدہ دروازے کے پیچھے میری جان جگر فرحانہ بند تھی۔ کوئی پل جاتا تھا کہ میں چابی سے وہ دروازہ کھول کر اپنی حیات تک رسائی حاصل کرنے والا تھا۔ اس لمحے پر میرے جذبات اور احساسات کی جو کیفیت تھی اسے الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔

میں جیسے ہی بند دروازے کے قریب پہنچا۔ کمرے کے اندر سے نسوانی آواز ابھری۔

”کون...؟ جلدی دروازہ کھولیں اور مجھے ان لوگوں کی قید سے آزاد کرائیں۔ میں کب سے آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔“

آواز چونکہ بند دروازے کے عقب سے آ رہی تھی لہٰذا بلند آہنگ نہیں تھی۔ تاہم یہ ایک ایسی آواز تھی جسے میں لاکھوں کروڑوں آوازوں میں الگ شناخت کر سکتا تھا۔ وہ میری جان تمنا فرحانہ کی آواز تھی۔

اس بات کا یقین ہو جانے کے بعد کہ بند دروازے کے پیچھے میری فرحانہ ہی ہے مجھے خود پر اختیار نہ رہا۔ میں ہر احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر بے اختیار دروازے کی جانب لپکا اور بڑی سرعت سے چابی کی ہول میں ڈالنے کی کوشش کی۔

چابی تالے کے سوراخ کے اندر تو چلی گئی مگر اسے گھمانے پر لاک نہیں کھلا۔ میں اضطراری انداز میں زور آزمائی کرنے لگا اور اسی افراتفری میں اپنے گرد و پیش سے غافل ہو گیا۔

یہ لمحاتی غفلت مجھے بہت مہنگی پڑی۔ میں لاک کو کھولنے کی جدوجہد میں مصروف تھا کہ اچانک میرے سر کے پچھلے حصے پر گویا کوئی قیامت ٹوٹ پڑی۔ کسی آہنی وزنی شے سے میری کھوپڑی کو نشانہ بنایا گیا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے ستارے سے چمک اٹھے۔ اگلے ہی لمحے میرا ذہن گہری تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

بے ہوش ہونے سے قبل جس آواز نے میری سماعت تک رسائی حاصل کی وہ فائرنگ کی مخصوص آواز تھی۔ اس کے بعد میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔

(باقی آئندہ)

⌘

محترم عمران احمد!
السلام علیکم!
آپ کی محنت اور خوبصورت پرچہ ... سچی کہانی ارسال کر رہی ہوں۔ [illegible]

والسلام
شبینہ ارشد
کراچی

مجھے کے سارے بچے ان کے گھر میں کھیل رہے تھے۔ ان ہی سارے بچوں میں خود ان کے اپنے بچے بھی شامل تھے۔ رشیدہ خالہ اور اسلم خالو بہت محبت اور پیار سے ان بچوں کے کھیل دیکھ رہے تھے۔ اگر بچوں میں کھیل کے دوران لڑائی جھگڑا ہو جاتا تو وہ فوراً ان بچوں کو پیار سے سمجھا کر ان کی آپس میں صلح کرا دیتے۔ اگر کسی بچے کو چوٹ لگ جاتی تو روتے ہوئے بچے کو پیار کرتے اور دوا لگا کر پٹی کر دیتے۔ خالہ رشیدہ کے گھر کھیلنے والے ان بچوں میں میں بھی شامل تھی۔ ہم سارے ہی بچوں کو خالہ رشیدہ اور اسلم خالو سے بے حد محبت تھی۔ وہ تھے ہی ایسے۔ بہت نرم دل، ملنسار اور محبت کرنے والے۔ ہر بچے سے بلا امتیاز اپنے بچوں کی طرح محبت کرتے تھے۔

ہم کراچی کے ایک مضافاتی علاقے میں رہا کرتے تھے۔ یہ آج سے کوئی پینتیس سال پرانی بات ہے میں اس وقت بچی ہی تھی۔ اللہ نے مجھے اچھی شکل وصورت اور خوب گورا رنگ دیا تھا۔ اس لیے خالہ اور خالو مجھے شہزادی کہا کرتے تھے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ خالہ کے پورے گھر والوں کا رنگ خوب پکا کالا تھا۔ شاید اسی لیے میں انہیں بہت اچھی لگا کرتی ہوں گی۔

خالہ کے کل چار بچے تھے دو بیٹے اور دو بیٹیاں۔ سب سے بڑی لڑکی تھی جن کے اصل نام سے ہم واقف نہیں تھے۔ وہ اپنی عرفیت کی وجہ سے پہچانی جاتی تھیں۔ وہ ہم سب سے بڑی تھیں۔ یعنی جوان تھیں اور سب انہیں منی باجی کہا کرتے تھے۔ منی باجی بھی خوب کالی تھیں۔ نین نقش بھی بھدے سے تھے مگر ان کی زبان بہت میٹھی تھی۔ وہ سراپا محبت تھیں۔ ہم بچے تھے اس لیے ہمیں ان کی شکل وصورت سے نہیں ان کے پیار سے مطلب تھا اگر کسی لڑکی کا ہاتھ منہ گندا ہوتا یا بال بکھرے ہوتے تو منی باجی جھٹ اس کا ہاتھ منہ صابن سے رگڑ رگڑ کر دھلا دیتیں۔ بالوں میں کنگھا کرتیں اور گھر سے کسی رنگین کپڑے کی کترن کو ربن بنا کر بالوں میں باندھ دیتیں۔

منی باجی سے چھوٹے دو لڑکے تھے اور آخری اولاد ایک لڑکی تھی۔ جو ہم سے ذرا سی چھوٹی تھی۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی خالہ کے گھر کھیلنے کی یہ وہ زمانہ تھا جب لوگوں میں آپس میں بہت پیار اور خلوص

ہوا کرتا تھا۔ لوگ اپنے رشتہ داروں سے زیادہ اپنے محلے والوں کو اپنا سمجھتے تھے۔ ایک دوسرے کے دکھ درد اور پریشانی کو اپنا اور خوشی ومسرت کی گھڑیوں کو اپنا سمجھتے تھے۔ تقریباً سارے محلے والے ایک دوسرے کے اندرونی حالات سے بھی خوب واقف ہوتے تھے۔ کسی ایک کے گھر کوئی اچھی چیز پکی تو جب تک محلے کے ایک دو گھروں میں نہیں بھیج دیتے کھاتے نہیں تھے اور خالہ رشیدہ تو اس معاملے میں سب سے آگے تھیں۔ غربت تھی مگر خلوص تھا اور آج کا دور ہے کہ محلے میں کسی کو کسی کی خبر نہیں ہوتی یہ تک پتا نہیں ہوتا کہ کس گھر میں کون بیمار ہے یا کس کی شادی ہے۔ باہر شامیانہ لگا دیکھا اور چند مردوں کو سروں پر ٹوپیاں پہنے کھڑے دکھائی دیے تو اندازہ ہو گیا کہ یہاں کسی کی موت ہو گئی ہے یا پتہ معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم یا مرحومہ کتنے عرصے سے بیمار تھیں۔ یا پھر شادی کا کارڈ آ گیا تو شادی کی اطلاع ہو گئی سارے محلے والوں کی ان ہی موقعوں پر دعا سلام ہو گئی اور بس.....!

خالہ کا چھوٹا بیٹا کلیم بڑا پیارا اور کالا سا تھا۔ وہ بہت پھرتیلا اور تیز تھا۔ درختوں پر کسی بندر کی مانند تیزی سے چڑھ جاتا۔ اس زمانے میں لوگوں کے گھروں میں بڑے بڑے صحن ہوتے تھے اور ان میں کسی نہ کسی پھل کے درخت ہوتے تھے۔ خاص طور پر آم، امرود اور جامن کے درخت املی کے درخت بھی اور بیر کے درخت بھی۔

کلیم ان کاموں میں بڑا ماہر تھا۔ پھر دوپہر میں جب سب لوگ ذرا دیر کے لیے سونے کو لیٹتے تو کلیم کسی گلی کی دیوار پر چڑھ کر درختوں پر چڑھ جاتا اور کچے پکے پھل توڑ لاتا اور ہم سب مل کر مزے سے کھاتے۔ وہ ہم بچوں کو بار بار تنبیہ کرتا کہ امی ابا سے اس بات کی شکایت مت کرنا کہ میں ایسا کرتا ہوں اور ہمارا منہ بند رکھنے کی رشوت کے طور پر وہ ہم بچوں کو پھل دے دیا کرتا تھا۔ اگر کبھی کم پھل ہاتھ لگتے تو وہ کسی کو پھل نہیں دیتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے مجھے میرا حصہ نہیں دیا تو میں نے اس سے بدلہ لینے کا سوچا۔ اس روز دوپہر کو جب وہ گندی گلی کی دیوار (جو زیادہ اونچی نہیں ہوتی تھی) پر چڑھ کر درخت پر خوب اونچا چڑھ گیا تو میں نے شور مچا کر آواز لگائی۔ "دیکھیے ایک لڑکا آپ کے پیڑ پر چڑھ کر کیریاں توڑ رہا ہے۔" کلیم نے میری آواز سنی اور اوپر سے ہی گندی گلی میں چھلانگ لگا دی۔ میں وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگی۔ مگر کلیم نے گر کر پھرتی سے اٹھا اور بھاگ کر مجھے پکڑ لیا اور میری خوب پٹائی لگائی۔ میں روتی ہوئی سیدھی کلیم کے گھر آئی اور سارا ماجرہ کہہ سنایا۔

اور ہمارے بڑوں کو ہماری حرکتوں کا پتا چل گیا کہ ہم دوپہر میں کیا کرتے ہیں۔ اس دور کے بچے بھی بچے ہی تھے۔ لڑکے اور لڑکیاں ساتھ کھیلتے تھے۔ آج کے دور کے بچوں کی طرح نہیں جو ٹی وی اور کیبل کی وجہ سے بچپن میں ہی جوان ہو جاتے ہیں۔

بہرحال میری امی کو بھی پتا چلا اور پھر دوپہر میں امی دروازہ تالا لگا کر کے سو جایا کرتیں۔ یوں ہمارا دوپہر کو گھر سے نکلنا بند ہو گیا۔ شام کو البتہ خالہ کے گھر جا کر کھیلنے کی اجازت مل جاتی۔ کلیم سے میری بات چیت بالکل بند ہو گئی۔ کھیل کے دوران بھی وہ خالہ کی آنکھ بچا کر مجھے آنکھیں نکال کر ڈرایا کرتا۔ کیوں کہ اس واقعے کے بعد ایک تو خالو نے اس کی پٹائی لگائی اور اس کے بھی دوپہر کو باہر نکلنے پر پابندی لگ گئی۔

وہ بچپن کا بہت خوش گوار اور سنہرا دور تھا آج بھی ان دنوں کو یاد کرتی ہوں تو ہونٹوں پر مسکراہٹ آ جاتی ہے۔ ان ہی دنوں ایک ایسی بیڈ نیوز سننے کو ملی جس نے ہم سب بچوں کو بہت اداس کر دیا۔

خالہ نے بتایا کہ اسلم خالو کا تبادلہ نواب شاہ ہو گیا ہے۔ خالو پاکستان ریلوے میں ملازمت کرتے تھے اس لیے سب لوگ یہاں سے جا رہے تھے۔

اور میرا یہ حال تھا کہ میں آنکھیں کھولے حیرت سے ان کا منہ دیکھ رہی تھی پھر میری کھلی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے اور میں نے بمشکل کہا۔

"کب جائیں گی......؟"

"ارے میرا بچہ...... میری جان۔" خالہ نے جھٹ مجھے پیار سے چپٹا لیا اور بولیں۔

"جب تیرے خالو کے دفتر والے کہیں گے ہم جب ہی وہاں جائیں گے۔ میں بھی تم سب کو بہت یاد کروں گی اور خاص طور پر تو...... تو تو مجھے بہت ہی یاد آئے گی۔ میری شہزادی جو ہوئی۔"

اور پھر خالہ کیا اس محلے سے گئیں ہمارے سارے کھیل ہی ختم ہو گئے گلی میں کھیلنے کی اجازت نہیں ملتی۔ بس صبح اسکول جاتے پھر گھر پر ہی رہتے۔ کبھی کبھار ہم لڑکیاں اپنی گڑیا کی شادی کا کھیل گھر میں بیٹھ کر ہی کھیل لیتیں۔

وقت تیزی کے ساتھ گزرتا گیا۔ خالہ بھی ہمارے ذہنوں سے دور ہو گئیں۔ کسی نے بالکل سچ کہا ہے کہ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل...... جو نظروں سے دور ہو اسے بھلا ہی دیا جاتا ہے۔ ہم چونکہ بچے تھے اس لیے بھی جلدی بھول گئے۔ خالہ کا گھر بند پڑا تھا۔ ان کے بعد اس گھر میں کوئی بھی رہنے کے لیے نہیں آیا۔

ہمیں پتا ہی نہیں چلا کہ ہم سب کب بچپن کی حد پھلانگ گئے۔ میری بڑی بہن کی شادی ہوئی۔ اب گھر میں میں ہی بڑی تھی۔ سارا گھر سنبھالتی اور پڑھائی بھی کرتی۔

ایک دن خالہ کے گھر کے برابر والے گھر میں رہنے والی شگفتہ میرے پاس آئی اور خوشی سے چہکتے ہوئے بولی۔

"میں ایک بہت بڑی خوشی کی خبر لے کر آئی ہوں۔ بوجھو تو ذرا۔"

"کیا بات ہے بہت خوش لگ رہی ہو۔ کوئی رشتہ وغیرہ تو نہیں آ گیا۔" میں نے مسکراتے ہوئے اس سے خبر پوچھتے ہوئے کہا۔

"نہیں یار اس سے بھی بڑی خوش خبری ہے۔" اس نے بہت پرجوش چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کہا۔

"اب زیادہ سسپنس مت پھیلاؤ اور بتاؤ۔" میں نے چڑ کر کہا۔

"خالہ آ رہی ہیں۔" اس نے کہا۔

"خالہ کون سی خالہ؟" میں نے حیرت سے اسے دیکھا کہ اس کی ایسی کون سی خالہ ہیں جن کے آنے پر یہ اتنا زیادہ خوش ہو رہی ہے۔ کیوں کہ اس کی ایک ہی خالہ تھیں اور وہ ہمیشہ آتی رہتی تھیں۔

"ارے بھول گئیں...... ارے تمہاری برابر والی خالہ...... سلیم کی امی...... نواب شاہ سے کراچی واپس آ رہی ہیں۔ آج سلیم بھائی آئے ہیں۔ وہ گھر کھول کر ٹھیک ٹھاک کر رہے ہیں۔ بتا رہے تھے کہ ایک دو دن بعد سارے گھر والے بھی آ جائیں گے۔" اس نے چہکتے ہوئے کہا۔

"چلو یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔" میں نے نارمل لہجے میں کہا۔ "مگر شگفتہ اب ہم بچے تھوڑی رہے ہیں۔ بڑے ہو گئے ہیں۔ سلیم بھائی بھی جوان ہو گئے ہوں گے اور اب ہم اس بے تکلفی اور بے باکی سے ان کے سامنے تھوڑی جا سکتے ہیں۔"

"ارے تمہیں وہ جوان تو ہو گئے ہیں مگر ان کا خلوص اور اپنائیت وہی پرانا والا ہے۔ ہمارے گھر ہی بیٹھے رہے اور امی ابا سے باتیں کرتے رہے۔ اب وہ پھر کھانا کھا کر اپنے گھر گئے ہیں۔" شگفتہ نے کہا۔

"اچھا پہلے خالہ کو آ جانے دو پھر جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"پتا ہے انہوں نے سب سے پہلے تیرے بارے میں پوچھا تھا۔ تو میں نے کہا کہ اب آپ اسے پہچان نہیں سکیں گے تو آپ کی نگاہیں اس کے اوپر سے ہٹیں گی ہی نہیں۔ وہ تو بڑے غضب کی حسین ہے۔" شگفتہ نے کہا۔

"تمہیں پتا ہے میں کتنا پردہ کرتی ہوں۔ ان کے سامنے بھی نہیں جاؤں گی اور کسی بھی پردہ کرنے والی لڑکی کے حسن کا ذکر غیر مرد کے آگے نہیں کرنا چاہیے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"چل چل زیادہ مولانی مت بن...... پردہ کیا میں نہیں کرتی۔ مگر وہ ہمارے بچپن کے ساتھی ہیں۔" شگفتہ نے بے پروا لہجے میں کہا۔

پھر دو تین دن گزر گئے میں نے سلیم بھائی کو نہیں دیکھا۔ دو تین دن بعد گلی میں ایک ٹرک آیا اور خالہ کے گھر کے سامنے رک گیا اور اس سے سامان اترنے لگا۔ ساری گلی میں شور مچ گیا کہ اسلم صاحب نواب شاہ سے واپس آ گئے۔

مزید دو دنوں کے بعد میں امی کے ساتھ خالہ سے ملنے کے لیے گئی۔ خالہ تو ہمیں بڑی محبت سے ملیں۔ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ سلیم بھائی اور نعیم داخل ہو گئے۔ میں دو جوان لڑکوں کو یوں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر گھبرا گئی اور جھٹ دوپٹے سے چہرہ چھپانے لگی۔

"ارے پاگل یہ تو سلیم اور نعیم ہیں تو ان سے بھی پردہ کرے گی۔" خالہ نے زبردستی ہاتھ بڑھا کر میرا دوپٹہ میرے چہرے سے ہٹا دیا۔ مجھے اتنی زیادہ شرم آ رہی تھی کہ میری نگاہیں نہیں اٹھ رہی تھیں۔

"ارے واہ یہ تو بڑی پیاری ہو گئی ہے۔" سلیم نے بے تکلفی سے میرے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ تو سب ہنس پڑے۔

میری نگاہ سلیم بھائی کی جانب اٹھی تو وہ بڑی گہری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ پھر کمرے سے باہر نکل گئے۔

ان دنوں میں بی اے فائنل میں تھی۔ مجھے گھر کے کاموں کے ساتھ ساتھ اپنی پڑھائی پر بھی دھیان دینا پڑتا تھا اس لیے کہیں آنے جانے کا کم ہی ٹائم ملتا تھا۔ البتہ شگفتہ کا گھر کیوں کہ ان کے برابر میں تھا اس لیے وہ ہر وقت وہاں آتی جاتی رہتی تھی۔ ایک دن مجھ سے بولی۔

"تمہیں پتا ہے سلیم بھائی تمہیں بہت پسند کرنے لگے ہیں......؟"

"فضول باتیں مت کرو تمہیں پتا ہے مجھے اس قسم کی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔" میں نے خفگی بھرے لہجے میں کہا۔

"تو اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔ مجھ سے تو سلیم بھائی نے یہ کہا تھا کہ تم سے کہہ دوں۔" اس نے کہا۔

"تو ان سے میری طرف سے کہہ دینا کہ وہ مجھے اچھے نہیں لگتے۔" میں نے کہہ کر بات ختم کر دی اور شگفتہ میرا منہ تکتی رہ گئی۔

میں اس بات کو اچھی طرح سے سمجھتی اور جانتی تھی کہ جوان لڑکے اور لڑکی کے محبت کے کھیل ہوتے گناہ اور بدنامی کے کھیل ہیں میں نے اپنی زندگی کے اتنے اہم فیصلے کا مکمل اختیار اپنے والدین کو سونپ رکھا تھا کہ وہ جس سے بھی چاہیں میرا رشتہ کر دیں۔ مجھے قطعی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

اور پھر ایک سال بیت گیا۔ شگفتہ میرے پاس سلیم بھائی کے پیغام لاتی رہی اور میں مسترد کرتی رہی۔ ایک دن اتفاق سے خالہ کے گھر محفل میلاد تھی۔ میلاد کے بعد ناشتے اور چائے کا انتظام تھا۔

میں بھی منی باجی اور رشیدہ کے ہمراہ کچن میں ہاتھ بٹانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ جب میں نے وہاں سلیم بھائی کو منڈلاتے ہوئے دیکھا۔ انہوں نے اچانک کچن میں آ کر کہا۔

"باجی آپ کو امی بلا رہی ہیں۔"

منی باجی کچن سے چلی گئیں تو سلیم بھائی نے مجھ سے کہا۔

"کیا واقعی میں تمہیں بالکل بھی اچھا نہیں لگتا مگر لگتا ہے تم ایک بار اپنے منہ سے کہہ دو۔"

"یہ کیسی باتیں ہیں۔" میں نے بہت اعتماد سے کہا۔ "اور امید کرتی ہوں کہ آپ آئندہ شگفتہ سے میرے بارے میں کوئی بات نہیں کریں گے۔"

سلیم بھائی نے میری بات سنی اور تیزی سے کچن سے نکل گئے اور تب ہی منی باجی بڑبڑاتی ہوئی کچن میں آئیں کہ امی نے تو مجھے نہیں بلایا تھا۔ یہ سلیم بھی ناں بس ایسے ہی تنگ کرتا ہے۔

اور پھر کچھ دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ سلیم بھائی کو سعودی عرب میں جاب مل گئی ہے وہ جا رہے ہیں اور سلیم بھائی سعودی عرب چلے گئے۔ میں اس دن والے واقعے کے بعد بہت محتاط ہو گئی تھی اور خالہ کے گھر نہیں گئی۔ جب سلیم بھائی سعودی عرب چلے گئے تو میں نے سکون کا سانس لیا اور ان کے گھر ملنے کے لیے گئی۔ کیوں کہ خالہ کی محبت ویسی ہی تھی۔ وہ آج بھی اسی محبت سے ملتی تھیں۔ انہیں دن رات ایک ہی ٹینشن تھی کہ منی کی عمر خاصی ہو گئی ہے اور اس کا کہیں رشتہ نہیں ہوا ہے۔ ویسے بھی زمانہ بہت بدل گیا تھا کہ لوگ اپنے بیٹوں کی جانب تو دیکھتے نہیں ہیں مگر بہو کے نام پر حور پری تلاش کرتے ہیں اور منی باجی تو ویسے ہی کالے رنگ اور بھدے نقوش کی مالک تھیں اوپر سے عمر بھی زیادہ ہو گئی تھی۔

وقت مزید آگے سرک گیا۔ میں نے بی اے کر کے ایم اے میں ایڈمیشن لے لیا۔ میرے رشتے تو بہت آ رہے تھے مگر امی نے ابھی تک کسی کے لیے ہاں نہیں کی تھی۔

سال بھر گزرنے کے بعد سلیم بھائی ایک ماہ کی چھٹی پر گھر آئے واپسی میں وہ اپنے ساتھ کافی چیزیں لے کر آئے۔ الیکٹرانک کا بہت سارا سامان تھا جو ابھی تک خالہ کے گھر میں نہیں تھا۔ سلیم بھائی چھٹی پر آئے تو خالہ بھی مجھے ان کے گزشتہ عادات میں کوئی زیادہ تبدیلی نظر نہیں آئی تھی۔

خالہ نے سارا سامان سارے محلے والوں کو خوشی خوشی دکھایا کہ یہ میرا سلیم لایا ہے۔ منی باجی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "سلیم یہ سارا سامان میرے جہیز کے لیے لایا ہے۔"

اس ایک ماہ کے دوران جب تک سلیم بھائی یہاں رہے میں نے خالہ کے گھر جانے سے گریز کیا۔ مگر اب ایک بہت واضح تبدیلی خالہ اور ان کے گھر والوں کے رویے میں آئی اور سب نے ہی محسوس کی وہ یہ تھی کہ پہلے خالہ کے گھر کا دروازہ جو ہمیشہ کھلا رہتا تھا اب بند رہنے لگا تھا اور خالہ نے بھی محلے میں آنا جانا کم کر دیا تھا۔ سلیم بھائی واپس سعودی عرب چلے گئے۔

پھر انہوں نے اپنا مکان جو دو کمروں پر مشتمل تھا تڑوا کر دوبارہ بنوانا شروع کر دیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں خالہ نے ڈبل منزلہ مکان بنوالیا۔ بقول ان کے گلی میں سب سے شاندار گھر میرا ہی ہے۔

گھر میں ہر طرح کا فیشن کا سامان بھی آ گیا اور خالہ اور ان کے گھر والے سارے محلے والوں سے کٹ گئے۔ خالہ کی زبان جس پر سب کے لیے چاشنی ہی گھلی رہتی تھی۔ اب بہت تلخ ہو کر نفرت بھرے لہجے میں بات کرتی تھیں۔ اس بات کو محسوس کر کے سب نے

ہی ان کے گھر جانا ختم کر دیا کہ دولت آنے کے بعد ان لوگوں کا اخلاق بھی ختم ہو گیا ہے۔

میں نے ایم اے فائنل کا آخری پیپر دیا ہی تھا کہ میرے تایا اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر آ گئے اور جھٹ پٹ میری شادی ہو گئی۔

میں اپنی لائف میں مصروف ہو گئی پھر جب بھی امی کے گھر آتی تو سارے محلے کی خبریں ملتی تھیں۔ مجھے پتا چلا کہ سلیم کی شادی ہو رہی ہے۔ خالہ نے حیدر آباد میں اپنے رشتہ داروں میں ان کا رشتہ طے کر دیا ہے۔

خالہ نے میرے گھر سلیم بھائی کی شادی کا کارڈ بھی نہیں بھیجا۔ اس لیے میں نے ان کی دلہن کو بھی نہیں دیکھا۔ سنا تھا بڑی لکھی پڑھی اور خوب صورت ہے اور چار بھائیوں کی اکلوتی بہن ہے۔ خالہ نے بڑی دھوم دھام سے شادی کی تھی اور ولیمہ ایک بڑے ہوٹل میں کیا تھا۔

منی باجی ابھی تک گھر بیٹھی تھیں ان کا رشتہ کہیں نہیں ہوا تھا۔ میں بھی اپنے گھر اور بچوں میں مصروف ہو گئی۔ امی کے گھر بھی کم ہی آنا ہوتا تھا۔ کافی عرصہ تک مجھے خالہ کے گھر کے بارے میں بات کرنے کا خیال ہی نہیں آیا۔

اب جو باتیں میں بتانے والی ہوں وہ رفتہ رفتہ مجھے معلوم ہوئیں۔ جنہیں قارئین کی دلچسپی کی خاطر میں تواتر کے ساتھ بیان کروں گی۔

سلیم بھائی سعودی عرب میں ہی تھے اور ان کی بیوی پاکستان میں اپنے سسرال میں رہتی تھیں۔ منی باجی کیوں کہ ابھی خاصی عمر ہوئی تھی اور ان کی شادی نہیں ہوئی تھی شاید اسی لیے ان کے دل میں اپنی بھابی کے لیے جلن سی پیدا ہو گئی۔ خاص طور پر جب سلیم بھائی کے ہاں پہلے بیٹے کی پیدائش ہوئی تب وہ پاکستان آئے بیوی اور بیٹے کے لیے بہت کچھ لے کر

آئے۔ یہاں لوگوں کو برداشت نہیں ہوا کہ پہلے تو سلیم کا پیسا سارا پیار ساری چیزیں ہمارے لیے ہی ہوتی تھیں۔ اب اس میں سلیم کی بیوی رخسانہ بھی حصہ دار بن گئی ہے۔ وہ شوہر کی لائی ہوئی جیولری اور کپڑے روزانہ شوہر کو پہن کر دکھاتی۔ گھومنے پھرنے جاتی پھر سلیم بھائی نے کہا کہ حیدر آباد میرے ساتھ چلو۔ کیوں کہ بچے کی پیدائش کے بعد جب پانچ ماہ ہو چکا تھا رخسانہ بھابی اپنے میکے نہیں گئی تھیں۔ رخسانہ بھابی نے اپنے گھر والوں سے یہی کہا تھا کہ سلیم پاکستان آئیں گے تو ان کے ساتھ ہی آؤں گی۔

بنیادی طور پر وہ بہت شریف لوگ تھے۔ بچے کی پیدائش پر وہ لوگ کراچی آئے تھے تب بھی خالہ وغیرہ نے ان لوگوں سے سیدھے منہ بات نہیں کی تھی اور باتوں باتوں میں یہ بھی جتا دیا تھا کہ ہمیں وہ لوگ بالکل پسند نہیں ہیں جو کسی بھی بہانے سے بہن بیٹی کے سسرال میں آ کر بیٹھ جائیں۔ خالہ کے منہ سے یہ سن کر وہ لوگ فوراً ہی واپس چلے گئے۔ خالہ نے رخسانہ بھابی کو بھی میکے جانے نہیں دیا۔

خالہ اور منی باجی بچے سے کھیلتے رہتے رات کو اسے اپنے پاس ہی سلاتے اور سارا گھر رخسانہ بھابی ہی سنبھالتیں۔ حالانکہ خالہ کے پاس اتنا پیسا تھا کہ وہ ایک جز وقتی ملازمہ با آسانی رکھ سکتی تھیں مگر ان کا کہنا یہ تھا کہ "بہو کی صورت چاہے پیاری ہو یا پیاری نہ ہو گر کام پر لگاؤ۔ یہ گھر تو اسے ہی سنبھالنا ہے۔ رہی بات بیٹیوں کی تو انہیں تو دوسرے گھر جانا ہے۔ وہ تو یہاں چند دنوں کی مہمان ہیں۔"

سلیم بھائی ایک ماہ بعد واپس سعودی عرب چلے گئے اور جاتے جاتے بھابی کی کوکھ میں دوسرا بچہ دے گئے۔

ایسی حالت میں بھی بھابی سارا دن گھر کا کام کرتی

رہتیں۔ ان کی خوراک کا بھی خیال نہیں رکھا گیا۔ لازمی بات ہے کہ وہ بہت کمزور ہو گئیں۔ حالانکہ جس کمائی پر خالہ اور ان کے گھر والے عیش کر رہے تھے وہ سارا پیسا سلیم بھائی ہی کا تھا اور اس پیسے پر سارا کنٹرول خالہ ہی کا تھا۔

دوسرا بیٹا پیدا ہوا تو حیدر آباد سے ان کے بھائی کا فون آیا کہ وہ رخسانہ کو لینے کے لیے آ رہے ہیں۔ بھابی سوا مہینہ بھی نہیں ہوا تھا کہ انہوں نے اپنے بھائی کو بلا لیا۔ بھابی بہت خوش بھی تھیں اور حیران بھی کہ امی انہیں بھیجنے پر راضی کیسے ہو گئیں۔

اور جب ان کے بھائی آئے تو خالہ نے کہا۔ "ٹھیک ہے تم رخسانہ کو لے جاؤ، بڑے شوق سے اسے اپنے ساتھ لے جاؤ، مگر میرے بچے میرے پاس ہی رہیں گے۔" ان کا اشارہ رخسانہ بھابی کے بچوں اور اپنے پوتوں کی جانب تھا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔ کیا مطلب ہے آپ کی اس بات کا کہ بچے آپ کے پاس رہیں گے۔ وہ دونوں ابھی بہت چھوٹے ہیں۔ رخسانہ کے بغیر کیسے رہیں گے اور خود رخسانہ ان دونوں کے بغیر کیسے رہے گی۔" رخسانہ بھابی کے بھائی نے چونک کر کہا۔

"بھئی صاف بات ہے ہم سب ان بچوں کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ میکے میں جا کر رخسانہ تو تم سب میں مگن ہو جائے گی اور اگر اس کی بے پروائی سے میرے بچوں کو کچھ ہو گیا تو؟ اس لیے میں بچوں کو رخسانہ کے ساتھ بھیجنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی۔" خالہ نے صاف صاف کہہ دیا۔

"آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں، ہمارے گھر میں اور بھی بچے ہیں اور ہمیں بچوں کا خیال رکھنا آتا ہے۔" رخسانہ بھابی کے بھائی نے کہا۔

"تم اپنے بچوں کا خیال رکھو گے ناں...! ابھی دوسرے کی اولاد ہے تمہیں کیا پڑی۔ میں منع تھوڑی کر رہی ہوں رخسانہ کو۔ تمہاری بہن ہے جتنے دن چاہے میکے میں رہے مگر میرے بچے اپنی دادی دادا کے پاس رہیں گے۔" خالہ نے کہا۔

"ٹھیک ہے بھائی آپ جائیں امی بچوں کو میرے ساتھ بھیجیں گی نہیں اور میں بچوں کے بغیر جاؤں گی نہیں۔"

رخسانہ بھابی نے اپنے بھائی کو یہ سوچ کر منع کیا کہ شاید خالہ کو کچھ خیال آ جائے مگر وہ تو رخسانہ بھابی کا جواب سن کر خوش ہو گئیں اور ان کے بھائی بہن اور بھانجوں کو لیے بغیر حیدر آباد چلے گئے۔

سال بھر کی چھٹیوں پر سلیم بھائی پاکستان آتے ہی تھے مگر اس مرتبہ جب چھٹی ملنے کا ٹائم آیا تو خالہ اور خالو نے کہا کہ تم اس مرتبہ پاکستان مت آؤ اور ہمیں عمرے پر بلوا لو۔

اور سلیم بھائی نے ایسا ہی کیا وہ پاکستان نہیں آئے اور اپنے والدین کو عمرہ ادا کرنے کے لیے بلوا لیا۔ جاتے جاتے وہ رخسانہ بھابی کو تنبیہہ کر کے گئیں کہ میرے بعد گھر کا خیال رکھنا یہ نہ ہو کہ میری غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر بچوں کو لے کر ماں کے گھر چل دینا۔

رخسانہ بھابی نے خالہ کی غیر موجودگی میں گھر کا خیال رکھا۔ ایک ماہ بعد وہ لوگ واپس آ گئے۔ رخسانہ بھابی شوہر سے ملنے کی آس میں مزید ایک سال انتظار کرنے لگیں۔ سلیم بھائی کو نہیں معلوم تھا کہ رخسانہ بھابی اتنے عرصے سے میکے نہیں گئی ہیں۔ کیوں کہ وہ تو تنہائی میں شوہر سے فون پر بات کر سکتی تھیں اور نہ ہی ان کے نام کوئی خط لکھ سکتی تھیں۔ سلیم بھائی اپنے والدین کے نام خط لکھتے تھے اور اسی خط میں سب کو مخاطب کر لیتے تھے۔

دو سال کے بعد سلیم بھائی پاکستان آئے تب ایک رات چپکے سے رخسانہ بھابی نے انہیں بتایا کہ وہ کافی عرصے سے حیدر آباد نہیں گئی ہیں۔ انہوں نے کہا۔ "آپ مجھے حیدر آباد لے چلیں امی اور بہنوں سے بھی مل آؤں گی۔" سلیم بھائی نے کہا کہ چلو ہو آتے ہیں۔ انہوں نے اپنی امی کو بتایا کہ وہ رخسانہ بھابی کے ساتھ حیدر آباد جا رہے ہیں اس پر خالہ نے کوئی جواب نہیں دیا مگر جب چلنے کا وقت آیا تو خالہ نے بچوں کو ساتھ بھیجنے سے صاف انکار کر دیا۔ انہوں نے سلیم بھائی سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں ان بچوں کے بغیر ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتی۔ اگر تم میری موت چاہتے ہو تو اپنے بچوں کو لے جاؤ۔ تمہاری اولاد ہے میری تو تھوڑی ہے۔"

سلیم بھائی نے رخسانہ بھابی کو سمجھایا کہ چلو ہم دونوں اکیلے ہو آتے ہیں مگر رخسانہ بھابی نے صاف انکار کر دیا۔ وہ دو سالوں سے نہ تو اپنے میکے گئی تھیں اور نہ ہی وہاں سے کوئی آیا تھا۔ بس کبھی کبھار فون پر بات ہو جاتی تھی مگر سب کے درمیان میں بیٹھ کر۔

اس مرتبہ بھی جب سلیم بھائی واپس گئے تو رخسانہ بھابی تیسرے بچے کی ماں بننے والی تھیں اور پھر اسی طرح پورے چھ سال بیت گئے۔ رخسانہ بھابی کے چار بیٹے ہو گئے۔ منی باجی کی عمر خاصی ہو گئی تھی۔ ہم لوگوں کے سامنے کے بچے تھے ہمارے بچے بھی بڑے ہو رہے تھے۔ نعیم بھی اپنی تعلیم مکمل کر کے جاب کر رہا تھا اور اس نے خود اپنے منہ سے کہنا شروع کر دیا تھا کہ اس کی شادی کر دی جائے کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ امی نے سلیم بھائی کی شادی تو کر دی ہے مگر اس کی شادی وہ اس وقت تک نہیں کریں گی جب تک منی باجی کی شادی نہیں ہو گی اور منی باجی کی شادی ہونا تقریباً ناممکن ہے۔

ادھر خالہ نے ایک ترکیب سوچی اور رشتے کروانے والی ایک عورت سے کہا ہم وٹے سٹے میں شادی کرنا چاہتے ہیں۔ کسی ایسے گھرانے کی بہو تلاش کرو جس کا بھائی ہو اور وہ میری بیٹی کو بیاہ لے۔

بالآخر دنوں میں وہ عورت ایک ایسے گھر کا رشتہ لے آئی جن کی لڑکی بھی منی باجی کی طرح گھر بیٹھی تھی اور جس کی عمر بھی زیادہ تھی۔ شکل و صورت میں بھی وہ منی باجی کی طرح ہی تھی۔ البتہ اس کا بھائی نعیم کے مقابلے میں شکل و صورت میں اور تعلیم اور جاب میں اچھا تھا۔

دونوں کے بھائیوں نے اپنی اپنی بہنوں کے لیے قربانی دی اور وٹے سٹے کے رشتے کو قبول کر لیا۔ خالہ بہت زیادہ خوش تھیں کہ ان کی بیٹی کا گھر بس رہا ہے۔

شادی بخیر و خوبی انجام پائی۔ جس گھر میں منی باجی اور نعیم کا رشتہ ہوا تھا وہ ایک شریف خاندان تھا اور نعیم کی بیوی عائشہ بھی ایک نیک، سمجھ دار اور سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔

منی باجی کے شوہر جب بھی اپنے سسرال آتے رہتے تھے۔ وہ یہ دیکھتے تھے کہ رخسانہ بھابی بہت خاموش اور اداس اداس رہتی ہیں۔ وہ زیادہ کسی سے بات چیت بھی نہیں کرتیں بس گھر کے کاموں میں لگی رہتی ہیں۔ اتنا پیسا ہونے کے باوجود گھر میں اوپر کے کاموں کے لیے کوئی ماسی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ منی باجی کی چھوٹی بہن رعنا بھی پچیس سال کی تھی اور سارا دن گھر پر بس ٹی وی یا وی سی آر پر ہندوستانی فلمیں دیکھتی رہتی ہے۔ گھر کے کاموں میں بھابی کا ہاتھ نہیں بٹاتی۔ انہوں نے یہ بات منی باجی سے کی تو انہوں نے بڑے لاڈ سے کہا۔ "رعنا ابھی چھوٹی ہے وہ کیوں کام کرے۔ رخسانہ ہے ناں کام کرنے کے لیے۔ بہو ہوتی ہی کس کام کے لیے ہے۔" منی باجی کے شوہر جہان نے یہ بھی اندازہ لگایا کہ رخسانہ بھابی

بھی اپنے میکے نہیں جاتیں اور نہ ہی ان کے میکے سے کوئی ان سے ملنے کے لیے آتا ہے اور جب یہ بات انہوں نے منی باجی سے پوچھی تو وہ یہ کہہ کر بات کو ٹال گئیں کہ ہمیں کیا پتا کہ وہ میکے کیوں نہیں جاتیں۔ خود ان کا دل ہی نہیں چاہتا ہوگا ہم پابندی تھوڑی لگاتے ہیں۔

منی باجی کی شادی کو سال بیت گیا اور اللہ نے دونوں بہن بھائیوں کو ایک ایک بیٹی سے نوازا اتفاق منی باجی کو اسپتال سے سیدھے اپنے گھر لے گئیں اور اپنی بہو کو ان کے میکے بھجوا دیا۔ منی باجی کی دن رات کی خدمت رخسانہ بھابی کے ذمے تھی۔ اس دوران بھی ریحان بھائی گھر آتے رہتے تھے۔ ان کی بیوی اور بچی جو یہاں تھی۔

ایک دن ریحان بھائی گھر آئے تو معلوم ہوا کہ خالہ منی باجی کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گئی ہوئی ہیں۔ رضا بھی گھر پر نہیں تھے۔ اس لیے لامحالہ رخسانہ بھابی ریحان کو چائے دے کر ان کے پاس باتیں کرنے بیٹھ گئیں۔ تب موقع سے فائدہ اٹھا کر ریحان بھائی نے رخسانہ بھابی سے بات چھیڑ دی اور کہا کہ سچ بتائیے کیا آپ اپنے میکے میرا مطلب ہے کیوں نہیں جاتیں اور آپ کے گھر سے کوئی یہاں نہیں آتا۔ تب بھابی نے انہیں ساری بات سچ سچ بتادی اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ امی ابا نے سلیم کے پاکستان ہر سال آنے پر بھی پابندی لگا دی ہے کہ اس طرح آنے میں بہت خرچ ہوتا ہے۔ ابھی وہ بہن بھائی کی شادی ہوئی ہے۔ رضا بھی باہر ہے اس لیے تین سال ہو گئے ہیں سلیم بھی پاکستان نہیں آئے ہیں۔ میرے میکے سے کوئی اس لیے نہیں آتا کہ امی کو برا لگتا ہے۔"

ریحان بھائی کو یہ سب باتیں سن کر بے حد افسوس اور دکھ ہوا۔ اپنی ساس کی چال بازیاں تو وہ دیکھ ہی رہے تھے کہنے لگے۔

"بھابی آپ فکر نہ کریں میرے پاس ایک ترکیب ہے جس سے ان لوگوں کو سیدھا کر دیں گے۔"

رخسانہ بھابی یہ سن کر گھبرا گئیں اور اپنے ہاتھوں کو ریحان بھائی کے آگے جوڑتے ہوئے بولیں۔

"نہیں نہیں ریحان بھائی آپ کو اللہ کا واسطہ آپ امی سے کچھ نہیں کہیے گا۔ اگر انہیں اس بات کا پتا چل گیا تو وہ اور بھی میرے ساتھ برا سلوک کریں گی۔"

"ارے بھابی آپ بالکل بھی فکر نہ کریں۔ آپ کی جانب تو ان کا دھیان ہی نہیں جائے گا۔ میں بھی ان کی ترکیب ان ہی کے اوپر آزماؤں گا۔ پھر یہ لوگ خود ہی سدھر جائیں گے۔"

عائشہ اور رخسانہ بھابی میں بہت اچھی انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ دونوں اپنے دکھ سکھ ایک دوسرے کو بتادیا کرتی تھیں۔

ادھر گھر جا کر ریحان بھائی نے وہ ساری باتیں اپنی امی اور بہن عائشہ کو اعتماد میں لے کر بتادیں اور عائشہ سے یہ بھی کہا کہ میں جانتا ہوں کہ میں جو کچھ کرنے والا ہوں اس کے بعد تمہاری ساس کا رویہ تمہارے ساتھ خراب ہوگا مگر تم تھوڑا برداشت سے کام لینا۔ اگر تمہاری تھوڑی سی تکلیف اٹھانے سے کسی کا بھلا ہو جائے تو یہ تکلیف برداشت کرو۔ اللہ تمہیں اس کا اجر دے گا۔"

عائشہ تو ویسے بھی رخسانہ بھابی کا حشر دیکھ ہی رہی تھی۔ اس نے بھی اپنے بھائی کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا اور گھر آ کر ساری بات رخسانہ بھابی کو بھی بتادی۔

سوا مہینے کے بعد منی باجی اپنے سسرال اور عائشہ اپنے سسرال آ گئی۔ ریحان بھائی کے کہنے پر ان کی امی نے منی باجی کی بیٹی کو اپنے پاس رکھ لیا اور گھر کے سارے کاموں کی ذمہ داری منی باجی کی لاڈلی اور

گھر میں کام کرنے والی ماسی کو بھی نکال دیا۔

منی باجی نے اس پر شور مچایا تو ان کی امی نے انہیں وہی جواب دیا جو خالہ نے رخسانہ بھابی کو دیا تھا۔ وہ کہنے لگیں۔

"بی بی ہم نے تمہارے بہت ناز اٹھا لیے۔ ایک بچی ہو گئی ہے اب کب تک ماسی رکھی ہوئی رہے گی۔ بہتر یہی ہے کہ تم گھر کے کام سنبھالو اور بچی کو میں سنبھالوں گی۔"

منی باجی نے اپنے دل میں سوچا کہ کوئی بات نہیں ان کی بہن بھی تو میرے گھر میں ہے میں گھر جا کے امی کو ساری بات بتاؤں گی کہ وہ عائشہ کے ساتھ بھی وہی سلوک کریں جو یہاں میرے ساتھ ہو رہا ہے۔" منی باجی جب اپنے گھر جانے لگیں تو ان کی ساس نے کہا۔ "تم اکیلی جاؤ اپنی بچی کو میں تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گی۔"

منی باجی ساس کی بات سن کر بری طرح چونک گئیں اور کچھ سوچنے لگیں۔ پھر بولیں۔ "میں اپنی بچی کے بغیر نہیں جاؤں گی۔"

"نہیں جاؤ گی تو مت جاؤ۔ میں نے تمہیں نہیں روکا ہے۔ مگر میں اپنی پوتی کو ایک منٹ بھی اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دوں گی۔"

منی باجی اپنے گھر نہیں گئیں اور وقت گزار لیا۔ رات کو جب ریحان بھائی گھر آئے تو انہوں نے اپنی ساس کی شکایت اپنے شوہر سے کی تو وہ ہنس کر بولے۔

"ارے تو اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے تم بھول گئیں تمہارے گھر کا طریقہ یہی ہے۔"

"کیا مطلب ہے اس بات کا.....؟ آپ نے یہ سب کس سے کہا؟ کیا رخسانہ نے.....؟" منی باجی نے اٹک اٹک کر سہمے لہجے میں کہا۔

"ارے وہ بے چاری اللہ میاں کی گائے ہیں۔ وہ

میرا ہاتھ

میرا ہاتھ
تھکنے لگتا ہے
جب بھی
تیرے کھونے کے
خوف میں
ڈوبنے لگتا ہے
کسی وعدے
میرا ہاتھ
تھکنے لگتا ہے
جب تو
تھکنے لگتا ہے
تجھ کو تیرے ساتھ
وہ ملاقات
وہ دو ساعتی رات
وہ جب تم نے
تھام کے میرا ہاتھ
چوم کے کہا تھا
تمہیں تیرے ساتھ
مرنے کے ساتھ
تجھ کو ہی دکھتا ہے
میرا ہی ہاتھ

(انشاء عابد ——— محمد پور)

کہاں کسی سے کچھ کہتی ہیں؟ مگر محترمہ ہم بھی تو وہ آنکھیں اور عقل رکھتے ہیں۔ سب کچھ دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔"

منی باجی دوسرے دن تنہا ہی اپنی امی کے گھر گئیں۔ خالہ انہیں بچی کے بغیر دیکھ کر حیران رہ گئیں اور پوچھا کہ میری گڑیا کہاں ہے؟"

منی باجی نے رو رو کر ساری داستان ظلم سنادی تو خالہ تپ کر بولیں۔

"تو کیوں فکر کرتی ہے تیرا بدلہ لینے کے لیے عائشہ ہے نا میرے پاس میں تو اس کا اس لیے خیال رکھتی تھی کہ تو اس کے بھائی کے گھر میں ہے۔ اگر تیرے ساتھ وہاں اچھا سلوک نہیں ہوگا تو اس کے

ساتھ بھی میں وہی کچھ کروں گی۔"

پھر جب عائشہ اپنے میکے جانے لگی تو خالہ نے اسے بچی کو لے جانے نہیں دیا۔ عائشہ نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور گھر آ گئی۔

یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا۔ عائشہ تو عرصے سے گھر آ جاتی تھی۔ کیوں کہ رخسانہ بھابھی اس کی بچی کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ مگر منی باجی کو یہ سوچ کر قرار نہیں آتا تھا کہ میں گھر میں نہیں ہوں تو وہی گھر کے کاموں میں لگ جاتی ہیں اور میری بچی رو رو کر ہلکان ہو جاتی ہے۔ اس لیے انہوں نے میکے آنا چھوڑ دیا۔

اب خالہ دن رات بے چین رہنے لگیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ عائشہ سے یہ کہہ نہیں سکتی تھیں کہ تم اپنے ساتھ اپنی بچی کو بھی لے جاؤ' کیوں کہ رخسانہ بھابھی کو ابھی تک انہوں نے روک رکھا تھا۔

ریحان بھائی نے ایک کام اور کیا اور وہ یہ کہ انہوں نے سلیم بھائی کو سعودی عرب فون کیا اور سارے حالات بتانے کے بعد گزارش کی کہ وہ پاکستان آ جائیں اور یہاں کے حالات سنواریں۔ کیوں کہ ابا کو تو وہ کبھی رہے تھے کہ ابا وہی کہتے اور سنتے ہیں جو امی کہتی ہیں۔

سلیم بھائی کو سعودیہ گئے تین سال ہو چکے تھے۔ وہ خود بھی بیوی اور بچوں کے لیے بہت بے چین تھے۔ اب جب ریحان بھائی نے یہ حالات بتائے تو ان کا ایک دن بھی دل نہیں لگا۔ انہوں نے سوچا کہ میں اب تک اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں کے لیے ہی سب کچھ کرتا تھا۔ بیوی کو کیا دیا؟ سوائے اس کے کہ ایک ماہ کے لیے اس کے پاس جاتا اور ایک بچے کا تحفہ دے کر آ جاتا۔ وہ کن حالوں میں جی رہی ہے کیا سوچتی ہے میں نے کبھی اس بارے میں نہیں سوچا۔

انہوں نے وہاں اتنے عرصے میں کافی پیسا جمع کر لیا تھا۔ اس لیے فیصلہ کیا کہ یہاں سے جاب چھوڑ کر پاکستان میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ بقیہ زندگی گزاروں گا۔ آمدنی کم بھی ہو گی تو کیا ہوا بیوی بچے تو پاس رہیں گے۔ ان کی جاب ایسی تھی کہ وہ بیوی بچوں کو اپنے پاس سعودی عرب نہیں لے جا سکتے تھے اور پھر اس طرح وہ دو گھروں کا خرچ چلاتے تو بچت ایک پائی کی بھی نہیں ہوتی۔

وہ بغیر اطلاع کے جاب چھوڑ کر ایک دن اچانک پاکستان آ گئے۔ گھر میں داخل ہوئے تو رخسانہ بھابھی کو دیکھ کر گنگ سے رہ گئے۔ میں جھاڑو سنبھالے ہوئے۔ دیکھا ایک منٹ تک تو وہ انہیں پہچان ہی نہ سکے۔ کہاں تو وہ اتنی خوب صورت بیوی کو چھوڑ کر گئے تھے اور کہاں یہ انتہائی کمزور اور لاغر عورت جس کا گورا رنگ جھلس کر سانولا ہو گیا تھا۔ خوب صورت آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔

"رخسانہ...؟" انہوں نے شاکڈ لہجے میں ان کا نام پکارا اور رخسانہ بھابھی نے جیسے ہی انہیں دیکھا تو جیسے ان کے ضبط کے سارے بندھن ایک ساتھ ہی ٹوٹ گئے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں گھورتی رہیں۔ پھر ان پھٹی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور جیسے ہی سلیم بھائی ان کی جانب بڑھے وہ بے ہوش ہو کر ان کے بازوؤں میں جھول گئیں۔

ڈاکٹر نے ان کے چیک اپ کے بعد بتایا کہ وہ شدید جسمانی کمزوری کا شکار ہیں۔

گھر آ کے سلیم بھائی نے اپنے امی ابا کو بٹھا کر بات کی۔ بات کیا کی شکایت کی کہ انہوں نے ان کی بیوی کا کیا حال کر دیا ہے۔

خالہ حیران تھیں کہ سلیم کو یہ ساری باتیں کس نے بتائیں۔ وہ یہی سمجھیں کہ کسی ذریعے سے رخسانہ ہی

نے یہ باتیں سلیم تک پہنچائی ہیں اس لیے بولیں۔

"بیٹا تم سے رخسانہ نے جھوٹ بولا ہے ایسی کوئی بات نہیں۔"

"امی رخسانہ سے تو میری ابھی تک کوئی بات ہوئی ہی نہیں ہے۔ وہ تو کمرے میں سو رہی ہے۔ ڈاکٹر نے اسے نیند کا انجکشن دیا ہے۔ آپ کو ابھی تک اندازہ نہیں ہوا کہ رخسانہ کے اور اس کے ماں باپ کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ منی باجی سے پوچھیں کیا وہ اپنے گھر میں خوش ہیں۔ کیا منی باجی کے اس دکھ کو لے کر آپ اور ابا خوش ہیں نہیں ہیں... تو پھر آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں۔ اس کام کا کیا فائدہ جس سے کوئی دکھی ہو۔ امی ساری خوشیاں ہمارے اپنے ہاتھوں میں ہیں۔ ہم تو خود اپنے برے طرز عمل اور خراب رویے سے دوسروں کو بھی دکھ دیتے ہیں اور خود بھی خوشیوں سے محروم رہتے ہیں۔"

خالہ اور خالو بالکل خاموش بیٹھے تھے۔ اسی وقت ریحان بھائی آ گئے اور انہوں نے بھی اس گفتگو میں حصہ لیا اور بولے۔

"سلیم کو یہاں میں نے ہی سارے حالات بتا کر بلایا ہے۔ مجھ سے رخسانہ بھابھی کی حالت نہیں دیکھی جاتی تھی اور عائشہ کو بھی میں نے ہی منع کیا تھا کہ وہ (منی باجی) کے ساتھ وہی سلوک کریں تاکہ آپ کو اپنی ان زیادتیوں کا احساس ہو جو آپ رخسانہ بھابھی کے ساتھ کرتی رہی ہیں۔"

خالہ نے یہ سب سن کر خالہ بہت شرمندہ ہوئیں اور روتے ہوئے بولیں۔

"ہاں میں اقرار کرتی ہوں کہ میں نے یہ سب کیا ہے۔ میرا اللہ مجھے معاف کرے اور میرے بچو تم لوگ بھی مجھے معاف کر دو۔ میں رخسانہ اور بچوں کو لے کر خود حیدرآباد جاؤں گی اور اس کے ماں باپ سے معافی مانگوں گی۔"

اور پھر ایک ہفتے کے بعد خالہ، رخسانہ بھابھی، سلیم بھائی اور بچے حیدرآباد گئے اور وہ تین دن کے بعد خالہ اور سلیم بھائی واپس آ گئے۔ رخسانہ بھابھی پندرہ دن رہنے کے بعد واپس آ گئیں۔

سلیم بھائی نے یہاں اپنا بزنس شروع کر دیا۔ رعنا کی مزید تعلیم جاری تھی اس لیے اتفاق سے ان ہی خاتون نے جنہوں نے منی باجی کا رشتہ لگوایا تھا رعنا کا رشتہ لے کر آ گئیں۔ وہ ایک ڈاکٹر تھا۔ جس کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا اور دونوں بچوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ خالہ نے اس رشتے پر اعتراض کیا مگر سلیم بھائی اور خالو نے کہا۔ "اس سے اچھا رشتہ نہیں مل سکتا۔" اس لیے رعنا کی بھی شادی کر دی۔

خالو کا انتقال ہو چکا ہے خالہ اب بہت بوڑھی ہو چکی ہیں۔ مگر اب وہ اپنی دونوں بہوؤں سے بہت خوش ہیں اس لیے کہ دونوں ان کی بہت خدمت کرتی ہیں۔ سب کے بچے جوان ہو چکے ہیں۔ سلیم بھائی نے اپنے بڑے بیٹے کی منگنی منی باجی کی بیٹی سے کر دی ہے۔

آج یہ گھرانہ ایک خوش حال اور آسودہ زندگی گزار رہا ہے۔ اس روز اگر خالہ فوراً ہی اپنی غلطی بلکہ گناہ کہنا چاہیے اس کا اعتراف کر کے اس کا ازالہ نہ کرتیں تو سب کچھ تنکوں کی طرح بکھر جاتا۔ ریحان بھائی کی عقل مندی نے ایک گھرانے کو تباہ ہونے سے بچا لیا۔

آج اگر ہم ناخوش ہیں تو سب سے پہلے اپنے اعمال کا جائزہ لینا چاہیے کہ کہیں ہم تو غلطی پر نہیں ہیں...؟؟

کینہ پرور

محترم عمران احمد قریشی
السلام علیکم!
ایک طویل وقفہ کے بعد ایک سچی کہانی کے ساتھ حاضر ہوں۔ ہمارے معاشرے میں آج کل خواتین کے حقوق اور آزادی کی بات بہت زور و شور سے کی جاتی ہے مگر حقیقت میں دیکھا جائے تو عورت ہی عورت کے حقوق غصب کرتی ہے وہ ساس ہو یا ... کا حق پامال کرتی ہے اگر وہ خود ایک دوسرے کا احترام کریں تو بہت سے مسائل از خود حل ہو جائیں۔

والسلام
نمرہ جمیل
حیدرآباد

"وہ میکے کی باندی پھوپی کہتے کی ذات پہچانی گی۔" رضیہ بیگم تو اب شروع ہو چکی تھیں اور ان کو چپ کروانے والا اس گھر تو کیا اس روئے زمین پر کوئی نہیں تھا۔ بس اللہ ہی "کرتا ہوش کرا تا تو کرتا۔" وہ مسلسل حنا اور اس کے خاندان کی شان میں رطب اللسان تھیں۔ "کم ذات بدذات تو نے کیا بھی کھانا نہیں دیکھا جو اس طرح ٹوٹ کر کھانے پر پڑی ہے۔"

"مگر امی میں نے تو....." حنا نے فریاد کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ رضیہ بیگم بھڑک گئیں اور اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور ہاتھ سالن کی پلیٹ میں نوالہ پکڑے اور دوسرے ہاتھ میں روٹی دبی ہوئی دورسے ان کی اور اب رضیہ بیگم نہ صرف اس کو بلکہ اس کے سارے خاندان کو رگید رہی تھیں۔ حتیٰ الامکان وہ اس کے ساتھ ساتھ ان کو بھی طرح طرح کی شکلیں بنا بنا کر اور منہ بگاڑ بگاڑ کر ذکر کر رہی تھیں۔ ان کی چیخ پکار سن کر دھڑا دھڑ دروازے کھلے اور تینوں بیٹے کمرے سے باہر نکل آئے پھر میں گھر کے مرد اور عورتیں ان کے ارد گرد صورت حال معلوم کرنے کے لیے کھڑے تھے۔

"ارے آخر ماجرا کیا ہے؟ اب کیا کیا ہے اس کم بخت نے جو آپ نے پورے گھر کو حیران پریشان کر کے ان کا ذہنی سکون لوٹ لیا ہے۔" خالد بھائی تو انگارہ بنے ہوئے تھے۔ مزید آتش فشاں بنے رضیہ بیگم سے بدتمیزی سے بولے۔ "ایک دن تو پورے گھر میں اس کا وجود کھٹکتے ہوگا ہے بگاڑ جائے جو حوصلہ اور کسی بھی دیتے تھے۔"

"کسے اب جھگڑ میں سب کو دے والا بچی تو زرا دبے پاؤں کچن میں جا کر پھوپیاں بڑب کرتی ہے کمینی کی اولاد جبکہ صبح بھی کافی کچھ ٹھونس چکی ہے۔" انھوں نے صریحاً جھوٹ بولتے ہوئے کہا اور تقریباً بھاگتے ہوئے جا کر حنا کے ہاتھ سے روٹی چھین سالن کی پلیٹ جھٹکنے سے لے کر اسے اس زور سے دھکا دیا کہ وہ کھڑے قد سے کچن سے باہر جا گری۔ گرتے ہوئے برآمدے کے ستون سے سر ٹکرایا اور قریب پڑے رضیہ بیگم کے تخت کے کونے سے ٹکرا کر اس کی پیشانی بھی لہولہان ہو چکی تھی۔ حنا کی چیخ سن کر لان میں کام کرتی ہوئی ماسی حاجرہ تقریباً بھاگتی ہوئی حنا کی جگہ قریب حنا سے فرداً کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔ ماسی حاجرہ حنا کو بے سدھ اور خون کو بہتے دیکھ کر حواس ہوگئی۔ وہ دراصل حنا کے انتظار میں تھی جس کو اس کے ساتھ ان

کی صفائی میں ہاتھ بٹانے کا حکم دے کر رضیہ بیگم تخت پر لیٹ چکی تھیں۔ کام کے دوران پیٹ کی آنتیں بے حال ہو کر ماسی حاجرہ کے مشورہ پر اپنی بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر تھوڑا سا کھانا لے کر کھانے ہی لگی تھی کہ وہ حکم کرنے کی آواز سن کر رضیہ بیگم اٹھ گئیں اور انھوں نے واویلا شروع کر دیا۔

درحقیقت حنا گزشتہ چوبیس گھنٹوں سے بھوکی تھی۔ کل رضیہ بیگم کے کمرے میں بیڈ جھاڑتے ہوئے اس سے سائیڈ ٹیبل پر رکھا گلاس گر کر ٹوٹ گیا تو اسے بطور سزا کھانا منع کیا گیا تھا۔ وہ جب حاجرہ کے ساتھ لان میں کام کر رہی تھی تو اس سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ کیونکہ کل صبح بھی اس نے صرف دو سلائس اور ایک کپ چائے پی تھی۔ اس کو پیٹ بھر کر کھانے کی اجازت ہی نہیں تھی۔ جس وقت رضیہ بیگم اس کو اس قدر برا بھلا کہہ رہی تھیں تو حاجرہ بھی کمرے میں موجود تھی جو ان سے پہلے ہی آ گئی تھی اور انھوں نے اس کو لان کی صفائی کا حکم دیا تھا کیونکہ کل انھوں نے اپنے کچھ مہمانوں کو بلایا تھا۔ اسی وقت رضیہ بیگم نے ماسی حاجرہ کے سامنے حنا کو بھوکا رہنے اور لان کی صفائی میں اس کی معاونت کی ہدایت کی تھی۔ یہ وہ سارے قصے سے واقف تھی۔

ماجد اور واجد بھائی کی بیویاں تو "ہونہہ" کہہ کر اپنے اپنے کمروں میں پلٹ گئیں جبکہ خالد بھائی وہیں کھڑے انھیں گھور رہے تھے۔ حاجرہ روتے روتے ساری بات بتاتی جا رہی تھی۔ ساتھ ہی اپنا دوپٹہ پھاڑ کر حنا کی پیشانی پر باندھنے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔ نمرہ اور شرمین دونوں تو خون دیکھ کر ویسے بھی پریشان ہو گئیں جبکہ رضیہ بیگم کو حاجرہ کی باتیں ایک آنکھ نہیں بھا رہی تھیں۔ وہ صرف اپنے مطلب کے لیے ہی تو اس سے دوستی کیا کرتی تھیں۔ خون تھا کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا

اور وہ خود بھی کب سے بے ہوش تب ہی خالد بھائی جیسے نیند سے جاگے۔ فوراً انھوں نے اپنے کمرے کا رخ کیا اور والٹ لے کر سیدھا باہر آئے اور نمرہ، شرمین کو حنا کو اٹھا کر گاڑی میں ڈالنے کا کہا مگر دونوں نے انکار کر دیا۔ انھوں نے خود ہی حاجرہ کی مدد سے اسے اٹھا کر گاڑی میں ڈال کر فوراً تیزی سے ڈاکٹر کاشف کے کلینک کی طرف نکل پڑے۔ ڈاکٹر کاشف ان کا قریبی دوست تھا۔ معاملے کی نزاکت کو سمجھ سکتا تھا۔ پوچھا تو صرف اتنا کہ "یہ سب کیسے ہوا؟" مگر ان کے جواب نہ دینے پر چپ ہو گیا کیونکہ ان سے کوئی جواب نہیں بن سکا۔ ڈاکٹر کاشف نے خالد بھائی کے سامنے ہی خود زخم کی صفائی کی تو پتا چلا کہ زخم بہت گہرا ہے۔ اس سے دماغ پر گہرے اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ دماغ کو بھی چوٹ لگی ہے۔ انھوں نے ٹانکے لگا کر پٹی باندھ دی۔ حنا ہنوز بے ہوش تھی اور خالد بھائی پریشان۔ ڈاکٹر کاشف نے دو گھنٹے بعد دماغ کا ایکسرے بھی کیا اور فکر مند ہو گئے۔ اس وقت خالد بھائی کسی کام سے گھر جا چکے تھے۔

ادھر گھر میں حاجرہ کی جان عذاب میں آئی ہوئی تھی کہ اس نے کیسے خالد بھائی کے سامنے ساری باتیں بتا دیں۔

"آخر حنا بی بی نے ایسا کیا کیا ہے جو آپ لوگ ان سے ایسا سلوک کرتے ہیں؟" حاجرہ نے رضیہ بیگم کی صلواتوں کے جواب میں سوال کیا۔ "ایسا سلوک تو کوئی اپنوں کے ساتھ نہیں کرتا۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ آپ کے کسی دشمن کی بیٹی ہے یا پھر سوت کی بچی مگر آپ تو اسے اپنی بھانجی کہتی ہیں۔ جو کہ غلط ہے مگر آپ کے....."

"تمہیں زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔ فوراً اپنا حساب کتاب کرو اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ اس

سے پہلے کہ خالد یہاں آئے اور غصے سے جرح و پوچھ
گچھ کرے۔" رضیہ بیگم اور سے وہ اڑیں مگر باہر سے
آتے خالد بھائی ان کی اور حاجرہ کی گفتگو کا آخری
حصہ سن چکے تھے۔ رضیہ بیگم نے پیسے حاجرہ کے اوپر
پھینکتے ہوئے اسے باہر کی طرف اشارہ کیا۔ وہ باہر
آئی تو خالد بھائی پر سوچ انداز میں اس کو دیکھنے لگے۔
حاجرہ جلدی سے گیٹ سے باہر نکل گئی۔ حاجرہ کی
بات "سوت کی جن" نے تو رضیہ بیگم کو پتنگے لگا دیے
تھے اور حقیقت بھی یہی تھی۔

☆...☆...☆

آغا جان نسلاً ایرانی تھے ان میں ایرانیت، نفاست اور وجاہت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ شاہی خاندان سے ملنے جلنے کی وجہ سے بادشاہوں جیسا شوق اور بڑا مزاج بھی تھا۔ پاکستان آنے سے پہلے ایران کے شہر اصفہان میں ان کا قالین کا کاروبار تھا۔ بنیادی طور پر تاجر تھے اس لیے پاکستان آکر بھی انہوں نے تجارت کو ہی اپنایا۔ شروع میں کرائے کے مکان میں رہے بعد میں آہستہ آہستہ اپنے ذاتی مکان کا بندوبست بھی کرلیا۔ پھر صمدانی صاحب ان کے بزنس پارٹنر بن گئے پھر ان ہی کے ایما پر اپنا گھر بھی آباد کرلیا۔ اللہ نے بیٹے اور ایک بیٹی دی۔ دونوں بیٹے حارث اور شارق اور بیٹی گل رعنا تھی۔ تینوں بچے تعلیم حاصل کررہے تھے۔ اچانک چیچک کی وبا پھیلی جس میں ان کی بیٹی گل رعنا چٹ پٹ ہوگئی۔ اب آغا جان اور نسیم بیگم کی ساری توجہ دونوں بیٹوں پر تھی۔ کاروبار میں اللہ نے برکت ڈال دی تھی۔ میٹرک کے بعد حارث نے کامرس لے لی اور پھر ایم کام کرلیا۔ جبکہ شارق نے ایم۔ بی۔ اے کو ترجیح دی۔ حارث نے آغا جان کے ساتھ کاروبار میں شرکت کرلی اور آغا جان نے ان کی شادی اپنی مرضی سے رضیہ نامی خاتون سے کروادی جو کہ ان کے ایک جاننے والے کی بیٹی تھیں۔ وہ نہ صرف کم رو تھیں بلکہ بدزبانی اور بدخلقی میں بھی اپنی مثال آپ تھیں مگر آغا جان نے حارث کو نیکی کے جذبے کے تحت راضی کرلیا۔ یوں جھٹ پٹ رضیہ بیگم آغا ولا میں بہو بن کر آگئیں۔ جلد ہی اللہ نے انہیں دو بیٹوں اور ایک بیٹی سے نواز دیا۔ شارق کے ایم۔ بی۔ اے کے بعد ان کی شادی بھی آغا جان نے حسب روایت اپنی پسند سے بلقیس بانو سے کردی۔ بلقیس بانو نیک اطوار اور بڑی رکھ رکھاؤ والی خاتون ثابت ہوئی اور آتے دن ان کی واہ واہ ہوگئی۔ صورت اور سیرت دونوں اعتبار سے وہ بہترین تھیں۔ ان کی آئے دن کی تعریف و توصیف سن کر رضیہ بیگم آپے سے باہر ہوگئیں اور ہر کسی کو ڈسنے کو تیار رہتیں۔

پھر ایک دن آغا جان کو دل کا دورہ پڑا کہ وہ اسپتال میں چند گھنٹوں میں ہی ختم ہوگئے۔ نسیم بیگم کو ان کی کنڈیشن کا اندازہ تو ہو گیا تھا کیونکہ جس وقت آغا جان کو دورہ پڑا تو نسیم بیگم اپنی بلڈ پریشر کی وجہ سے دوا لے کر نیند کی گولی کی وجہ سے غنودگی میں تھیں۔ اس لیے کسی نے ان کو نہ اٹھایا مگر جب اسپتال سے واپسی پر انہیں اصل صورت حال کا علم ہوا تو پہلے تو انہیں سکتہ ہو گیا پھر انہوں نے ایسی ہائے پکڑی کہ وہ بھی آغا جان کے ساتھ ہی سوئے آخرت روانہ ہوگئیں۔ بڑا گھر اجڑ گیا تھا کیونکہ دونوں ہی بلند اخلاق اور ملنسار تھے۔ اس وقت حارث اور شارق دونوں کی بیویاں امید سے تھیں۔ اب گھر میں صرف بہویں اور بیٹے رہ گئے۔ کیونکہ حارث باپ کا کاروبار سنبھالتے اور شارق اپنی جاب پر چلے جاتے۔ ساس سسر کے مرنے کے چار ماہ بعد شارق کے یہاں خالد نے جنم لیا جبکہ دو ماہ بعد حارث کے ہاں دوسری بیٹی فروہ نے جنم لیا۔ ایم بی اے کے بعد شارق ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازمت کررہے تھے۔ ان کا

تبادلہ کراچی ہو گیا تو وہ خود کراچی چلے گئے۔ کراچی میں انہیں رہتے ہوئے پانچ سال ہو گئے تھے۔ ایک دن انہیں حارث بھائی کا فون آیا جس میں انہوں نے شارق کو طلب کرتے ہوئے کہا تھا کہ "گھر میں رضیہ بیگم کی بدمزاجی کی وجہ سے گزشتہ کچھ عرصہ پہلے میں نے ایک الگ گھر کا مکان لے لیا ہے۔ مالک مکان بہت بیمار اور غریب ہے اس کی ایک بیٹی ہے جو بہت حسین اور سلیقہ مند ہے اخلاق کی مالک ہے۔ گزشتہ دنوں مالک مکان پر فالج کا اٹیک ہوا ہے۔ وہ مرنے سے پہلے اپنی بیٹی کی اس کی کسی مناسب شخص سے شادی کی درخواست کررہا ہے۔ ڈاکٹروں کے مطابق اس کے پاس وقت بہت کم ہے میں کہاں سے اس کے لیے رشتہ ڈھونڈوں اس لیے میں نے خود اس لڑکی شازیہ سے نکاح کا فیصلہ کرلیا ہے۔ تم آسکو تو فوراً آجاؤ۔" کہا تھا کہ کوئی بات نہ شارق کے حواس پر گرا تھا۔ پھر اس نے پہلی فرصت میں حارث کے پاس جانے کا فیصلہ کرلیا اور اس کے نکاح میں بھی شریک ہوا۔ خود وہ بھی شازیہ کو دیکھ کر اس کی شرافت کا معترف ہو گیا۔ خالد کے بعد شارق کے یہاں بلقیس سے [illegible] کی وجہ سے اور کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ خالد [illegible] حارث کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ انہیں اکثر سر درد کی شکایت رہتی کیونکہ گھر میں رضیہ بیگم ان کی جان عذاب میں کئے ہوئے تھیں وہ ہر وقت بیٹھے بٹھائے لڑنے مرنے پر تیار رہتیں۔ شارق نے حارث کی شادی کا ذکر کبھی گھر میں نہ کیا۔ تقریباً ایک سال بعد حارث کے یہاں شازیہ سے ایک بیٹی پیدا ہوئی تو انہوں نے اس کا نام حنا رکھا۔ شازیہ کے والد اس کی شادی کے کچھ دن بعد ہی گزر گئے تھے۔ اس لیے حارث زیادہ وقت شازیہ اور حنا کو دیتے۔ دوسری طرف پریشانیوں کی وجہ سے حارث کا فالج ایک دن ہو گیا اور چند دن کوما میں رہنے کے بعد وہ اسپتال میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اسپتال ہی میں رضیہ بیگم نے شازیہ کو دیکھا۔ حقیقت کھلنے پر وہ اسپتال ہی میں شروع ہوگئیں اور شازیہ کو کفن دفن میں بھی شریک نہ ہونے دیا۔ بلکہ دھکے دے کر گھر سے ہی نکال دیا۔ یوں سب لوگ حارث اور شازیہ سے واقف ہوئے۔ شازیہ صبر کے گھونٹ پی کر روتی ہوئی حنا کو لے کر واپس اپنے گھر چلی گئی۔ پھر شارق ہی ان دونوں ماں بیٹیوں کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ شازیہ نے مکمل طور پر حنا کی تعلیم پر توجہ دینی شروع کردی۔ حنا جب میٹرک میں تھی تو شازیہ بھی اللہ کے پاس چلی گئی اور حنا اکیلی رہ گئی۔ شارق نے اس کو بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ لیا اور گھر لے آئے۔ رضیہ بیگم نے اس کو دیکھ کر قیامت مچادی تو شارق نے جتادیا کہ یہ گھر جتنا آپ کے چاروں بچوں کا ہے اتنا ہی حنا کا بھی ہے کیونکہ وہ اس کے بھی باپ تھے۔

ابھی تک ہی شارق اور ان کی بیوی بلقیس بانو بازار جاتے ہوئے اندھی گولیوں کی لپیٹ میں آگئے۔ مارنے والے نے چھاپہ بہت مارا تھا۔ خالد تو اپنے والدین کی ناگہانی موت سے شاک میں آگئے۔ ان دنوں ان کا ایم بی اے کا فرسٹ سمسٹر چل رہا تھا۔ دوستوں کی حوصلہ افزائی سے انہوں نے امتحان دیا۔ پھر کہیں سے اڑتی اڑتی انہوں نے سنی کہ شارق اور بلقیس کی موت کوئی حادثہ نہیں بلکہ قتل تھا وہ بھی معاوضہ دے کر کروایا گیا اور کروانے والا بھی کوئی قریبی عزیز تھا۔ پھر وہ ثبوت حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگ گیا۔

حنا کے گھر میں آجانے کے بعد رضیہ بیگم نے آنے جانے والوں سے کسی کو وہ یتیم یسیر بے سہارا بھتیجی کسی کو بھانجی کہہ کر تعارف کروانا شروع کردیا۔ کچھ سے تو یہ تک کہہ دیا کہ کام کاج کے لیے ملازمہ رکھی ہے۔ اس دوران خالد نے اس

کالج ایونٹ میں اس نے بی اے کا امتحانی فارم بھر دیا تھا۔ یوں آج کل وہ امتحان کی تیاری کر رہی تھی جس میں خالد ہی اکثر رات میں اس کی مدد کرتا تھا۔ مگر رضیہ بیگم کو بھلا کیسے گوارا ہوتا وہ اسے دن تو دن رات میں بھی نچلا نہ بیٹھنے دیتیں۔ سو ثمرہ نے وہ وقت بینڈ بھرنے کی اجازت دی۔ اس دن بھی اس نے ایک دن پہلے ناشتے کے بعد ثمرہ اور فروہ کے چائے ہوئے توس اور ایک پیالی چائے پی تھی جبکہ دوپہر میں اس کو کچھ بھی کھانے کو نہ دیا گیا تھا۔ کیونکہ اس سے ایک گلاس ٹوٹ گیا تھا۔ رات کو بھی وہ خالی پیٹ سوئی اور اس وقت وہ اسپتال میں تھی۔

خالد بھائی اندر آئے تو رضیہ بیگم ابھی تک گرج برس رہی تھیں۔ "آپ کس لیے واویلا مچا رہی ہیں؟ اب کون ہے جو سب سن رہا ہے۔ اب تو ثمن آ گیا اسے اسپتال پہنچا کر۔" وہ غصے سے بولا۔

"ارے جا میاں سے میں سب جانتی ہوں تجھے کیوں مروڑ اٹھ رہے ہیں اس بدذات سے ہمدردی کے۔ ارے وہ ماں کی آواز دیں چوٹ اور تکلیف کے نام پر ہمدردی کا ڈرامہ رچا رہی ہے۔" رضیہ بیگم غصے اور نفرت سے گویا جلتے توے پر جا بیٹھیں۔

"ڈرامہ وہ نہیں بلکہ وہ جو آپ رچا رہی ہیں۔ جب پولیس آئے گی اس گھر میں تو سب کچھ کھل کر سامنے آ جائے گا جو جو آپ نے کیا اور جو کر رہی ہیں۔" خالد نے دھاڑتے ہوئے کہا۔ "کیونکہ ڈاکٹر کاشف کے مطابق اگر زیادہ وقت ایسا ہی رہا تو اس کے ایکسپائر ہونے کے چانسز بن سکتے ہیں اور پھر یہ قتل کا کیس بن جائے گا۔" پولیس کا نام سنتے ہی رضیہ بیگم کے اوسان خطا ہو گئے۔

"کیوں میں نے کیا کیا ہے جو پولیس یہاں آئے گی۔" وہ مری مری آواز میں بولیں۔

"صبر کریں سب کچھ سامنے آ جائے گا۔" خالد کی چنگھاڑتی آواز سن کر گھر کے دیگر افراد بھی وہاں آ گئے اور رضیہ بیگم کو مشکوک انداز سے دیکھنے لگے اور ان کی دونوں بہوئیں تو طنزیہ مسکرانے بھی لگیں۔ جبکہ ثمرہ اور فروہ حیران پریشان ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔

اگلے دن خالد اسپتال سے ہو کر گھر آیا تو رضیہ بیگم کو ڈرائنگ روم کے فون پر بڑی رازداری سے مصروف پایا۔ رضیہ بیگم کی دونوں بہوئیں کچن میں مصروف تھیں۔ اس نے آ کر (؟) ... کا ہوا فون اٹھا لیا۔ وہ کسی فخورا نامی آدمی کی بیوی سے مصروف گفتگو تھیں جس نے بتایا کہ فخورا پچھلے کئی دنوں سے بیمار ہے اور ابھی بھی وہ اسپتال میں داخل ہے۔ اس کی زبان اور دونوں پاؤں مفلوج ہو گئے ہیں۔ رضیہ بیگم کے پوچھنے پر اس کی بیوی نے جس اسپتال کا نام بتایا اسے سن کر خالد چونک گیا۔ وہ ڈاکٹر کاشف کا اسپتال تھا۔ اب خالد کو تجسس نے آ گھیرا کہ فخورا جیسے بدمعاش اور قاتل سے رضیہ بیگم کو ایسا کیا کام پڑ گیا تھا کہ وہ اس کو تلاش کر رہی تھیں۔ یکایک کسی سوچ کے تحت اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ جس خاموشی سے آیا تھا اسی خاموشی سے واپس چلا گیا۔ اسپتال پہنچ کر اس نے ریسپشن سے فخورا کا نمبر معلوم کیا پھر اس کے کمرے میں پہنچ کر اس کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ کچھ عرصہ پہلے وہ ایک چھاپری کی حیثیت سے ان کے گھر میں آیا تھا۔ اس وقت شارق اور عنبرین (؟) دونوں زندہ تھے۔ پھر کچھ دن بعد ہی ان دونوں کو قتل کر دیا گیا۔ "اس کا مطلب ہے کہ فخورا ہی......"

اس سے آگے اس سے سوچا ہی نہ گیا۔ اپنے والدین کو یاد کر کے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "میں آپ کے خون کے ایک ایک قطرے کا حساب لوں گا۔" وہ دل ہی دل میں ان سے مخاطب ہوا۔ اس نے کاشف کو ساری بات بتائی پھر فخورا کے پاس کاشف کے ساتھ آیا۔ ابھی وہ کچھ کہتے بھی نہ پایا تھا کہ فخورے کی بیوی اس کا کھانا لے کر آ گئی۔ آتے ہی اس سے بولی۔ "ارے فخورے تو کتنے دن سے اسپتال میں ہے لیکن تجھے کوئی بھی پوچھنے تک نہیں آیا۔ مگر آج کی رضیہ بیگم کا فون آیا تھا وہ تیرا پوچھ رہی تھی۔ میں نے اس کو تیری بیماری اور اسپتال میں داخلے کا بتا دیا۔ وہ بہت ہی گھبرا گئی کہ اسے تیرا ہی آسرا ہوتا ہے۔ اچھا ہے کہ وہ بھی تیرے ہی کام آ جائے۔ شاید وہ تجھ سے ملنے یہاں آئے۔" رضیہ بیگم کا نام سنتے ہی فخورے کی عجیب حالت ہو گئی۔ وہ انکار میں سر ہلانے لگا۔ خالد کے اشارے پر کاشف نے فخورے کی بیوی کو کمرے سے باہر جانے کا کہا۔ پھر خالد نے اس سے پوچھا "تم رضیہ کو کب سے جانتے ہو؟ اس کو تم سے کیا کام ہو سکتا ہے اور تم نے اس سے پہلے بھی اس کا کوئی کام کیا ہے؟" فخورا حیران ہو کر خالد کو دیکھنے لگا اور غوں غوں کر کے کچھ بولنے کی کوشش میں بے ربط آوازیں اس کے منہ سے نکلنے لگیں۔ پھر آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ خالد کے آگے ہاتھ جوڑنے لگا تب اس نے اشارے سے لکھنے کے لیے کاغذ اور قلم مانگا۔ خالد نے اس کو (؟) کا کہا پھر جلدی سے ایس پی چاند کے نمبر پر اس کو اسپتال آنے کو کہا۔ ایس پی چاند فوراً ہی کاشف کے اسپتال پہنچ گیا۔ اس نے مختصراً اس کو بات سمجھائی اور کاغذ اور قلم لے کر فخورے کے پاس پہنچ گیا۔ ایس پی چاند فخورے کے سرہانے کی طرف اس کی (؟) سے کھڑا رہا۔ خالد نے دروازہ بند کر دیا اور فخورے کو کاغذ اور قلم دے کر خود کھڑا رہا۔ فخورے نے شارق اور عنبرین کے قتل کے سلسلے میں رضیہ بیگم سے ڈیلنگ کی مکمل تفصیل لکھی۔ ساتھ ہی پچاس ہزار روپوں کی ادائیگی کا بھی انکشاف کیا جو کہ رضیہ بیگم نے اس کو پیشگی کی شکل میں دی تھی اس کے علاوہ پچاس ہزار کی ادائیگی کا وعدہ بھی کیا تھا جو اس نے آج تک پورا نہ کیا۔ فخورے کے مطابق اس نے یہ قتل اکیلے نہیں کیے بلکہ اس میں اس کا ساتھ ٹیکے نے دیا تھا اس کی تفصیل بھی دی گئی کہ وہ کہاں مل سکتا ہے۔ آخر میں اس نے اعتراف کیا تھا کہ وہ پچاس ہزار مجھ پر بہت بھاری پڑے اور میری اکلوتی بیٹی کو میرے سامنے ظلم و بربریت کا نشانہ بنایا گیا اور میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دیا جائے۔ خالد نے اس تحریری بیان پر فخورے کے دستخط کے علاوہ انگوٹھے کے نشان بھی لے لیے۔ اتنا لکھنے کے بعد فخورا نہ صرف بے حال و خستہ تھا بلکہ اس کی سانس بھی بے ربط ہو گئی تھی۔ اس اثنا میں شام کے چار بج گئے۔ خالد نے ایس پی کو فخورے کی بیوی اور رضیہ بیگم کی فون کال کے بارے میں بتایا ہی تھا کہ خالد نے رضیہ بیگم کو دیکھا جو فخورے کے کمرے کی طرف آ رہی تھیں۔ وہ جلدی سے ایس پی چاند کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لگے پردے کے پارٹیشن کے پیچھے چلا گیا۔ رضیہ بیگم نے اندر آ کر فخورے سے ڈانٹنے کے انداز میں خیریت پوچھی پھر اس کو ایک نئے کام کے بارے میں بتانے لگیں مگر فخورا بے بسی سے سر ہلانے لگا۔ وہ سمجھیں کہ وہ انکار کر رہا ہے تو اسے اسپتال کے اخراجات کی ادائیگی کا لالچ دیا۔ "ارے تو فکر نہ کر اب تیرا بہترین علاج ہوگا اور تو دو دن کے اندر یوں بھلا چنگا ہو جائے گا۔" انہوں نے تسلی دلانے کے انداز میں کہا پھر دوبارہ سے یوں گویا ہوئیں۔ "اب کے تجھے ایک بالکل مریل سی لڑکی کو ٹھکانے لگانا ہے۔ پیسوں کی تو بالکل فکر نہ کر تیرے پچھلے بیس ہزار بھی دے دوں گی بلکہ دے......

انعام بھی لے لوگی۔ تجھے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی۔ ویسے بھی آج کل وہ لڑکی بیمار ہے کسی اسپتال میں ہے۔ اسے اگر اس اسپتال کا پتا چل جائے تو وہیں پر یہ کام تمام ہو سکتا ہے۔ انہیں اپنی دشمن میں چڑیل بھی تو ساتھ لگا کر نظر ہو لینے کے علاوہ وہ پہلے بھی پھرنے سے کی حد تک ہے۔ وہ تو صرف انتقام کی آگ میں جل کر بھسم ہوئی جا رہی تھیں۔ "تو چاہے تو پہلے کی طرح انہیں کو بھی ساتھ ملا لے۔ بس تو میرا یہ کام کر دے تو میں تجھے خوش کر دوں گی۔ یہ لڑکی تو میرے لیے عذاب بن گئی ہے۔ پتا نہیں کب اس سے جان چھوٹے گی۔" جواب میں شفو ابھی کچھ بھی نہ بول پایا تو انہیں تشویش ہوئی۔ وہ اسے جھنجوڑنے اور آوازیں دینے لگیں تو فوراً ہی ایس پی چاند پردے کے پیچھے سے نکل آئے ان کے ساتھ ہی خالد بھی ہاتھ میں موبائل فون پکڑے برآمد ہوا جس میں رضیہ بیگم کی ساری گفتگو ریکارڈ ہو چکی تھی۔ خالد کو دیکھ کر وہ چونک گئیں۔ "تم یہاں پر کیا کر رہے ہو؟" جواب میں اس نے موبائل فون آن کر دیا تو ان کو خود اپنی آواز سنائی دی۔ "یہ کیا ہے؟"

"یہی تو میں بھی پوچھ رہا ہوں۔" خالد نے کڑے تیوروں سے گھورتے ہوئے جواباً ان سے سوال کیا تو وہ بوکھلا گئیں۔

"کس کام کی ڈیلنگ کر رہی تھیں آپ شفو سے؟ آپ اس کو کیسے جانتی ہیں؟ اور اس سے پہلے آپ نے اس سے جو ڈیلنگ کی تھی وہ اس وقت تحریری بیان کی صورت میں میرے ہاتھ میں موجود ہے۔" اب کے ایس پی چاند گرجے۔ اب تو رضیہ بیگم چاروں شانے چت ہو گئی تھیں۔ ایس پی چاند نے مقامی تھانے میں فون کر کے لیڈی کانسٹیبل اور دو چار پولیس والوں کو بھی رضیہ بیگم کے ایڈریس پر پہنچنے کی ہدایت کی اور خود خالد کو ساتھ لے کر گئے کچھ اپنے اور کورٹ سے رضیہ بیگم کے وارنٹ گرفتاری لینے کے لیے نکل پڑے۔ اس دوران رضیہ بیگم نے خود کو تنہا محسوس کر کے گھر جانے کے لیے … گاڑی … وہاں ڈرائیور موجود تھا اسے فون کرنے … گاڑی میں پیٹرول ختم ہو گیا تھا اس لیے پیٹرول لے کر تھوڑی دیر میں آ رہا ہوں۔ ان دنوں پیٹرول کی بڑی قلت تھی قطار میں لگ کر لینا پڑتا تھا۔ ڈرائیور کے آتے ہی انہوں نے اپنا غصہ اس پر نکالا اور جھٹ گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ سادہ لباس میں دو پولیس والے موٹر سائیکل پر ان کی گاڑی کے پیچھے نکل پڑے۔ جونہی وہ گھر پہنچیں پیچھے بڑی گلی سے نکل کر پولیس وین ان کے گیٹ پر پہنچ گئی۔ اس میں سے اتر کر دو لیڈی کانسٹیبل اور چار پولیس اہلکار ان کے پیچھے اندر پہنچ گئے جبکہ چوکیدار رامو چاچا انہیں روکتے ہی رہ گئے۔ پولیس کو دیکھ کر وہ گھبرا گئیں جبکہ گھر کی عورتیں حیران اور مرد پریشان۔ رضیہ بیگم نے اندر کی طرف قدم بڑھائے تو لیڈی کانسٹیبل نے ان کا راستہ روکا۔ واجد اور جہانگیر سب سے پہلے آگے بڑھے۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ لوگ؟"

"وہی جو ہمیں کہا گیا ہے۔"

"کس نے کہا ہے تم سے؟" واجد اور اس کی بیوی یک زبان ہو کر بولے۔

"ایس پی چاند اور آئی جی نے۔" ترنت جواب آیا۔

"مگر…" اگلے سوال سے پہلے ہی ایس پی چاند خالد اور شفو کے ساتھ اندر آ پہنچے تھے۔ شفو کو دیکھ کر رضیہ بیگم کو اپنی جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے لیڈی کانسٹیبل نے رضیہ بیگم کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگا دیں۔ دونوں بیٹے، بیٹیاں اور بہویں یہ

سب حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔

"ان کا جرم تو بتا دیں؟" واجد اور ثمرہ نے فریادی لہجے میں پوچھا۔ "دہرے قتل کی ذمہ دار۔ انہوں نے ہی پہلے اپنے بیٹے شارق اور اس کی بیوی عفت کو قتل کروایا تھا۔" ایس پی چاند نے بتایا۔

"شارق بھائی جان اور بھابی جان کا قتل امی نے کروایا تھا؟" سب کے سب حیرت سے گنگ ہو گئے تھے۔

"ہاں ہاں میرے ماں باپ کا قتل اسی ظالم عورت نے کروایا تھا اور اب یہ ثنا کو مارنے کے لیے شفو کے پاس ڈیلنگ کرنے گئی تھیں۔" خالد نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ "مگر اس بات کا کیا ثبوت ہے آپ لوگوں کے پاس؟ اور دوسری بات کیا آپ کے پاس ان کی گرفتاری کا وارنٹ ہے؟"

"میاں ہمارے پاس ثبوت بھی ہیں اور وارنٹ بھی ہے۔ یہ دیکھیے وارنٹ۔" ایس پی چاند نے اپنی جیب سے ایک کاغذ کی فوٹو کاپی واجد اور جہانگیر کی طرف بڑھا دی۔

… کو گرفتاری کے وقت چونکہ … ہو چکے تھے اس لیے اس نے بھی تمام گھر والوں کے سامنے … دی۔ "مگر تم رضیہ بیگم کو کیسے جانتے ہو؟" ایس پی چاند نے شفو سے حیرت کے ساتھ پوچھا۔

"رضیہ بیگم کو میں تو نہیں جانتا تھا مگر مجھے تو رامو چاچا نے ان سے ملوایا تھا جب انہیں باتھ روم اور کچن میں پانی کی ٹونٹیوں میں کچھ کام تھا۔"

"رامو چاچا تمہارے کون ہیں؟" اب کے خالد نے سوال کیا۔

"وہ میرے کوئی نہیں ہیں مگر پہلے یہ مستری تھے تو ان کے ساتھ بنگلوں اور گھروں میں پلمبری کا کام کرتا تھا۔ شفو بھی میرے ساتھ ہوتا تھا ہم ان کو مستری چاچا کہتے تھے۔ ایک بار مستری چاچا کام کرتے ہوئے گر گئے جس کی وجہ سے ان کا ہاتھ فریکچر ہو گیا بعد میں انہوں نے ہاتھ کی وجہ سے کام چھوڑ دیا پھر یہاں پر چوکیداری کرنے لگے۔ ہم دونوں چھوٹی موٹی چوریاں اور بدمعاشیاں کرنے لگے۔ ایک مرتبہ چوری کے دوران مالک مکان کا لڑکا جاگ گیا۔ ہم نے اپنے بچاؤ میں اس پر ہاتھ ڈال دیا۔ میں تو صاف بچ نکلا مگر شفو نے اس پر گولی چلا دی۔ گولی اس لڑکے کو لگی اور اس کی چیخ سے گھر والے جاگ گئے۔ شفو پستول سمیت سڑک پر بھاگ رہا تھا۔ قریب سے گزرتی ہوئی ایک کار میں سے دو آدمیوں نے اس کو بہت قریب سے دیکھ لیا۔ خوش قسمتی سے وہ دونوں آدمی ائیرپورٹ جا رہے تھے۔ اس لیے فوراً کوئی عینی شاہد نہ مل سکا اور شفو فی الحال تھانے سے باہر ضمانت پر تھا۔ کیونکہ تھانہ انچارج بھی اس کا یار تھا۔ خالد کو یاد آیا کہ کچھ عرصہ پہلے گھر کے دونوں باتھ روم اور واش روم میں پانی کی ٹونٹی کا مسئلہ ہو گیا تھا جس کی وجہ سے ایک مرتبہ وہ خود پھسلتے ہوئے بچا تھا۔ مگر دوسری مرتبہ اس کے پاؤں میں موچ آ گئی تھی۔ ایسے ہی پھسلنے کی وجہ سے رضیہ بیگم نہ صرف گر گئی تھیں بلکہ ان کے ہاتھ پاؤں میں چوٹیں بھی لگی تھیں جس کی وجہ سے وہ کافی دنوں صاحب فراش رہیں اور اس تمام کی ذمہ دار بھی وہ ثنا کی نحوست کو ٹھہرا رہی تھیں۔

"مگر رضیہ بیگم کو تمہارے قتل و غارت گری کے فن کی خبر کیسے ہوئی؟" ایس پی چاند نے پھر سوال کیا۔

"دراصل کام زیادہ ہونے کی وجہ سے میں اپنے ساتھ شفو کو بھی لے آیا تھا۔ وہ بھی ان دنوں چونکہ بے روزگار تھا اور اس کیس کی وجہ سے ضمانت پر بھی تھا۔ ایک دن ہم دونوں کام کے دوران اسی کیس کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ کیونکہ اگلی پیشی پر

خضور کے ان گواہوں کا سامنا تھا جنہوں نے اس کو موقع واردات سے مع ہتھیار بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ اخبار میں تصویر چھپنے کی وجہ سے وہ اس کو پہچان پائے اور اب وہ ان سے یہاں عدالت میں حاضر ہو کر اس کی شناخت کرنے کے لیے آ رہے تھے۔ پتا نہیں کب رضیہ بیگم وہاں آ گئیں اور انہوں نے وہ ساری گفتگو سن لی۔ انہوں نے ہمیں دھمکی دی کہ "تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔ اگر تم انکار کرو گے تو میں پولیس کو تمہارے بارے میں بتا دوں گی۔ دوسری صورت میں تمہیں نہ صرف معاوضہ بلکہ انعام بھی ملے گا۔" ہمارے پوچھنے پر کہ شارق اور اس کی بیوی سے تمہیں کیا پرخاش ہے؟ انہوں نے بتایا کہ شارق دراصل میرا سوتیلا بیٹا ہے اور وہ میرے شوہر کی محنت سے بنائے کاروبار کو ہڑپ کرنا چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک غیر لڑکی کو میری سوتیلی بیٹی کی حیثیت سے گھر میں لے آیا ہے۔ بنی تو ہے اس کی مصیبت حنا کو لانے والا۔ اس کے علاوہ انہوں نے ہمارے آگے شارق اور اس کی بیوی کے اپنے اوپر ظلم کی ایسی تصویر کھینچی کہ ہم بے اختیار ان کا کام کرنے پر راضی ہو گئے۔"

سب دم بخود ہو کر ان کی حیرت انگیز داستان سن رہے تھے اور رضیہ بیگم کی وہ حالت کہ "کاٹو تو بدن میں لہو نہیں" والا محاورہ صادق آ رہا تھا۔

پھر رضیہ بیگم کو تو پولیس گرفتار کر کے لے گئی مگر ساتھ ہی اس نا تجربہ کار کی ساکھ بھی خاک میں مل گئی۔ شارق نے اپنے قتل سے دو ماہ پہلے ایک وصیت لکھوائی تھی جس میں اس نے فیکٹری خالد کے نام کر دی تھی۔ شاید انہیں اپنے انجام کا کچھ اندازہ ہو چکا تھا۔ اور شادی سے پہلے تو وہ نا جان کی حویلی میں ہی رہ رہے تھے۔ ان کا اور خالد کا یہ خیال ایم بی اے کے رزلٹ پر گفٹ کرنے کا تھا۔ اس کے علاوہ حارث نے اپنی ساری کے دوران حنا کے نام پر اس کو دو بے اور ایک لاکھ کے سیونگ سرٹیفکیٹ کر دیے تھے جس کا علم خالد کو بھی تھا مگر حنا بے خبر تھی۔

رضیہ بیگم کی گرفتاری کے بعد خالد بھی اس گھر سے کنارہ کش ہو کر اپنے باپ کے فلیٹ میں رہ رہا ہے۔ شارق کے سوئم کے بعد اس کے وکیل نے خالد کو مکان کے کاغذات کے علاوہ ان کی تمام جائیداد کی دستاویزات دے دی تھیں۔ خضورا تو رضیہ بیگم کی گرفتاری کے چند دن بعد ہی مر گیا تھا۔ اس کے ضمیر کی چبھن نے اسے جیتے جی ہی مار دیا تھا۔ مرنے سے کچھ گھنٹے قبل اس کی زبان حیرت انگیز طور پر کافی حد تک بولنے کے قابل ہو گئی تھی۔

رضیہ بیگم کا کیس ابھی کورٹ میں چل رہا ہے۔ ان کی اولادوں میں سے کوئی بھی ان کی پیشی پر عدالت میں نہیں جاتا۔ شاید بدنامی کے ڈر سے نہ ہی ان کے لیے کوئی وکیل کیا گیا ہے۔ حنا آج بھی کوما میں ہے۔ خالد کا خیال ہے کہ حنا کے ہوش میں آنے کے بعد وہ اس کی مرضی سے اگر وہ راضی ہوئی تو اس سے شادی کرے گا۔ اور حارث نے جو کچھ اس کے نام کیا ہے سارے کا سارا ادا کرے گا۔

یہ دنیا صرف چند روزہ ہے اور ان چند روز میں بھی کون جانے نیکی کمائے گا یا بدی۔ دعائیں سمیٹے گا یا بددعائیں۔ سکھ پائے گا یا دکھ۔ میری قارئین سے التماس ہے کہ جتنا ہو سکے اپنے وقت کو نیک کاموں میں صرف کریں اور اپنے ہاتھ اور زبان سے دوسروں کو سکھ پہنچا کر ایک اچھے مسلمان ہونے کا ثبوت دیں اور دوسروں کی دعائیں لیں۔ تاکہ حشر میں کام آ سکیں۔ اللہ ہم سب اور تمام مسلمان مردوں اور عورتوں کو نیکی کی ہدایت اور توفیق دے۔ (آمین)

نیا سورج

جناب امتیاز علی افق ڈائجسٹ!
السلام علیکم!
میری تحریر "نیا سورج" ... جب کہ ہم مسلمانوں کے سال کا آغاز ماہ محرم سے ہوتا ہے ... امید ہے یہ کہانی ... ثابت ہوگی۔

فوزیہ ... منیر
لاہور

نیو ائیر کا فنکشن عروج پر تھا۔ بڑے سے ڈرائنگ روم میں گویا طوفان بدتمیزی عروج پر تھا۔ فل آواز میں انڈین اور انگلش گانے لگے ہوئے تھے۔ ساتھ میں نوجوان پارٹی کا شور ہنگامہ عروج پر تھا۔ دوسرے کمرے میں ہاتھوں میں قرآن پاک تھامے سلمیٰ بیگم جائے نماز پر بیٹھی بھیگی آنکھوں اور کپکپاتے لبوں سے اپنے ملک کی اور گھر کی سلامتی کے لیے دعا گو تھیں۔ گزشتہ چند سالوں سے ملکی حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ آپس میں مسلمان بھائی ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے تھے۔ فسادات، ڈکیتی، قتل اور اغوا جیسے گھناؤنے جرائم عروج پر تھے۔ سلمیٰ بیگم خشوع و خضوع کے ساتھ مصروف دعا تھیں، ساتھ ساتھ اپنی اولاد کے لیے بھی دعا گو تھیں۔

"یااللہ! میرے بچوں کو سیدھا اور نیکی کا راستہ دکھا۔ ان کو صراط مستقیم پر چلا۔ میرے مولا! یہ بھٹک گئے ہیں ان کو راہ راست پر لا۔ ان کی آخرت سنوار دے مولا!" ایک جذب کے عالم میں اپنے خدا سے طلب کی بھیک مانگ رہی تھیں۔

اور دوسری طرف ان کے بیٹے بیٹا، بہو اور پوتا پوتی نیو ایئر نائٹ میں نئے سال کا خیر مقدم کر رہے تھے۔ شوہر کے مرنے کے بعد سلمیٰ بیگم نے بہت محنت اور لگن سے اسد کی پرورش کی اور اسے ایم بی اے کروایا۔ پڑھائی کے دوران ہی اسد کو ارسلہ پسند آ گئی۔ اس نے پڑھائی مکمل کر کے کاروبار شروع کیا تو تھوڑے عرصے میں کاروبار خوب ترقی کر گیا۔ ارسلہ بہت پیسے والے والدین کی اکلوتی اور قدرے بگڑی ہوئی بچی تھی۔ سلمیٰ بیگم نے بیٹے کی پسند دیکھ کر ارسلہ کو بہو بنانے کا فیصلہ کر لیا۔

ارسلہ کو اسد کا گھر، رہن سہن اور معیار زندگی پسند نہ آیا اور وہ تھوڑے دنوں میں ہی اپنے ذاتی بنگلے میں شفٹ ہو گئی لیکن اتنا تو تھا کہ سلمیٰ بیگم کو ساتھ ہی رکھا تھا۔ ہاں اگر سلمیٰ بیگم اس کو ٹوکتیں تو وہ ارسلہ کو برا لگتا تھا۔ سلمیٰ بیگم بچپن سے ہی نماز روزے کی پابند عورت گزری تھیں جبکہ ارسلہ ان چیزوں سے دور تھی۔ عین نماز کے وقت وہ کوئی مووی دیکھتی یا بھی گانے لگتی۔ سلمیٰ بیگم نے سمجھانا چاہا تو اس نے کھری کھری سنا دی۔

شادی کے ابتدائی دن تھے سلمیٰ بیگم حسب عادت فجر کی نماز کے بعد کوریڈور میں بیٹھ کر زور زور سے قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھیں کچھ ماحول کا اثر تھا کچھ ان کی خوش الحانی کہ آواز جیسے گونجنے لگی تھی اور ارسلہ نیند سے جاگ گئی تھی۔

"اماں پلیز!" ارسلہ کی آواز پر انہوں نے چونک کر دیکھا۔ "صبح صبح کتنا شور کر رہی ہیں اپنے کمرے میں جا کر پڑھیں نا!" نیند میں ڈوبی خمار آلود آواز تھی، مشکل کنٹرول کر کے قدرے بدتمیزی سے بولی۔

"بیٹی! یہ شور نہیں باعث رحمت ہے، باعث برکت ہے۔" فرشتے کے اوپر سے دیکھ کر نرم لہجے میں کہا۔

"کمال بیٹے! ہم ڈسٹرب ہو رہے ہیں آپ اندر چلی جائیں روم میں۔" ارسل کے پیچھے ہی آنکھیں ملتا اسد کھڑا تھا۔

"اچھا بیٹا!" انہوں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ یعنی بیٹا تو ہوں سے پیارا اس کا تھا آج اسے یہ شور لگ رہا تھا۔ خاموشی سے وہ قرآن پاک اور رحل اٹھائے کمرے میں آ گئیں ان لوگوں کو کچھ کہنا بھی لاحاصل تھا۔ صرف دعا ہی کی جا سکتی تھی ان کی بہتری کے لیے۔ پتا بھی کمال اور بہو بیوی کو پیارا ہو چکا تھا۔

خیر سلمیٰ بیگم کو یہ بظاہر کسی چیز کی کمی نہ تھی ماں بیٹا اور بہو ان سے بہت دور تھے۔ گنتے گنتے دن وہ اسد سے بات کرتیں یا تیں ان کے لیے ایک نوکرانی رکھ دی گئی تھی ارسل اور اعصاب کا شفٹر اور پارٹیز میں مصروف رہتے۔

پھر ان کی زندگی میں ہاسم اور اریشہ کے بعد دیگرے آ گئے۔ سلمیٰ بیگم بہت خوش تھیں کہ پوتا اور پوتی بھی آ گئے تھے لیکن جوں جوں بچے بڑے ہوتے گئے ارسل انہیں دادو سے دور کرتی گئی۔ سلمیٰ بیگم چاہتی تھیں کہ بچے قرآن و سنت اور اللہ کے احکامات سے ہر ممکن معلومات رکھیں لیکن بہ مشکل ہی بچے قرآن پاک ختم کر پائے۔ نماز روزے اور دیگر دینی امور سے بالکل بے بہرہ تھے۔ پتا نہیں اسد بھی ایسا کیوں ہو گیا تھا اسے پیسہ کمانے کی دھن سوار تھی زیادہ سے زیادہ کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ بیوی اور بچوں کو بھی ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا وہ کیا کر رہے ہیں؟ کہاں جا رہے ہیں؟ اسے کوئی سروکار نہ تھا۔ بچوں کو بہترین اسکول میں داخل کروا دیا گیا اور وہ تعلیمی مدارج طے کرتے گئے۔ اب ہاسم فرسٹ ائیر اور اریشہ میٹرک میں تھی۔ اریشہ بالکل ارسل کی کاپی تھی ویسی ہی حسین اور نازک مگر اخلاق ایسے کہ عمر سے بڑی لگتی تھی۔ اس پر وہ کپڑے ایسے پہنتی کہ فیشن ختم ہوتا۔ سلمیٰ بیگم چپکے چپکے اس پر دم کرتی رہتیں تاکہ بری نظر سے بچی رہے۔ وہ ہر بار جاتی ہوتی تو آیۃ الکرسی پڑھ کر دم کر دیتیں۔ بیٹے بہو اور ہم ہر لباس میں وہ اور جاذب نظر لگتی۔ اسی طرح ہاسم جب اپنی گاڑی لے کر نکلتا تو سلمیٰ بیگم اس کو بھی پڑھ کر دم کر دیتیں۔ آج کل کے حالات آئے دن گاڑیوں موبائل اور پیسے چھیننے کے بعد قتل کے واقعات انہیں ہولا دیتے اور وہ ان بچوں کو دنیاوی آفات سے بچنے کی دعائیں کرتی رہتیں۔

بچوں کو بھی دادو سے خاص لگاؤ نہ تھا۔ بقول ان لوگوں کے دادو ایک دور میں بہت پرانے زمانے والی جو ہر وقت بس نصیحتیں کرنے کے موڈ میں رہتی ہیں۔

اس روز سلمیٰ بیگم بال بنا کر کنگھی سے فارغ ہو کر لاؤنج میں آ گئیں۔ تب ہی اریشہ وہاں آ گئی۔

"ہاؤ سوئیٹ دادو! آپ کے بال کتنے پیارے لمبے ہیں گھنے بھی۔" لمبے بالوں کو چھو کر وہ دیکھ کر وہ حیران تھی۔ ہمیشہ جوڑے کی قید میں رہنے والے آج آزاد تھے جو انہوں نے کر رہے تھے۔ "دادو! آپ اتنے اچھے بالوں کو کھلا رکھا کریں یار کتنے اچھے لگتے ہیں۔"

"اس عمر میں؟" سلمیٰ بیگم مسکرا دیں۔

"وہائی ناٹ دادو! میری فرینڈ کی گرینڈ ما ہیں وہ آپ کی طرح ہی ہیں انہوں نے اتنی اچھی کٹنگ کروائی ہے اور کپڑے بھی اتنے ڈیسنٹ پہنتی ہیں بالکل فیشن ایبل اور ان ماڈرن والے۔" وہ بڑے فخر سے بتا رہی تھی۔ "آپ بھی اتنی کیوٹ لگیں گی ذرا سا چینج ہو کر..."

"ریئلی!" وہ معصومیت سے بولی۔ سلمیٰ بیگم اس کی معصومیت پر زیر لب مسکرا دیں پھر آہستگی سے کہا۔

"بیٹا! خوب صورتی اللہ کی دی ہوئی ہے ہمیں اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا چاہیے تاکہ ان کی ناشکری نہ کریں۔ اس نے ہمیں اچھی شکل و صورت سے نوازا ہے۔ ہمیں شکل صحت و سلامتی اور بغیر معذوری کے بھرپور زندگی عطا کی ہے ہمیں دنیاوی نعمتوں سے مالا مال کیا ہے تو ہم بجائے شکر بندہ اپنے رب کے احسانات کا بدل تو نہیں دے سکتے ہاں! ہم اس کی نعمتوں کا شکر ادا کر سکتے ہیں ہاں! اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کی پابندی کر کے نماز اور قرآن پاک سے مستفید ہو کے ہمیں خود کو لوگوں میں پیش کرنے کا حکم نہیں میری بچی! ہم عورتوں کو تو خود کو چھپا کر رکھنے کا حکم ہے۔ اپنے بالوں کو اپنے جسم کو پردے میں رکھنے کا حکم ہے نہ کہ اسے لوگوں کے سامنے پیش کر کے داد وصول کریں۔"

"پلیز دادو!" وہ ایک دم کھڑی ہو گئی اور تڑپ سے تنگ کر کہا۔ "آپ سے اسی لیے بات نہیں کرتی کہ آپ الٹا لیکچر دینا شروع کر دیتی ہیں۔" کہہ کر وہ دھم دھم کرتی اندر کی طرف لوٹ گئی اور سلمیٰ بیگم گم صم اپنی چودہ سالہ پوتی کی پیٹھ تکتی رہیں کہ یا اللہ! ہماری نسل نیکی اور بھلائی کا راستہ کہاں کھو گئی میرے اللہ! انہیں اچھے اور برے کی تمیز کرنا سکھا دے۔ مزید وہ دل میں کہتے ہوئے جانماز پر بیٹھ گئیں۔

"پیچ" گھر میں سے زیادہ یہاں نیو ائیر کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس سال ہاسم اور اریشہ کے سب دوست آنے والے تھے۔ نیو ائیر گھر پر منانے کا پروگرام تھا۔ پورے گھر کو خوب سجایا گیا تھا رنگ برنگی قمقموں سے سارا گھر جگمگا رہا تھا۔ شام سے ہی خوب رونق تھی۔ نئے سال کی آمد پر کسی نے دعا کے طور پر بلکہ کیک اور ہلڑ بازی ہنگامہ تھا۔ خوب زور و شور سے وہ آنے والے سال کا استقبال کر رہے تھے۔

سلمیٰ بیگم کسی کام سے کمرے سے نکلیں تو سامنے سے ہاسم آتا دکھائی دیا ایک خوب صورت لڑکی کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اس قدر قریب تھا کہ سلمیٰ بیگم کی نگاہیں شرم سے جھک گئیں۔ لڑکی کے کپڑے ایسے کہ انہیں جھرجھری آ گئی اس قدر تنگ اور چھوٹی سی شرٹ ان پر تو گویا پہنے کپڑے لگ رہی تھی۔

"ہاسم!" انہوں نے آواز دی۔

"یس گرینڈ ما!"

"یہ کیا ہے بیٹا؟" انہوں نے واہیات لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

"وہاٹ! اوہ! مائی فرینڈ گرینڈ ما پلیز اپنے کمرے میں جائیں۔" وہ بدتمیزی سے کہتا ہوا آگے بڑھ گیا پیچھے ہی اسد تھا۔

"اسد بیٹا!" انہوں نے بیٹے کی جانب دیکھا۔

"جی اماں!" وہ ایک دم رکا۔

"یہ کیا اودھم بازی ہے؟ کیسی بے حیائی ہے بیٹا!" رقت زبان سے نکلا۔

"اوہو اماں! پلیز آپ ٹینس نہ ہوں۔ نیو جنریشن ہے جو اسی طرح سیلیبریٹ کرتی ہے نیو ائیر کو... آپ جائیں اپنے کمرے میں اور سو جائیں، کیوں جاگ رہی ہیں خواہ مخواہ!" لگا سا جواب دے کر وہ آگے بڑھ گیا۔ سلمیٰ بیگم دم بخود رہ گئیں۔ وہ کمرے میں آ گئیں اور دروازہ بند کر کے وضو کیا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے بارہ بجنے کے ساتھ ہی پورا علاقہ فائرنگ اور پٹاخوں کی آواز سے گونج اٹھا اور طوفان بدتمیزی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ بے ہنگم آوازیں بے ہودہ چیخیں اور بلند قہقہوں سے ماحول آلودہ ہونے لگا۔ سلمیٰ بیگم جائے نماز پر بیٹھی رو رو کر دعا کر رہی تھیں رب سے اپنی اولاد کی بھلائی کی بھیک مانگ رہی تھیں۔ وہ سوچ رہی تھیں کہ ان سے کہاں غلطی ہوئی جو ایسی اولاد کی صورت میں سزا مل رہی ہے۔

نہ جانے کتنی دیر یہ ہنگامہ جاری رہا اور وہ اپنے رب کے آگے سر بسجود ہو کر دعائیں اور خیر کی بھیک مانگتی رہیں۔ شب رات بہت بیت گئی تھی کہ اب سارے لوگ جا چکے تھے فجر میں کچھ وقت ہی رہ گیا طوفان بدتمیزی بھی تھم چکا تھا۔ سلمیٰ بیگم قرآن پاک کی تلاوت میں مگن تھیں کہ اچانک کوریڈور میں بہت سارے قدموں کی آواز آئی ساتھ ہی ایک فائر ہوا ارسل اور اریشہ کی چیخ بھی سنائی دی۔

"یا اللہ خیر!" وہ اسی طرح ہاتھوں میں قرآن پاک

لیے کمرے سے باہر بھاگیں۔ ڈرائنگ روم کا منظر دیکھ کر ان کے ہوش اڑ گئے چار لوگ کے ہاتھوں میں پستول لیے کھڑے تھے ان میں سے دو نے احد اور باسم کے سروں کو نشانے پر لے رکھا تھا۔ دوسری جانب اریشہ اور ارسلہ تھر تھر کانپتی ہوئی زار و قطار رو رہی تھیں۔ ایک پل میں سلمیٰ بیگم سمجھ گئیں کہ یہ چاروں ڈاکو ہیں مگر ان کی نظر اریشہ کی سرخ چوڑی اور ملبوس میں نظروں میں اٹکتی جا رہی تھی۔ ان لوگوں کی نظروں میں عجب وحشت تھی۔

"اسے یہاں جلدی کر۔" ایک بولا۔

"خدا کے لیے جو لینا ہے لو انہیں چھوڑ دو۔" ارسلہ گڑگڑائی۔

"ٹھیک ہے سیدھی طرح مال و زیور کے بدلے ایک یہ حسینہ دے دو۔" سامنے والا نوجوان خباثت سے بولا۔ ساتھ ہی سب نے قہقہہ لگایا۔

"دادو!" اریشہ نے روتے ہوئے سلمیٰ بیگم کی جانب دیکھا۔

"خدا ان کے ارادے تو ٹھیک نہیں لگتے۔" سلمیٰ بیگم لرز گئیں۔ ارسلہ تھر تھر کانپ رہی تھی احد اور باسم اس وقت خود کو بہت کمتر اور بے بس محسوس کر رہے تھے۔ اریشہ کو خوف لگ رہا ہونے لگا تھا جیسے موت سر پر آ کر کھڑی ہو۔ کس قدر بے بس اور لاچار تھے سب اس وقت اور دل سے اپنے رب کو پکار رہے تھے۔ کون تھا جو اس وقت ان کی مدد کو آتا۔ انہیں اس موت سے نجات دلاتا۔ سب لوگ ایک دوسرے کو بے بسی سے دیکھ ہی سکتے تھے۔ سامنے والا نوجوان آہستہ آہستہ اریشہ کی جانب بڑھنے لگا۔

"خدا کے لیے پلیز! جو چاہیے لے لو... پر لو..." ارسلہ نے جلدی جلدی سونے کی چوڑیاں، نیکلس اور انگوٹھیاں اتاریں۔ "اور جو کچھ بھی ہے گھر میں سب لے لو... خدارا آگے مت بڑھو۔ یا اللہ! رحم فرما ہم سب پر کرم کر... ہم گناہ گاروں پر اپنا کرم کر دے میرے مولا!" ارسلہ سسکتے ہوئے رب سے رحم کی طالب تھی۔ کرم کی بھیک مانگ رہی تھی۔ یک لخت سلمیٰ بیگم چونکیں ہاتھوں میں قرآن پاک لیے وہ اریشہ اور نوجوان ڈاکو کے درمیان آ گئیں اور ساتھ ہی... انہوں نے زور زور سے تلاوت شروع کر دی۔

"دیکھو! تم لوگوں کو خدا اور رسول کا واسطہ آگے مت بڑھنا۔" انہوں نے کہا۔ "میرے ہاتھوں میں پاک کتاب ہے جس کا تقدس ہر مسلمان پر فرض ہے اگر تم نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو اس کتاب کی بے حرمتی کا بہت بھیانک عذاب نازل ہوگا تم پر۔"

"ہٹ اماں! آنچ ہے۔" نوجوان بدتمیزی سے کہتا ہوا آگے بڑھا۔ "مرے گی کیا؟"

"ارے کیا سوچ رہا ہے یار مار بڑھیا کو۔" پیچھے والے نے لقمہ دیا۔

"ہاں ہاں! چلاؤ گولی مجھ پر تمہارے سامنے یہ مقدس کتاب ہے ارے تم کیا جانو کیسا عذاب اترے گا تم پر... تم سب کھڑے کھڑے جل جاؤ گے آج بھی تم جیسے درندوں کی درندگی اور بربریت کے باوجود یہ پاک کتاب معجزات دکھاتی ہے اللہ کو! چلاؤ گولی وہ مجھے کر دو اپنی من مانی۔" سلمیٰ بیگم کا انداز انتہائی جارحانہ تھا اور آگے بڑھتے بڑھتے اچانک نوجوان رک گیا اس کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔

"ارے یار! کھڑا کیوں ہو گیا ہے بڑھیا... تو آگے بڑھ۔" پیچھے والے نے پھر آواز لگائی آگے بڑھتا ہوا نوجوان یک لخت پلٹا اور اپنے ساتھی کو تھپڑ لگا دیا۔

"پاگل ہو گیا ہے کیا؟" ساتھی حیرت اور غصے سے بولا۔

"ہاں... ہاں... میں پاگل ہو گیا ہوں... پاگل کر دیا ہے مجھے اس پاک کتاب کی حرمت نے... آنکھیں کھول دی ہیں میری۔" وہ نوجوان چلا رہا تھا سب کی نظریں سب پر تھیں ان نظروں میں ندامت و پشیمانی اور جانے کیا کیا تھا ہاتھوں میں تھاما پستول زمین پر پھینک کر

وہ تیز تیز قدموں سے باہر کی طرف چلا گیا اس کی دیکھا دیکھی باقی تینوں نوجوان بھی باہر کی جانب بھاگے اریشہ اور ارسلہ دوڑ کر احد اور باسم سے لپٹ گئیں۔ سلمیٰ بیگم جیسے خواب سے جاگیں وہ وہیں بیٹھنے کو تھیں اتنے میں اس اور ہاتھوں میں تھاما قرآن پاک جھکی پر رکھا وہاں اس پر سر رکھ کر زار و قطار رونے لگیں سب لوگ جیسے بھیانک خواب سے جاگے ہوں۔ سلمیٰ بیگم نے سر اٹھایا تو چاروں ان کے قدموں میں بیٹھے تھے۔

"دادو! آپ گریٹ ہیں۔"

"سوری اماں... پلیز اماں ہمیں معاف کریں۔" چاروں بول رہے تھے سب کے لہجے ٹوٹ رہے تھے۔ شرمندگی اور ندامت کا احساس نمایاں تھا۔

"اماں اگر آپ اس وقت قرآن پاک نہ پڑھ رہی ہوتیں تو..." اس سے آگے سوچ کر ہی ارسلہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اریشہ بھی بری طرح رو رہی تھی۔

"آج میں دادو! آج تو ہمیں اللہ یاد آ گیا۔" باسم بھی دادو سے چھوٹے بچے کی طرح چپک جاتا تھا۔

"آپ بہت عظیم ہیں اماں!" احد بھی شرمندگی سے بولا۔

"اگر آج دادو ہمارے ساتھ نہ ہوتیں تو کیا ہوتا!"

"اللہ نہ کرے اریشہ... توبہ... توبہ... کیا نہ ہوتا؟ [illegible]" ارسلہ نے جھرجھری لے کر کہا۔

"یا اللہ! تیرا کرم ہے کہ ہم سب بچ گئے سلامت ہیں۔"

"اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرما۔" "آج سے ہم نئی زندگی کی ابتدا کریں گے ہم اس اللہ کو مانتے ہوں گے ہمارے دل میں وہی وحدت ہے۔" سب لوگ یک زبان ہو کر بولے سب ہی اذان فجر ہوئی تو سلمیٰ بیگم نماز کے لیے اٹھ گئیں۔

"اماں! ہم بھی آ رہے ہیں۔ میں اور اریشہ آپ کے ساتھ نماز فجر ادا کریں گے۔" انہیں اٹھتے دیکھ کر ارسلہ نے دھیرے سے کہا۔

"اور دادو! میں آپ کے ساتھ قرآن پاک بھی پڑھوں گی فجر کے بعد۔" اریشہ نے بھی کہا۔

"کیا؟" سلمیٰ بیگم نے بہو اور پھر پوتی کی جانب دیکھا۔

"جی اماں..." ارسلہ نگاہیں جھکا کر آہستگی سے بولی۔

"چلو بیٹا! ہم بھی مسجد چلیں۔" احد نے کہا تو باسم بھی کھڑا ہو گیا۔ سلمیٰ بیگم نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو وہ بھی سر جھکائے نادم سا کھڑا تھا۔

ابھی کچھ دیر پہلے اپنے رب سے وہ کس قدر گڑگڑا کر اپنی اولاد کی بھلائی کی بھیک مانگ رہی تھیں ایک خوف ناک واقعہ کی بدولت ہی سہی ان کی دعا کو شرف قبولیت عطا ہو گئی تھی۔

"یا اللہ! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ تو نے میری دعاؤں کی لاج رکھ لی۔ میرے آنسوؤں کا بھرم رکھا میرے رب تو نے آج میرے بچوں کو بھی سیدھی راہ دکھا دی۔" یوں تو گزشتہ کئی سالوں سے نیا سال منایا جاتا تھا لیکن اس بار آنے والے سال نے گویا ان کے گھر میں خوب صورت اجالے بکھیر دیے تھے۔ جس کی چاہت گزشتہ کئی برسوں سے سلمیٰ بیگم نے کی تھی آج وہ ماحول مل گیا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی دادی، ماں، بہو اور پوتی کو لیے خدا کے حضور سربسجود تھیں۔ جب کہ احد اور باسم نماز فجر ادا کرنے مسجد جا چکے تھے۔

نئے سال کا نیا سورج بہت ساری خوشیاں اور بہاریں لے کر ان کے آنگن میں اتر آیا تھا۔

☐



قسط نمبر ۹

[illegible]

شہناز بانو

[illegible] میں قسط کا محور 'زن' 'زر' زمین ہی ہے دنیا کا پہلا قتل بھی عورت ہی کی وجہ سے ہوا تھا یہ بڑا سلسلہ وار ناول جاری ہے موجودہ دور کی کہانی ہے [illegible]

محبت کی روایتی ڈگر سے شروع ہونے والی یہ طویل داستان جوں جوں آگے بڑھتی ہے [illegible]

اس طویل داستان میں محبت اور نفرت کے تمام رنگ اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود ہیں۔ [illegible]

[illegible]

کمرے کے ماحول میں گمبھیر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔

باس کے کہنے پر مجھے ایک شخص کو قتل کرنا تھا میں نے جذباتی ہو کر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا تھا جہاں میرا جواب سن کر باس کے چہرے پر مجھے رضامندی دکھائی دی وہیں کیپٹن کے چہرے پر میں نے ناپسندیدگی کے آثار دیکھے تھے اس اور دوسرے ساتھیوں کی موجودگی میں وہ مجھ سے کوئی بات نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے خاموش رہی مگر اس کے دل و دماغ میں کسی قسم کی ہلچل مچی ہوئی ہے میں واضح طور پر محسوس کر سکتا تھا جب کوئی دوسرا اس کی جانب نہیں دیکھ رہا تھا۔

باس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک لفافہ نکال لیا اور اس میں سے ایک کاغذ اور ایک پاسپورٹ سائز تصویر نکال کر میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اس پر ساری تفصیلات لکھی ہیں اور یہ اس شخص کی تصویر ہے جسے تمہیں اگلے جہاں روانہ کرنا ہے بس یوں سمجھو کہ یہ بھی تمہارا ایک طرح کا ٹیسٹ ہے ایک ٹیسٹ آج تمہارا ہوا یہ دوسرا ٹیسٹ ہے اور مجھے تمہاری ذہانت اور تمہاری بہادری سے امید ہے کہ تم اپنے اس ٹیسٹ میں بھی شاندار طریقے سے کامیاب لوٹو گے۔"

میں نے لفافہ کر باس کے ہاتھ سے دونوں چیزیں لے لیں اور اس شخص کی تصویر دیکھنے لگا یہ ایک چالیس پینتالیس سالہ صحت مند شخص کی تصویر تھی اس کے چہرے پر گھنی مونچھیں اور داڑھی تھی آنکھیں موٹی اور ابرو گھنے اور آپس میں جڑے ہوئے تھے سر کے بال گھنے اور

بڑے تھے مشکل سے ہی وہ شخص منظرِ عام پر دکھائی دے رہا تھا۔

تصویر کا اچھی طرح سے جائزہ لینے کے بعد میں نے کاغذ پر اس شخص کے بارے میں درج تفصیلات پر ایک نگاہ ڈالی اس کا نام سلطان احمد عرف سلو بھائی تھا۔ وہ ایک ٹرانسپورٹر تھا اور ایک ٹرک کمپنی کا مالک تھا اس کے ٹرک پورے پاکستان بھر میں ترسیل کا کام کرتے تھے اس کا آفس ملیر میں تھا لیکن اس کی رہائش کا کسی کو علم نہیں تھی۔

میں نے سلو بھائی کی تصویر اور کاغذ اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھا اور خوش اخلاق لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے باس ۔۔۔۔ آپ بے فکر رہیں میں اس کا کام تمام کرکے ہی آپ کو اپنی شکل دکھاؤں گا۔"

"مجھے تم سے کامیابی کی ہی امید ہے لیکن ایک بات یاد رہے شہروز کہ مجھے ایک ہی دن میں یہ کام ہوا چاہیے اور تم یہ بھی جان لو ۔۔۔۔ کہ میں دوسرا موقع کبھی نہیں دیا کرتا ناکام لوگوں کی میرے پاس کوئی گنجائش نہیں ہے۔" باس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ مجھے اس کی بار بار کی مسکراہٹ چڑانے والی لگی تھی تو وہ کوئی بھی بات ہو اس کے لبوں پر مسکراہٹ کھلی رہتی تھی۔ عجیب طرح کا انسان تھا یہ باس بھی۔

"اور ہاں ۔۔۔۔" اس نے تنبیہ کے انداز میں انگلی اٹھا کر کہا۔ "یہ تمام کام نہایت احتیاط اور ہوشمندی سے ہونا چاہیے تم کسی کی نگاہ میں نہ آؤ یہی تمہاری اصل کامیابی ہے اور اگر بالفرض تم کسی کی نگاہ میں آ بھی جاؤ تو تمہیں کسی بھی صورت مجھ سے رابطہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہاری کارکردگی میرے علم میں آ ہی جائے گی۔ میں بعد میں خود تم سے رابطہ کروں گا ۔۔۔۔ کچھ کہنے یا مزید سمجھانے کی ضرورت ہے۔"

"نہیں ۔۔۔۔" میں نے مختصر لہجے میں جواب دیا۔ "میں بھی بار بار کسی بات کو نہیں کہتا ۔۔۔۔ ایک ہی دفعہ بات میری سمجھ میں آ جاتی ہے۔"

"یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے اور تمہارا پلس پوائنٹ بھی ۔۔۔۔ ویسے تمہارے دماغ میں کیا چل رہا ہے تم اس کو کس طرح سے مارو گے۔" باس نے پوچھا۔

"آپ کا کیا خیال ہے مجھے یہ کام کس طرح کرنا چاہیے۔" میں نے پوچھا۔

"یہ فیصلہ تو تمہیں کرنا ہے میں کیا بتاؤں؟" باس نے ٹیبل پہ انگلیوں سے ٹھکے دیتے ہوئے کہا۔

"کیونکہ میرے پاس کوئی ہتھیار تو ہے نہیں اس لیے سوچ رہا ہوں کہ اسے ایکسیڈنٹ میں مار دیتا ہوں۔" میں نے کہا تو باس نے میری بات سن کر ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔

"میں تمہاری ذہانت سے کسی حد تک متاثر ہوا ہوں۔ اسلحہ کی تم فکر نہ کرو تم جابر کے ساتھ چلے جاؤ تمہیں تمہارا مطلوبہ ہتھیار فراہم کر دے گا ہمارے پاس ہر قسم کے اسلحہ کا ذخیرہ ہے جو تم پسند کرو لے لو ۔۔۔۔ اور ہاں ۔۔۔۔" اس نے جابر کی جانب دیکھا اور اس سے مخاطب ہوا۔

"تم ایک دو ریوالور یا پستول جو یہ پسند کرے اس کو دے دو ۔۔۔۔ تم اس کی ہیلپ پر رہو گے لیکن اس کے کام میں اس کی کسی بھی قسم کی مدد نہیں کرنا ہے۔"

"او کے باس ۔۔۔۔" جابر نے مستعدی سے کہا۔

"ٹھیک ہے اب تم لوگ جاؤ اور تم نے کر دکھانا ہے یہ طاقت دکھانا ہے یا نہیں اگر نہیں تو جابر تمہاری رہنمائی کرے گا یہ تمہیں سلو کا آفس اور رہائش گاہ دونوں مقامات کو دکھا دے گا پھر تمہیں خود فیصلہ کرنا ہے کہ اسے کہاں اور کس جگہ مارنا ہے تمہارے پاس صرف چوبیس گھنٹے ۔۔۔۔" باس نے کہا۔

"او کے باس ۔۔۔۔" اس مرتبہ میں نے بھی جابر کے انداز میں کہا اور اٹھ کھڑا ہوا چلتے چلتے میں نے کیئر کی جانب ایک نگاہ ڈالی اس کے چہرے پر ابھی بھی مجھے پریشانی دکھائی دے رہی تھی اس کے علاوہ دوسرے لوگ بھی حیران تھے میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیئر اس بات سے اس قدر پریشان کیوں ہے کیا وہ مجھے کسی قتل سے روکنا چاہتی ہے مجھے کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اگر میں قتل والے مشن پر روانہ ہو جاتا تو کیئر سے میری بات ہو جاتی اور میں اس سے اس کا سبب معلوم کرتا لیکن میرے پاس بہت کم ٹائم تھا اور مجھے اپنا یہ ٹاسک مکمل کرنا تھا۔

سب کو اس جگہ بیٹھا چھوڑ کر میں جابر کے ساتھ اس کمرے سے نکل آیا جابر مجھے لے کر وہاں پہنچا کہ تین روز مجھے کسی جانب آتا پڑا پہلے میں نے اس پر غور نہیں کیا تھا مگر اب اس کمرے کے علاوہ جہاں سلطان اور کیئر کے شکاری کتوں کی خوراک بنے تھے ایک اور کمرہ تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ایک اور بڑا کمرہ تین روز بند ہوا تھا۔

یہاں آ کر چند گھنٹے پہلے کے وہ سارے دردناک منظر میری آنکھوں کے سامنے گھوم گئے کمرہ بالکل پہلے کی طرح صاف ستھرا تھا اور چند گھنٹے پہلے ہونے والی اس واردات کا کوئی نشان بھی یہاں باقی نہیں تھا بلکہ ایک عجیب طرح کی خوشبو یہاں پھیلی ہوئی تھی شاید اس جگہ کو یہاں سے ابھی کچھ دیر پہلے صاف کیا گیا تھا۔

اندر مجھے چند لوگ اور دکھائی دیے مگر کسی نے بھی ہم دونوں اور جابر کی جانب کوئی توجہ نہیں دی کہ جیسے کوئی اجنبی دیکھ کر انسان کی آنکھیں بے ساختہ اٹھ ہی جاتی ہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے ہماری جانب دیکھنا ان سے کوئی بڑا جرم سرزد ہو جائے گا۔

تبھی ایک جانب میں نے شکاری کتوں کا وہ بڑا سا لوہے کا پنجرہ بھی دیکھا اس وقت وہاں شانتی چھائی ہوئی تھی کتے پیٹ بھرنے کے بعد آنکھیں موندے مزے سے پنجرے میں لیٹے ہوئے تھے۔

جابر مجھے لے کر ایک اور کمرے میں آیا یہاں قد آور الماریاں بنی ہوئی تھیں۔ جابر نے ایک الماری کھولی تو میں نے دیکھا یہاں ہر قسم کا اسلحہ موجود ہے جابر نے ایک ریوالور نکال کر میرے حوالے کیا جس پر سائلنسر لگا ہوا تھا۔

"یہ لو ۔۔۔۔ تم یہ ریوالور رکھو اس میں سائلنسر لگا ہوا ہے تم اس سے آرام سے اپنا کام کر سکتے ہو۔" اس نے ریوالور میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

میں نے ریوالور ہاتھ میں لے لیا اور الٹ پلٹ کر اچھی طرح سے اس کا جائزہ لیا۔ اس کا چیمبر کھول کر دیکھا وہ لوڈ تھا۔

"اسے اپنی شرٹ کے اندر لگاؤ۔" جابر نے کہا۔

میں نے جابر کی ہدایت پر ریوالور اپنی شرٹ کے اندر ایڈجسٹ کر لیا۔

"تم پریشان تو نہیں ہو۔" جابر نے پوچھا۔

"بالکل نہیں۔" میں نے کہا۔

"ایک بات یاد رکھنا باس بڑے ہی دیالو انسان ہیں اگر تم اچھی طرح سے کام کرتے رہو گے تو وہ تمہارے کام سے خوش ہو کر ایک بہتر زندگی تمہیں عطا کریں گے لڑکیاں شراب سب کچھ دے گا اور پھر تم اپنے دشمنوں سے بھی بدلہ لے سکو گے۔" جابر نے کہا۔

"مجھے نہ خوب صورت زندگی کی خواہش ہے اور نہ لڑکیوں اور شراب کی ۔۔۔۔ تم لوگوں کے ساتھ شامل ہونے کا میرا واحد مقصد صرف اور صرف اپنے دشمنوں کو کیفر کردار تک پہنچانا ہے۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"فکر نہ کرو اگر تمہیں فوراً ہی اپنے دشمنوں کو ٹھکانے

نکلنے کا موقع مل جاتا ہے تو پھر تم اس کے بعد کیا کرو گے، باس کو چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔" جابر نے چبھتے لہجے میں کہا۔

"ظاہر ہے پھر مجھے تم لوگوں کے ساتھ مل کر قتل و غارت گری کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے لاتعلقانہ انداز میں کہہ ڈالا۔

میرا جواب سن کر جابر نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور دیر تک ہنستا رہا، وہ اس طرح سے ہنس رہا تھا جیسے میں نے کوئی مزے دار لطیفہ سنایا ہو۔

"کیا ہوا..... اس طرح سے کیوں ہنس رہے ہو، میں نے کیا کوئی جوک سنایا ہے تمہیں۔" میں نے حیرت سے کہا تو اس کی ہنسی کو ایک دم بریک لگ گیا اور وہ گہرے لہجے میں بولا۔

"تم اس کی بات بھول گئے۔ یہاں آنے کے کئی راستے ہیں مگر واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے، کیا تم سلطان اور ہری کا انجام بھول گئے۔"

"کیا مطلب.....؟" میں نے چونک کر کہا۔

"تم اتنے ہی معصوم اور بھولے ہو یا بننے کی اداکاری کر رہے ہو..... تم باس سے مل لیے یہاں تک آ گئے..... بہت کچھ جان لیا..... اور اب واپسی کی بات کر رہے ہو۔" اس نے اپنی آنکھیں کو میری آنکھوں میں گاڑتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں..... وہ میں....." میں ہکلا کر رہ گیا۔

"تمہیں پریشان ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا بس باس سے کبھی غداری اور یہاں سے واپسی کا بھی مت سوچنا..... تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہے گا..... آؤ چلیں۔" میرے پریشان ہو جانے پر جابر نے نرم لہجے میں میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا اور میں جابر کے ساتھ اس بنگلے سے باہر آ گیا۔

واپس آتے ہوئے میرا ذہن مسلسل جابر کی باتوں میں الجھا ہوا تھا، بلکہ میں پریشان بھی ہو رہا تھا کہ میں اپنا انتقام لینے کے چکر میں کن لوگوں کے درمیان آ کر پھنس گیا ہوں، کیا ان لوگوں کا ساتھ حاصل کرنے کے لیے مجھے وہ سارے کام کرنے پڑیں گے جو یہ لوگ کرتے ہیں اور پھر اپنے انتقام کی آگ بجھانے کے بعد میں کیا ان کو چھوڑ کر جا سکوں گا، پھر مجھے جابر کی دھمکی بھی یاد آنے لگی، یہ لوگ مجھے کسی حال میں بھی نہیں چھوڑیں گے اگر انہیں ذرا بھی شک ہو گیا کہ میں صرف اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے ان کے ساتھ ہوں تو یہ لوگ ابھی میرا کام تمام کر دیں گے چاہے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے مجھے باس کا اعتماد جیتنا ہی ہوگا بعد میں جیسا موقع ملے گا دیکھوں گا۔

"کن سوچوں میں گم ہو۔" جابر جو کار ڈرائیو کر رہا تھا بہت دیر سے میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہا تھا آخر پوچھ ہی بیٹھا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے ایک گہری سانس اپنے اندر اتارتے ہوئے کہا۔ "میں نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا ہے اور خود کو پوری طرح تم لوگوں کے حوالے کر دیا ہے، میرے پاس کوئی چارہ بھی نہیں ہے کہ میں بہت بہادری کا مظاہرہ کروں یا باس کی کوئی بات ماننے سے انکار کروں، اگر میں ایسا کروں گا تو یہ بہت بڑی بے وقوفی ہوگی اور پھر مجھے اپنی اس بے وقوفی کی کڑی سزا بھی بھگتنا پڑے گی۔"

"تم نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے، لیکن بس ایک بات یاد رکھنا، باس صرف زبانی باتوں پر یقین نہیں رکھتے بلکہ قدم قدم پر تمہیں یہ بات عملی طور پر ثابت کرنی ہوگی۔" جابر نے نرم لہجے میں کہا۔

اور پھر راستے میں ہم مزید ایسی ہی باتیں کرتے رہے، جابر کراچی کی تمام بڑی شاہراہوں کے بارے میں

مجھے بتا رہا تھا مختلف علاقوں میں کون کون سی شاہراہیں
سے گزر رہا تھا اور کچھ اشارے کرتے ہوئے بھی اس نے
مجھے بتائے۔ ویسے "حمد اور کلیم" مجھے کافی حد تک کچھ دکھا اور بتا
چکے تھے اور اب میں کراچی کے علاقوں اور سڑکوں سے
اتنا انجان نہیں رہا تھا۔

جابر نے مجھے ناظم آباد میں سلو بھائی کی رہائش
گاہ دکھائی پھر مارکیٹ میں اس کا آفس دکھایا۔

"فلیٹ چل کر کچھ دیر آرام کرنا چاہو تو واپس چلو
ریسٹ کرنے کے بعد آ جانا۔" جابر نے کہا۔

"ہاں چلو میں لیٹنا چاہتا ہوں تاکہ پوری طرح
سے فریش ہو سکوں پھر مجھے تمہارے تو سارے کام کرنے
ہیں۔" میں نے کہا تو جابر نے کار گلشن اقبال کی جانب
جانے والے روڈ پر موڑ لی۔

فلیٹ پر میں اور جابر آئے تو معلوم ہوا کہ ابھی تک
وہ لوگ واپس نہیں آئے ہیں۔ میں نے اس کا سبب
جابر سے پوچھا تو بولا۔ "ہو سکتا ہے باس نے انہیں
بھی کوئی کام بتا دیا ہو ویسے تم دوسروں کی ٹوہ میں زیادہ
مت رہا کرو کہ کون کہاں ہے کیوں ہے کیا کر رہا ہے
کہاں جا رہا ہے یہاں سب کو صرف اپنی اپنی ذمہ
داریاں پوری کرنے سے مطلب ہوتا ہے تمہیں بھی
یہی کرنا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے آئندہ تمہیں کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"
میں نے جواب دیا پھر میں نے نیم گرم پانی سے اچھی
طرح سے غسل کیا اور بلیک کافی پی کر پوری طرح چاق
وچوبند ہو گیا اب تو مجھے کچھ کھانے کی حاجت بھی ختم
ہو گئی میں [illegible] کر سکتا تھا۔

میں وہاں سے گاڑی لے کر نکلا اور سیدھا سلو بھائی
کے آفس کی جانب گیا۔ میں نے اس کی جگہ سے تھوڑے
فاصلے پر گاڑی روک دی۔ یہاں ادھر ادھر بہت سے لوگ
اور گاڑیاں کھڑی تھیں۔ سلو بھائی کے دفتر کے علاوہ یہاں
دوسرے فرنیچرز کے دفاتر بھی موجود تھے اور دکانیں
بھی تھیں۔ لوگوں کی بھی کافی ریل پیل تھی۔

میں کار سے اتر آیا اور اسے لاک کر کے فرنیچرز
کے دفاتر اور دکانوں پر ادھر ادھر نگاہ ڈالتے ہوئے
آگے بڑھنے لگا۔ مجھے دیکھنے والے یہی سمجھتے کہ مجھے کسی
خاص دکان یا دفتر کی تلاش ہے۔

تب ہی نہ جانے کیوں میں نے یونہی گردن گھما
کر دیکھ لیا حالانکہ اس کی کوئی خاص وجہ بھی نہیں تھی
ہاں میری چھٹی حس نے مجھے اس بات کا احساس
دلایا تھا میں نے ایک جھلک جابر کی دیکھی تھی وہ تیزی
کے ساتھ وہاں کھڑی ایک گاڑی کے پیچھے ہو گیا لیکن
میں اسے دیکھ چکا تھا اس کے ساتھ ایک آدمی اور
تھا جس کی شکل میری [illegible] تھی۔ مجھے باس کی بات یاد
آئی اس نے جابر کو ہدایت کی تھی کہ شہروز کی ریکی پر رہنا
لیکن [illegible] بھی ہو سکتا ہے کہ یہ میرے کام کی
نگرانی کر رہا ہو کہ میں کس طرح کام انجام دیتا ہوں۔

میں دکانوں اور دفتروں کے بورڈ پر نگاہ ڈالتا ہوا
سلو بھائی کے دفتر کے سامنے رک گیا۔ میں نے شیشے کی
دیوار کے پار دیکھا اندر کرسیوں پر کئی لوگ بیٹھے تھے
لیکن میری نگاہ اپنے شکار کو تلاش کر رہی تھی پھر میں نے
اسے دیکھ بھی لیا اور پہچان بھی لیا بڑی سی میز کے پیچھے
ایک کرسی پر وہی بیٹھا تھا اس کا حلیہ ہی ایسا تھا
کہ اسے پہچاننا کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔

میں بس چند لمحے ہی اس کے دفتر کے سامنے رکا
تھا اور ان چند لمحوں میں میں نے سلو بھائی کی موجودگی
کا یقین کر لیا تھا کہ وہ اس وقت اپنے آفس میں موجود
ہے مجھے اسے کہیں اور تلاش کرنے کی ضرورت نہیں
ہے۔

پھر میں اس طرح سے اس کے آفس کے سامنے
سے ہٹ گیا کہ جیسے مجھے کسی اور کی تلاش ہے سلو بھائی

کے آفس سے چند قدم کے فاصلے پر ایک چائے کا
ہوٹل تھا میں بے پروائی سے چلتا ہوا ہوٹل کے باہر
بچھی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ میرے
علاوہ دوسری کرسیوں پر اور بھی بہت سے لوگ بیٹھے تھے
ہوٹل کے بیرے نے [illegible] ایک لڑکا بیرا
لیے میرے پاس آیا تو میں نے اس سے ایک چائے
لانے کا کہہ دیا۔

یہاں بیٹھ کر میں غیر محسوس انداز میں ادھر ادھر گردن
گھما کر لوگوں کو دیکھنے لگا لیکن دراصل میں جابر کو دیکھ رہا
تھا کہ وہ اب کس جگہ موجود ہے لیکن وہ مجھے کہیں دکھائی
نہیں دیا اس نے یقیناً مجھے گردن موڑتے ہوئے دیکھ لیا
تھا اس لیے اس نے اپنے آپ کو میری نگاہوں سے
چھپا لیا تھا لیکن ابھی تک مجھے ایک شک اور ہو رہا تھا
[illegible] وہ کسی نامعلوم جگہ سے مسلسل
میرا جائزہ لے رہا ہوگا میں اس کی موجودگی سے واقف
ہو گیا تھا۔

پانچ منٹ سے بھی کم عرصہ میں بیرا میرے لیے
گرم گرم چائے لے کر آ گیا۔ میں نے چائے پی کر بل
ادا کیا وہاں کھڑا ہوا میں ایک بار پھر سلو بھائی کے آفس
کے سامنے پہنچ گیا۔ میں نے شیشے کی دیوار کے پار سلو
بھائی کو دیکھا تھا وہ میز کی دوسری جانب کرسی پر بیٹھے
شخص سے باتوں میں مصروف تھا۔ میں ذرا [illegible]
[illegible] کے سامنے کھڑا ہو گیا کیونکہ میں چاہتا تھا کہ وہ
مجھے دیکھ لے اور پھر ایسا ہی ہوا باتیں کرتے کرتے اس
کی نگاہ میرے اوپر پڑی تو میں نے اسے آنکھ سے
اشارہ کیا۔

مجھے ایسا کرتے دیکھ کر اس کے چہرے کے
تاثرات تبدیل ہو گئے اور وہ چونک پڑا پھر اس کے
چہرے پر الجھن کے آثار دکھائی دینے لگے وہ میرے
لیے اجنبی تھا میری ذات اس کے لیے بالکل اجنبی
تھی ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے قطعی اجنبی
تھے وہ یہ سوچ رہا ہوگا کہ میں کون ہوں اور میں نے
اسے آنکھ سے کیوں اشارہ کیا ہے اس سے پہلے کہ سلو
بھائی کے چہرے پر الجھن اور پریشانی کے تاثرات
دیکھ کر سامنے بیٹھا ہوا شخص پیچھے مڑ کر دیکھتا میں نے
باہر بورڈ پر لکھا ہوا سلو بھائی کے آفس کا نمبر ذہن نشین
کیا اور تیزی کے ساتھ چلتا ہوا اپنی کار میں آ کر بیٹھ
گیا۔

کار میں بیٹھ کر میں نے عقبی آئینے پر نگاہ ڈالی تو
سلو بھائی کسی شخص کے ساتھ آفس کے باہر کھڑا ہوا
دکھائی دیا وہ دونوں باتیں کر رہے تھے۔

میں نے تیزی کے ساتھ اپنی کار وہاں سے نکالی اور
بھگانے لگا میں دراصل جابر کو چکمہ دینے کی کوشش
کر رہا تھا۔

کار کو تیزی سے دوڑاتے ہوئے میں بار بار بیک
مرر میں دیکھ رہا تھا کہ جابر کی کار تو میرے پیچھے نہیں
آ رہی لیکن جابر مجھے اپنے تعاقب میں آتا ہوا دکھائی
نہیں دیا میں مطمئن ہو گیا اور اپنی کار ایک پبلک کال
آفس کے سامنے روک دی میں کار سے اتر کر اندر آیا
اس طرف زیادہ لوگ نہیں تھے اکا دکا لوگ آ جا رہے
تھے میں نے اندر جا کر ایک بار پھر باہر کا جائزہ لیا کہ
شاید جابر کہیں سے نکل کر آ گیا ہو مگر مجھے جابر دکھائی
نہیں دیا البتہ ایک [illegible] آ کر وہاں رک گیا شاید
اسے بھی کسی کو کال کرنی تھی وہ [illegible] سے اتر کر میرے
باہر آنے کا انتظار کرنے لگا میں نے اس شخص پر نگاہ
ڈالی اس کے کندھے سے ایک [illegible] لٹکا ہوا تھا وہ بے
پروا انداز میں سگریٹ نکال کے سلگا کے کش لینے لگا
اس کی نگاہیں دوڑتی ہوئی آتی جاتی گاڑیوں پر تھیں۔

اس جانب سے مطمئن ہو کر میں نے سلو بھائی کے
آفس کا نمبر ذہن میں دہرایا پھر ریسیور اٹھا کر نمبر ملا دیا۔

نمبر ملتے ہی گھنٹی بجنے لگی تین چار گھنٹیاں بجنے کے بعد کسی نے فون ریسیو کیا اور ایک بھاری سی آواز سنائی دی۔

"ہاں..... کون بولتا ہے؟"

میں سمجھ گیا کہ یہ سلو بھائی ہی کی آواز ہے اس لیے میں نے اپنی آواز اور لہجے میں بے چینی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"سلو بھائی بول رہے ہیں؟"

"ہاں..... ام بولتا ہے..... تم کون؟"

"سلو بھائی ابھی آپ کے آفس سے باہر ایک لڑکے نے آپ کو گولی ماری تھی میں وہی لڑکا ہوں۔"

میں نے تیز تیز بولتے ہوئے کہا۔

"ہاں..... یاد آیا..... تم نے ام کو گولی کیوں مارا..... کیا چاہتا ہے اے تم.....؟" اس نے کچھ اور بگڑتے ہوئے ترنگ میں آتے ہوئے کہا۔

"سلو بھائی آپ کی جان کو خطرہ ہے..... کسی نے آپ کو جان سے مارنے کی سپاری دی ہے۔ میں آپ کو اس شخص کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔ آپ ایسا کریں کہ یہ بات کسی کو بھی بتائے بغیر فوراً وہاں سے نکلیں.....؟" میں نے اس سے بھی زیادہ تیزی سے کہا۔

"کیا بکتی اے تم..... کون اے وہ.....؟" اس نے ناقابل بیان گالی دیتے ہوئے غصے سے کہا۔

"وہ سب میں آپ کو ملنے پر بتاؤں گا بلکہ بہت کچھ بتاتا ہے۔ بس آپ دیر مت کریں اور فوراً چلے آئیں۔" میں نے بے قرار لہجے میں کہا۔

"اوئے تم ام کو ابھی بتاؤ ام خود اس کا سپاری دے گی..... سلو بھائی کو مارنا اتنا آسان بات نہیں اے۔"

"میں اس وقت ہی تو نہیں بتا سکتا۔ میرے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے اگر آپ کو اپنی جان پیاری ہے تو فوراً وہاں سے نکلیں..... وہ شخص تمہارے آفس کے آس پاس ہے۔" میں نے کہا۔

"یار تم ام کو پریشان مت کرو..... اس کا نام بتاؤ ام پھر سوچے گا.....؟" اس نے ڈھکوکی کیفیت میں پریشان کن لہجے میں کہا۔

میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا کہ آفس کے باہر پولیس بھی تو آ گئی اور میں نے یہ سوچ کر کہا۔

"دیکھیں سلو بھائی ابھی آپ خاموش رہنا کوئی کارروائی مت کرنا میں اس شرط پر اس کا نام آپ کو بتاؤں گا۔"

"ہاں ام وعدہ کرتی اے اپنی کسی کو کچھ نہیں بتائے گی۔ تم اس خبیث کا بچہ کا نام بولو.....؟" اس نے تیز تیز سانس لیتے ہوئے کہا۔

"اس کا نام حاجی غلام حسین ہے۔" میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اوئے خدائی خوار..... وہ خبیث امارے کو مارنا چاہتی اے..... ام سمجھ گئی اے وہ ایسا کیوں کر رہی اے..... اپنی ام تم سے آ کر ملتی ہے ساری بات سمجھتی اے پر اس سے بات کرے گی..... لیکن تم ادھر پاس کیوں نہیں آتی..... ادھر آ جاؤ آرام سے بیٹھ کر بات کرے گی۔" وہ اب بھی آنے میں ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا۔

"نہیں سلو بھائی میں اوھر نہیں آ سکتا ادھر وہ میرا ساتھی گھوم رہا ہے اگر اس نے مجھے تم سے بات کرتے ہوئے دیکھ لیا تو میں مارا جاؤں گا۔ پلیز تم پھر بھی نہیں....." میں نے زچ ہونے والے انداز میں کہا۔

"آپ ام کو ایک بات بولو..... تم ام کو کیوں بچانا چاہتی اے؟" اس نے آخری ہار بار اطمینان کرنا چاہا۔

"بات یہ ہے سلو بھائی کہ تم میرے کچھ نہیں لگتے اور نہ ہی یہ کام میں تمہاری محبت اور ہمدردی میں کر رہا ہوں۔ میں حاجی غلام حسین کا پالتو کتا ہوں اور وہ اتنا کمینہ آدمی ہے کہ جانوروں کی طرح کام لینے کے بعد بھی کچھ نہیں دیتا بلکہ الٹا سیدھی دھمکیاں دیتا ہے۔ میں نے اتفاق سے چھپ کر اس کی ساری باتیں سن لی ہیں۔ اس نے کچھ ایسا چکر چلایا ہے کہ تمہیں مارنے کے بعد وہ تمہارا سارا کاروبار اپنے قبضے میں کرنے کا۔ بس تم فوراً آ جاؤ تاکہ میں تمہیں تفصیل سے ساری بات بتاؤں۔"

"لیکن ام باہر نکلے گی تو وہ ام کو مارے گی۔" اس نے کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے سلو بھائی میں تو صرف تمہارے لیے اتنا ہی کر سکتا تھا اب تم مرنا ہی چاہتے ہو تو خوشی سے مر جاؤ" مجھے کیا..... وہ ایک چند گھنٹے تمہارے آفس میں مارے گا اور تمہارا کام تمام ہو جائے گا۔" میں نے خفیف لہجے میں کہا۔

"او خانہ خراب کا بچہ ام کیا کرے کدھر جائے..... ام آتی ہوں..... تم ام کو جگہ بتاؤ..... ام پچھلے دروازے سے باہر نکلے گی۔" اس نے گھبرا کر کہا۔

"یہ ٹھیک رہے گا اور ہاں یاد رہے سلو بھائی ابھی یہ بات کسی کو نہیں بتانی ہے پہلے تمہیں ساری بات بتاؤں پھر تم بعد میں فیصلہ کرنا کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔

"اپنی جگہ کا نام بولو.....؟" اس نے پوچھا تو میں نے مرجانی ٹاؤن میں بننے والی ایک ادھوری عمارت کے بارے میں بتا دیا۔ یہ ایک چھ منزلہ عمارت تھی جس کا اسٹرکچر کھڑا تھا اور کام بند ہو گیا تھا۔ اس نے جواب دیا کہ وہ آدھے گھنٹے تک وہاں پہنچ رہا ہے۔

اس سے بات کرنے کے بعد میں سیدھا مرجانی ٹاؤن کی جانب تیزی سے گاڑی بھگاتا ہوا جا رہا تھا۔ وہاں پہنچ کر میں نے کار باہر پارک کی اور اوپر ایک تھوڑی جگہ پر جا کر کھڑا ہو گیا میری آنکھیں عمارت کے گیٹ پر لگی ہوئی تھیں۔

میرے پہنچنے کے دس منٹ بعد ہی مجھے دور سے ایک بلیک کرولا آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ میری گاڑی کے برابر میں رک گئی چند لمحوں بعد اس میں سے سلو بھائی باہر نکلا اس نے میری گاڑی کے اندر جھانک کر دیکھا..... مجھے اس کا شاید میں اپنی گاڑی کے اندر بیٹھ کر اس کا انتظار کر رہا ہوں لیکن مجھے اندر نہ پا کر اس کے چہرے پر الجھن کے آثار دکھائی دیے وہ چند لمحوں تک کھڑا کچھ سوچتا رہا۔

میں سمجھ گیا کہ سلو بھائی خاصا سمجھ دار آدمی ہے وہ مشکل سے ہی کسی پر بھروسہ کرتا ہے۔

وہ اس ویران اور سنسان جگہ پر تنہا آ تو گیا تھا لیکن اب اندر آتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ یہاں سے چلا جائے میں اپنا کام مکمل کر کے جلد از جلد یہاں سے چلے جانا چاہتا تھا اس لیے میں نے اسے آواز دی۔

"سلو بھائی اندر آ جائیں۔"

اس نے آواز کی سمت تیزی سے گھوم کر دیکھا تو میں نے سامنے آ کر ہاتھ ہلایا اور اسے اوپر بلایا۔

میرے اوپر اس کی نگاہ پڑی تو وہ اندر آنے لگا جتنی دیر میں وہ اوپر آیا میں پوری طرح الرٹ ہو کر کھڑا ہو گیا اور پھر ساری آواز میں ہو گیا۔

سلو بھائی سیڑھیاں چڑھتا ہوا منزل ہی منزل میں کچھ بڑبڑاتا ہوا اوپر آ رہا تھا پھر قدموں کی آہٹ بالکل نزدیک آ گئی اور سلو بھائی اندر داخل ہو گیا۔ میرے لیے بس اتنا ہی کافی تھا سلو بھائی میرے نشانے پر مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر تھا اس کی پشت میری

جانب تھی۔
"کدھر گئے تم....." اس نے اندر داخل ہو کر کہا اور جواب میں میرے ریوالور سے شعلے نکلے اور سلو بھائی اوندھے منہ زمین پر گر پڑا۔
میں نے اپنی تسلی کے لیے دو بار فائر اس کی پشت پر اور ایک کھوپڑی پر کیا گھر ہی لمحے میں تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے جا رہا تھا۔ نیچے اتر کر میں نے ریوالور اندر اپنی شرٹ میں سیٹ کر لیا اور اپنی گاڑی اسٹارٹ کر کے تیزی سے وہاں سے روانہ ہو گیا۔
راستے میں میں نارمل رفتار میں ڈرائیونگ کرنے لگا کہ کہیں تیز رفتاری دیکھ کر ٹریفک پولیس مجھے روک نہ لے۔
راستے میں ٹریفک جام ضرور ملا مگر اس کے علاوہ اور کسی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ میں با آسانی اپنے فلیٹ پر پہنچ گیا۔
میں جیسا چھوڑ کر گیا تھا فلیٹ ویسا ہی تھا ابھی تک کوئی بھی واپس نہیں آیا تھا۔ البتہ جابر مجھے فلیٹ میں مل گیا۔
مجھے دیکھتے ہی وہ مسکرانے لگا۔ "کیا ہوا تمہیں پتہ چل گیا۔" میں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔
"کس بات کا؟" اس نے سوال کیا۔
"یہی کہ میں نے اپنا کام کامیابی کے ساتھ مکمل کرلیا ہے۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
"ہوں....." اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اور باس کو بھی تمہارے اس کارنامے کی اطلاع مل چکی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں ان کی کال تمہارے پاس آجائے گی۔"
میں نے جابر کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور سیدھا اپنے کمرے میں آ کر بیڈ پر یوں لیٹ گیا جیسے طویل سفر کر کے آیا ہوں۔
تو تم ایک مسیحا سے قاتل بن گئے..... اور بھی نہ جانے تمہارے ہاتھوں کتنے بے گناہ مارے جانے والے ہیں....." میرے اندر سے کوئی چیخ چیخ کر نفرت انگیز لہجے میں کہہ رہا تھا۔
"کوئی بے گناہ نہیں ہے جس کو اس نے جتنا کوئی نہ کوئی گناہ ضرور کیا ہو گا۔ اسے اس کی سزا ملی ہے۔" میں نے اپنے اندر سے چیخنے والے انسان سے کہا۔
میری یہ جنگ اور بھی نہ جانے کتنی دیر جاری رہتی کہ میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے نمبر دیکھا تو وہ ان نون نمبر تھا۔ میں نے محتاط ہو کر فون ریسیو کرنے کا بٹن دبا دیا اور کان سے لگا کر دھیمی آواز میں کہا۔
"یس....."
"ویل ڈن شہروز..... تم نے انتہائی عقل مندی اور مہارت سے پلان کیا اور اس پر عمل بھی کروالیا۔" میرے کانوں میں باس کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔
"لیکن آپ کو میری پلاننگ کا کیسے پتہ چلا ابھی تو میں نے کسی کو کچھ بتایا بھی نہیں۔" میں نے حیرت سے کہا۔ میری بات سن کر اس نے ایک اونچا قہقہہ لگایا اور بولا۔
"میری کئی آنکھیں اور کان ہیں۔ جنہیں میں سوتے وقت بھی کھلا رکھتا ہوں۔ ویل تمہارا انعام ابھی تھوڑی دیر میں تم تک پہنچ جائے گا جو چاہو عیاشی کرو..... پھر ملاقات ہو گی۔"
یہ کہہ کر باس نے فون بند کر دیا اور میں نے فون بند کر کے بیڈ پر پھینک دیا نہ جانے کیوں میری آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی اتر آیا۔
میں تیزی سے اٹھا اور باتھ روم میں جا کر صابن سے رگڑ رگڑ کر اپنے ہاتھوں کو دھونے لگا۔ میں لاشعوری

طور پر سلو بھائی کا بے گناہ خون اپنے ہاتھوں سے دھونے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر غیر ارادی طور پر میں نے وضو کیا اور میں باہر نکل آیا۔
میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ یہ گناہ کبیرہ کیا تھا اس لیے دل پر بہت بوجھ محسوس کر رہا تھا۔ پیچھے کہ ایسوں کی بدی نے میرے دل میں اندھیرے کر دیئے تھے لیکن میں صرف ان لوگوں کو مارنا چاہتا تھا جو میرے گناہ گار تھے۔ دوسروں سے میرا کیا لینا دینا تھا لیکن اس جوش انتقام میں میں بہت بڑے گڑھے میں گرنے کے نتیجے چڑھ گیا تھا آگے اب یہ لوگ مجھ سے اور بھی نہ جانے کیا کیا کام کروانے والے تھے۔
میں لاؤنج میں آ کر صوفے پر چپ چاپ بیٹھ گیا۔ میرا ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ دوسرے صوفے پر مجھ سے تھوڑے فاصلے پر جابر اپنے سیل فون کے ساتھ مصروف تھا۔
"جب پہلی دفعہ اپنے ہاتھوں سے کوئی انسانی جان جاتی ہے تو اس کی ایسی ہی کیفیت ہوتی ہے۔ انسان اپنے اندر اپنے عمل پر بڑی ندامت محسوس کرتا ہے لیکن پھر بعد میں وہ سب کچھ بھول جاتا ہے اور اس دنیا کا یہی دستور ہے پیارے۔ یہاں ہر بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو اپنی خوراک کا حصہ سمجھ کر نگل جاتی ہے۔ دنیا کا کاروبار اسی طرح چل رہا ہے تم بھی اب بہت مت سوچو جو ہو گیا سو ہو گیا۔ گئی رات گئی بات گئی۔ ویسے باس تمہاری کارکردگی سے بہت زیادہ خوش ہیں۔" جابر نے مجھے سوچوں میں گم دیکھ کر کہا۔ میں خاموشی سے اس کی جانب دیکھنے لگا اور اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔
"چلو چھوڑو تم نے کب سے کھانا نہیں کھایا ہے اب تو رات کے کھانے کا بھی ٹائم ہو گیا ہے۔" جابر دوبارہ بولا۔
"مجھے بالکل بھی بھوک نہیں ہے۔" میں نے آہستہ سے جواب دیا۔
"کم آن یار چھوڑو یار..... بس ابھی وہ سب یہاں پہنچنے والے ہیں۔ پھر سب مل کر ساتھ کھانا کھائیں گے۔" جابر نے میرے قریب آ کر کہا اور کچن کی جانب چلا گیا۔ جہاں وہ الگ کھانا تیار کر رہا تھا۔
اور جب ہی وہ سب بھی آ گئے سب سے پہلے بینا نے میری تعریف کی اور بولی۔
"ویلڈن شہروز تم نے تو باس کا دل ہی جیت لیا وہ تم سے بہت زیادہ خوش ہیں اور یہ انہوں نے تمہارا انعام بھیجا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے پرس سے ایک براؤن لفافہ نکال کر میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے نیم دلی سے لفافہ تھاما اور ٹیبل پر رکھ دیا۔
"دیکھو گے نہیں کہ باس نے کتنا بڑا انعام دیا ہے۔" بینا نے کہا۔
"بعد میں دیکھوں گا۔" میں نے جواب دیا۔
"تمہاری مرضی لگتا ہے تم خوش نہیں ہو۔" وہ بغور میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔
"جو کام میں کر کے آیا ہوں وہ بھی کوئی خوش ہونے والا کام ہے۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔
"میں کام کی نہیں معاوضے کی بات کر رہی ہوں۔" وہ بولی۔
"میرا خیال ہے کہ فی الحال ہمیں شہروز کو تنگ نہیں کرنا چاہیے۔" کیٹر نے بینا سے کہا تو اس کے لبوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ کندھے اچکا کر اندر جانے لگی تبھی میں جابر آ گیا اور اس نے بینا کو تو وہ ذرا دور رک گئی۔
"یار جلدی ہم لوگ ڈنر کر کے نکلتے ہیں۔ ورنہ کل صبح بھی تو جانا ہے۔" جابر نے کہا۔
"آج رات رک جاتے ہیں کل صبح چلیں گے۔" بینا نے جواب دیا۔

"نہیں، اس نے ایک دو کام بتائے ہیں، ابھی نہیں گے تو تین چار گھنٹوں میں نپٹ جائیں گے پھر ساری رات کا آرام بھی مل جائے گا کل صبح فریش ہوں گے۔" جابر نے شفیق لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔" بینا نے نیم دلی سے رضامندی ظاہر کردی۔

"یار شاکر جلدی سے کھانا لگاؤ، ہمیں ابھی نکلنا ہے۔" جابر نے ملازم کو آواز دے کر کہا۔

ذرا سے فارغ ہو کر بینا اور جابر نکلنے لگے تو بینا میرے پاس آئی اور دھیمے لہجے میں بولی۔

"میں نے تو سوچا تھا کہ آج تمہاری کامیابی کو سب مل کر منائیں گے لیکن یہ جابر کا کام ہمیشہ میرے پیچھے پڑ جاتا ہے۔ خیر آج بھی ہوں میں اس سے ..."

"اچھا" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔ "میں تو کہتا ہوں کہ جابر تمہارا بہت اچھا دوست ہے اور شاید تم دونوں ایک دوسرے کے دل سے پسند بھی کرتے ہو۔"

"میں نہیں، صرف جابر ...... یہ معاملہ یک طرفہ ہے، میری بہت بڑی مجبوری ہے کہ میں اس کے ساتھ رہنے پر مجبور ہوں۔" اس نے دور کھڑے جابر پر ایک نفرت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے کہا جو فون پر کسی سے باتیں کر رہا تھا۔

"مجھے تو آج یہ بات پتا چلی ہے۔" میں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

جابر فون پر بات کرچکا تو اس نے فون جیب میں رکھتے ہوئے بینا کو آواز دی اور سب کو بائے بائے کہتا ہوا فلیٹ سے باہر نکل گیا۔

سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے، کنیز، اصغر یا کلیم میں سے کسی نے بھی مجھ سے اس قتل کے بارے میں نہیں پوچھا کہ میں نے کس طرح سے وہ کام کیا اس کی وہ بھی وجہ میری سمجھ میں آ گئی کہ یا تو انہیں ساری بات معلوم ہو چکی ہے کیونکہ جابر مجھے واچ کر رہا تھا اس نے باس کو اور ان سب کو بتایا ہوگا یا پھر کسی کو ایک دوسرے سے اس طرح کی بات کرنے یا کھوج لگانے کی اجازت نہیں ہے۔

اپنے کمرے میں آ کر میں نے وضو کیا اور عشا کی نماز ادا کی اور اللہ سے رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگی تو میرے دل کا بوجھ کچھ کم ہوا۔ کسی بات کو گناہ جانتے ہوئے بھی جب آپ اس گناہ پر عمل کر بیٹھتے ہیں تو آپ کے اندر بیٹھا اچھا انسان جو ہر شخص میں موجود ہوتا ہے آپ پر لعنت ملامت کرتا رہتا ہے۔

نماز سے فارغ ہو کر میں بیڈ پر لیٹ گیا، میری آنکھوں میں دور دور تک نیند کا شائبہ تک نہیں تھا آج کا دن میری زندگی کا عجیب دن تھا۔ پہلے باس کے گلشن معمار والے بنگلے میں سلطان اور نبی کی ... دردناک موت کا منظر اور پھر سلو بھائی کا میرے ہاتھوں قتل ...... یہ سارے مناظر کسی فلم کی ریل کی مانند بار بار میری آنکھوں کے سامنے گردش کر رہے تھے۔

اچانک ہی میرے کمرے کا دروازہ بڑی آہستگی کے ساتھ کھلا اور کوئی اندر آیا۔

"کون ہے؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"میں ہوں کنیز ..... ! جاگ رہے ہو؟" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

"ہاں آجاؤ، مگر پہلے لائٹ آن کر دو۔" میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا تو کنیز نے لائٹ آن کردی۔

"مجھے یقین تھا کہ تم سوئے نہیں ہو گے جاگ رہے ہو گے۔" اس نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میں تھوڑی دیر قبل بھی آئی تھی لیکن تم نماز پڑھ رہے تھے اس لیے میں واپس لوٹ گئی، تم نماز بھی پڑھتے ہو ....." اس نے حیرت اور مسرت سے کہا۔

"ہاں پڑھ ہی لیتا ہوں۔" میں نے ندامت بھرے

لہجے میں کہا۔

"تم جیسا انسان یہاں کیسے پھنس گیا، تم وہ سارے کام کس طرح سے کر سکو گے جو باس تم سے لیں گے۔" کنیز نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

"بعض اوقات انسان جذبات میں اندھا ہو کر بہت زیادہ غلط فیصلے کر جاتا ہے اور ساری عمر اپنے غلط فیصلوں کا خمیازہ بھگتتا رہتا ہے۔ جب ہی اللہ تعالیٰ نے "صبر" کی جزا جنت رکھی ہے کیونکہ یہ ایک بہت مشکل کام ہے، ہم عقل پر پٹی باندھ لیتے ہیں تب ہی وہ ہی کر لینا چاہتے ہیں... تو پھر ایسے گڑھوں میں بھی گر جاتے ہیں۔" میں نے ایک گہری اور ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"پچھتا رہے ہو؟" اس نے دھیرے سے پوچھا تو میں نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"یہاں ایسا ہی ہوتا ہے کوئی خوشی سے اس جانب آتا ہے تو کوئی مجبوری میں، لیکن خوش کوئی بھی نہیں ہوتا۔" اس نے اپنی ہتھیلی کھول کر اپنی انگلیاں اپنی خالی ہتھیلی پر پھراتے ہوئے کہا۔

"ایک بات بتاؤ کنیز!" میں نے کہا تو وہ چونک کر میری جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

"آج صبح جب باس نے مجھ سے سلو بھائی کے قتل کی بات کی تو میں نے تمہیں ایک دم پریشان ہوتے ہوئے دیکھا تھا نہیں کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے تم چاہتی ہو کہ تم مجھے یہ کام کرنے سے روکنا چاہتی ہو لیکن تم کچھ کہہ نہیں سکتی تھیں، ایسا کیوں تھا کنیز؟ کیا سلو تمہارا کوئی خاص دوست تھا؟" میں نے پوچھا تو وہ چند لمحوں تک میری جانب تکتی رہی، پھر تیزی سے اٹھی اور دروازے کی جانب بڑھی، میں اس کے اس طرح اچانک اٹھ کر جانے پر عجیب سا ہو گیا کہ میں نے ایسی بھی کیا بات پوچھ لی کہ کنیز اٹھ کر جا رہی ہے۔

مگر کنیز نے ایک قدم دروازے سے باہر جھانکا پھر اندر آ کر دروازہ بند کر کے لاک کر دیا اور لائٹ آف کر کے نائٹ بلب آن کر دیا اور دوبارہ بیڈ پر آ بیٹھی میں اسے ایسا کرتے دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ میں اس قسم کا انسان نہیں تھا آج تک میں نے ایک چھت کے تلے کسی بھی عورت کے ساتھ رات نہیں گزاری تھی، آخر یہ کیا چاہتی ہے مجھ سے ......!

"یہ تم کیا کر رہی ہو کنیز ...... دروازہ کھولو ...... اور پلیز لائٹ آن کرو۔" میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا تو وہ بولی۔

"تم جو کچھ کہہ رہے ہو ایسا کچھ نہیں ہے، تم نے مجھ سے جو سوال کیا ہے میں اس کا جواب دینا چاہتی ہوں۔" اس نے جذبات آمیز دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"تم جواب پہلے بھی دے سکتی تھیں اس کے لیے سب کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔

"ضرورت ہے۔" اس نے زور دے کر کہا۔

"کیونکہ تم ابھی تک بہت سی باتوں سے ناواقف ہو، تمہیں یاد ہے باس نے کہا تھا کہ میری کئی آنکھیں اور کان ہیں۔ میں ان آنکھوں اور کانوں کو بند کر رہی ہوں، یہاں کمرے بند کر کے ساتھ سونے پر پابندی نہیں ہے سوائے ہر بات کے، آؤ تم بھی لیٹ جاؤ، مجھے تمہیں بہت ضروری باتیں بتانی ہیں۔" اس نے میرے بالکل قریب آ کر سرگوشی میں مجھ سے کہا اور میرا ہاتھ تھام کر خود لیٹ کر مجھے اپنے قریب لٹا لیا۔

کسی بھی عورت کا اتنا قرب میں پہلی مرتبہ محسوس کر رہا تھا اس لیے مجھے پسینا آنے لگا اور میں غیر محسوس طریقے سے اس سے ذرا دور کھسک گیا۔

"دور جانے کی حماقت مت کرو، اس کمرے میں خفیہ کیمرہ اور اسپیکر مائیک لگا ہوا ہے۔ میں تمہیں

"تمہارے قریب ہو کر ہی وہ باتیں بتا سکتی ہوں۔" اس نے میرا بازو پکڑ کر مجھے اپنے ساتھ کرلیا۔

میرا دل بہت زور زور سے دھڑک رہا تھا کیٹر نے سختی کے ساتھ میرا بازو تھام رکھا تھا۔

"بس... پلیز کیٹر... مجھ سے دور ہٹ جاؤ۔" میں نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ کیٹر کے ہاتھ پر رکھ کر اس سے اپنا بازو چھڑانا چاہا۔

"میں جو بات تمہیں بتانے والی ہوں اسے سن کر تمہارے ہوش اڑ جائیں گے۔ اور تم یہ بات بھول جاؤ گے کہ ایک جوان لڑکی تمہارے پاس تمہارے بیڈ پر بیٹھی ہے۔" کیٹر نے دھیرے سے گردن جھکا کر سرگوشی میں کہا تو میں چونک پڑا اور کہا۔

"کک... کیسی بات...؟"

"تم یہ سوچ رہے تھے ناں کہ میں کیوں پریشان ہو رہی تھی اور کیوں تمہیں چادر دی تھی کہ تم ایسا کرو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں میں تمہیں چاہتی تھی کہ تم یہ کام کرو... کیونکہ میں جانتی تھی کہ سلو بھائی کا قتل تمہیں پوری طرح پھنسانے کی پلاننگ تھا باس ہر ایک کے ساتھ ایسا ہی کرتا ہے وہ تمہارا ٹیسٹ لینے کے بجائے تمہارے روم کو کیمرے میں منتقل کر کے تمہیں بلیک میل کرتا ہے کاؤنٹر سے تمہاری کالنگ کی فوٹو گراف بھی اس کے پاس محفوظ ہیں۔ تمہیں کیمرہ ٹرک کے ذریعے کسی بھی دوسرے چالاک ہونے والے شخص کی شکل میں تبدیل کر دیا جائے گا اور سلو بھائی کی ڈیڈ باڈی کی تصویر اور تمہاری تصویر بھی اس کے پاس پہنچ گئی ہے جس میں تم اسے فائر کر کے مار رہے ہو۔"

"ایسا کیسے ہوسکتا ہے یہاں تو میں تنہا تھا...؟" یہ کہتے ہوئے میں بے ساختہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر فوراً ہی کیٹر نے عجیب سی حرکت کی اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے سینے پر رکھتے ہوئے مجھے دھکا دے کر بیڈ پر گرا یا اور میرے سر کو سہلاتی ہوئی لیٹ گئی اور بولی۔

"پلیز شہروز چند لمحے خاموشی سے میری بات سنو... تمہیں یہ سب دکھانا ضروری ہے تمہیں کیمرے سے دیکھا جا رہا ہے اس لیے میں ابھی اٹھ کر یہاں سے اس کا بٹن آف کروں گی تمہیں واچ کرنے والے سمجھ جائیں گے کہ آگے کا سین ہم انہیں دکھانا نہیں چاہتے۔"

کیٹر کی بات سن کر ساری بات میری سمجھ میں آ گئی اور میں نے اپنے بازو کیٹر کی کمر کے گرد کس کر کروٹ لی اور کیٹر میرے نیچے سے نکل گئی وہ فوراً ہی تڑپ کر میرے نیچے سے نکلی اور دیوار پر لگی لیمپ کی جانب بڑھی اور ہاتھ بڑھا کر وہاں لگا کیمرے کا خفیہ بٹن آف کر دیا پھر بیڈ پر بیٹھ کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ میں بھی اٹھ کر تیزی سے واش روم کی جانب بھاگا اور واش بیسن کا نل کھول کر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے اپنے منہ پر مارنے لگا میں اس وقت ایک بہت بڑے امتحان سے گزرا تھا اللہ کا شکر ہوا کہ میں اپنے حواس کنٹرول کرنے میں کامیاب رہا۔

میں تولیے سے چہرہ خشک کر کے باہر آیا تو کیٹر نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"آئی ایم سوری شہروز مجھے یہ ڈرامہ کرنا پڑا اب وہ لوگ مطمئن ہو گئے ہوں گے۔ اب ہم آرام سے گفتگو کر سکتے ہیں۔"

"چلو تم بھی ہاتھ منہ دھو کر آ جاؤ۔" میں نے اس کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تو وہ خجالت سے مسکراتی ہوئی واش روم چلی گئی ہاتھ منہ دھو کر آئی اور بولی۔

"باس نے تمہارے پیچھے جاسوس لگا رکھے تھے جو بھیجا تھا وہ ایک ماہر فوٹو گرافر ہے اس نے غیر محسوس

طریقے سے تمہارا پیچھا کیا اور اس عمارت میں پہنچ گیا۔ جس وقت تم نے سلو بھائی پر گولیاں چلائیں اس نے خفیہ طریقے سے تمہاری ویڈیو بنالی ہے۔ تمہارے جانے کے بعد وہ اس عمارت سے نکلا اور سیدھا باس کے بنگلے پر پہنچا اور تمہاری ویڈیو باس کے حوالے کر دی۔ اب اگر کبھی تم نے باس کے کسی بھی کام سے انکار کیا تو باس تمہاری یہ ویڈیو تمہیں دکھا کر بلیک میل کرے گا۔ ہم سب کی بہت سی کمزوریاں اس کے پاس ہیں۔" کیٹر نے بتایا تو میرے منہ سے بے ساختہ باس کے لیے گالی نکل گئی۔ میں اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا تھا جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا میں نے سوچا کہ آج موقع ملا ہے تو باس کے دوسرے رازوں کے بارے میں بھی کیٹر سے معلوم کر سکتا ہوں۔ اس لیے میں نے پوچھا۔

"کیا میں تم سے دوستانہ انداز میں کچھ پوچھ سکتا ہوں۔"

"پہلے یہ بتاؤ کہ تم مجھے اپنا دوست تسلیم بھی کرتے ہو یا نہیں۔" اس نے پوچھا۔

"پہلے تم بتاؤ کہ میں تو ابھی تم لوگوں میں شامل ہوا ہوں۔ یہاں بہت سے سربستہ راز ہیں جن کے بارے میں میں جاننا چاہتا ہوں لیکن کوئی ایسا نہیں جو مجھے ان کے بارے میں بتائے۔" میں نے کہا۔

"میں نے ابھی جو بات تمہیں بتائی ہے کیا وہ بات یہ سمجھنے کے لیے کافی نہیں کہ میں دل سے تمہیں اپنا دوست مانتی ہوں اور تمہیں پسند کرتی ہوں۔" اس نے جذباتی نگاہوں سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں میں اس بات کے لیے تمہارا بہت شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے باخبر کر دیا اب تھوڑی مہربانی اور کرو اور مجھے یہ بتاؤ کہ باس کے دھندے کیا کیا ہیں اس کے کتنے کارندے ہیں کہاں کہاں ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"کرنے والا بہت ہی بڑا آدمی ہے کہیں تم خفیہ پولیس کے آدمی تو نہیں ہو۔ جو اس طرح کی انفارمیشن مانگ رہے ہو۔" اس نے دھیرے سے ہنستے ہوئے خوف زدہ ہونے کی ایکٹنگ کی۔

"اگر خفیہ پولیس کا بندہ ہوتا تو باس کے کہنے پر ایک جرم اپنے کھاتے میں کیوں ڈالتا میں نے اسی بارے میں جو کچھ بتایا ہے وہی حقیقت ہے باقی کیونکہ شاید میرا بھی اپنے لوگوں سے دور دور تک واسطہ نہیں رہا۔ شاید اسی لیے میں ان لوگوں میں شامل ہونے کی کوشش میں غلطی کر بیٹھا۔" میں نے کہا تو کیٹر میری بات پر یقین کرتے ہوئے سر ہلانے لگی۔ پھر بولی۔

"باس کے ایک نہیں بہت سے بڑے دھندے ہیں۔ اور میں بھی اتنا ہی جانتی ہوں جتنا آج تک میرے علم میں آسکا ہے ہوسکتا ہے کہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہو۔"

"پھر بھی مجھے بھی تو کچھ پتا چلے میں اب تم لوگوں کا ساتھی ہوں پھر مجھ سے کیوں چھپایا جا رہا ہے۔" میں نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔

"ناراض کیوں ہو رہے ہو تم کیا سمجھتے ہو کہ میں نے یہ سارا ڈرامہ کس لیے کیا ہے صرف اس لیے کہ میں تم سے ڈھیر ساری باتیں کرسکوں وہ سب باتیں جو میں دوسروں کے سامنے نہیں کرسکتی میں چاہتی ہوں کہ تمہیں بھی ساری باتیں پتا چل جائیں اور تم اندھیرے میں نہ رہو تم سے جب کسی بھی کام کے کرنے کے لیے کہا جائے تو تم اس کے لیے ذہنی طور پر پہلے سے تیار رہو۔" اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر مسکراتے ہوئے کہا اور میں نے غیر محسوس طریقے سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کے نیچے سے کھینچ لیا۔ اور اس کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا کیٹر نے اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

بات کو محسوس کر لیا کہ میں نے فوراً اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کے نیچے سے نکال لیا ہے۔ اس کے چہرے پر نجات آمیز مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے اپنی نگاہیں جھکا لیں اور اس طرح مسکراتی ہوئی کنیز حسین سے حسین کنیز بہت پیاری لگی مگر اس پیاری لگنے میں میرے دل کا کوئی جذبہ شامل نہیں تھا۔

"آپ بتائیں گی۔" میں نے کہا تو وہ بولی۔

"یہاں کا سب سے خطرناک کام انسانی اعضاء کی اسمگلنگ ہے۔" اتنا کہہ کر وہ رک گئی اور مجھے دیکھنے لگی۔

"واٹ!" میرے منہ سے تیز آواز میں نکل گیا۔

"پلیز...!" اس نے منہ پر انگلی رکھ کر مجھے دھیمی آواز میں بولنے کے لیے کہا اور پھر مجھ سے سرگوشی میں بات کر رہی تھی۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو کنیز... انسانی اعضاء کی اسمگلنگ... تمہارا مطلب ہے کہ یہ شخص گردے اغوا کرتا ہے۔" میں نے شدید حیرت سے سرگوشی میں کہا تو کنیز نے جواب میں اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تمہیں جینا سے اپنی پہلی ملاقات تو اچھی طرح سے یاد ہوگی۔ تمہاری ملاقات ہاسپٹل میں ہی ہوئی تھی ناں... جینا نے نرسنگ کا کورس کیا ہوا ہے۔ بعض ہاسپٹل میں یہ لوگ بے ضمیر اور دولت کے پجاری ڈاکٹرز کو اپنے ساتھ ملا کر یہ جرم کرتے ہیں۔ اس وقت بھی جینا اسی سلسلے میں اس ہاسپٹل میں موجود تھی۔ سلطان کے بہنوئی کے ساتھ جب زیادتی ہوئی اور اس کے اپنڈکس کا آپریشن کرنے کے بجائے اس کے دونوں گردے نکال لیے گئے اور بعد میں میڈیکل سرٹیفکیٹ میں لکھ دیا گیا کہ اپنڈکس پھٹ گیا جس کی وجہ سے موت واقع ہوئی۔ تب ہی تو وہ پاگل ہو گیا تھا اس نے اس واقعے کی اطلاع پولیس کو دے دی۔ جینا تو فوراً ہی غائب ہو گئی مگر ڈاکٹر گرفتار ہو گیا بعد میں اس ڈاکٹر کو بے قصور ثابت کر کے رہائی دلوانے میں باس کا خاصا بڑا ہاتھ تھا۔

اس کے علاوہ ایکسیڈنٹ میں مرنے والے لوگ جن کے وارث نہیں ہوتے ان کی آنکھیں نکال لی جاتی ہیں۔ یہ کام بھی خفیہ طریقے سے بہت عرصے سے جاری ہے۔"

"اوہ میرے خدا..." میں نے اپنا سر تھام لیا۔

"تم نے ابھی سے اپنا سر تھام لیا ابھی آگے سنو... ابھی تو بہت کچھ ہے۔" کنیز نے کہا۔

"ہاں بتاؤ!" میں نے اپنے ماتھے پر تیزی سے نمودار ہونے والے پسینے کے ننھے ننھے قطروں کو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"منشیات اور اسلحے کی اسمگلنگ کے علاوہ یہ لوگ جوان لڑکیوں کو بھی بیرون ملک بھیجتے ہیں۔ جن میں متحدہ عرب امارات کے علاوہ امریکہ کے شہر لاس اینجلس میں بھی لڑکیاں بھیجی جاتی ہیں اور تھائی لینڈ اور بنکاک میں بھی پاکستانی لڑکیاں ہی بدکاروں کی تسکین کا باعث بنتی ہیں۔ راجا سے تم ملے تھے ناں وہ اسی سلسلے میں آیا ہوا ہے اسے مزید لڑکیاں چاہئیں ان لڑکیوں کو ملازمت کا جھانسا دے کر بھیجا جاتا ہے۔

باس کا ایک اور دھندا اغوا برائے تاوان کا ہے لیکن یہاں اس طرح سے اغوا کیا جاتا ہے کہ اغوا ہونے والا بڑی خوشی سے اغوا ہو جاتا ہے اور اسے پتا بھی نہیں چلتا بعض اوقات یہ بندہ بھی مار دیتے ہیں اور تاوان بھی وصول لیتے ہیں۔" کنیز بتا رہی تھی اور میں دم بخود سن رہا تھا۔

"اغوا کیسے کرتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ کام بھی نوجوان اور خوب صورت لڑکیوں سے ہی لیا جاتا ہے۔ یہ لڑکیاں امیر گھرانوں کے نوعمر

لڑکوں کو اپنی محبت کے جال میں پھنسا لیتی ہیں۔ بعض اوقات یہ فون پر دوستی کرتی ہیں پھر جب لڑکے کی آتش شوق بھڑک جاتی ہے تو اسے کہیں ملنے کے لیے بلاتی ہیں اور لڑکا اغوا ہو جاتا ہے اور اگر لڑکی پہلے سے ملاقاتیں کرتی رہتی ہے تو ایک روز اسے بلا کر "محبت کی تکمیل" کے عمل سے گزرنے کے لیے کسی جگہ بلاتی ہے پھر اسے اغوا کر لیا جاتا ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ اس لڑکی کی پہچان کا خطرہ ہوتا ہے اس لیے تاوان وصول کرنے کے بعد لڑکے کو قتل کر کے پھینک دیا جاتا ہے۔"

"تم کیا کام کرتی ہو؟" میں نے پوچھا تو کنیز خاموش ہو گئی۔

"بتاؤ ناں تم خاموش کیوں ہو گئیں۔" میں نے کہا۔

"میں بہت سے کام کرتی ہوں۔ میں شروع میں اغوا برائے تاوان کے لیے کام کرتی تھی اب بقول باس کے میں نوعمر لڑکوں کے لیے کشش کا باعث نہیں رہی لیکن بوڑھے کھوسٹوں کی تو اب بھی مجھے دیکھ کر رال ٹپک پڑتی ہے۔ باس کو اپنے بہت سے کام نکلوانے ہوتے ہیں تو باس انہیں میرے جسم کی تحفے دیتے ہیں۔ خاص طور پر پولیس کے اعلیٰ افسران... گورنمنٹ کے اعلیٰ عہدیداران کو وہ رشوت... اس کے علاوہ میں بھی کئی اسمگلروں کے گروپ میں بھی شامل ہوتی ہوں۔" کنیز نے کہا اور گردن جھکا لی اس نے جس طرح اپنے جرائم کا میرے سامنے اعتراف کیا تھا تو وہ نہیں تو جھکنا ہی تھی۔ میں نے بھی اپنی نگاہیں جھکا لیں جو اس کی میری ہمت بھی نہیں تھی کہ اس سے نگاہیں ملا سکوں۔

جب بہت دیر تک اس کا جھکا ہوا سر اوپر نہیں اٹھا تو میں نے اس کا سر اوپر اٹھایا تو دیکھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"ارے... تم رو رہی ہو...؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"میری تقدیر میں اب اپنی آخری سانس تک رونا ہی لکھا ہے۔ جس طرح آج تم نے ایک گناہ کر کے اپنے ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر نماز پڑھ کر اپنے رب سے اپنے گناہ کی معافی مانگی اسی طرح میں بھی ہر رات روتی ہوں لیکن دل کا بوجھ ہلکا نہیں ہوتا۔"

"اگر یہ سب کر کے تمہیں اچھا نہیں لگتا تو یہ کام شروع ہی کیوں کیا تھا... آخر تم ان کے چکر میں کیسے پھنس گئیں۔" میں نے پوچھا۔

"لوگ سارا الزام اپنے نصیبوں کو دے دیتے ہیں کہ ہمارا نصیب ہی خراب تھا کہ ہمارے ساتھ برا ہوا ہے مگر میں کہتی ہوں کہ ہمارا نصیب ہی خراب تھا ہماری سوچ اور ہمارا رویہ ہی خراب تھا تو ہمارے ساتھ برا ہوا۔ اپنے لیے میں بھی کہوں گی کہ نصیب خراب نہیں تھا میں نے خود اپنا نصیب بگاڑا ہے۔ اور ان برے لوگوں میں پھنس گئی برائی کی اس دلدل میں پھنس کر اگر میں نکلنا بھی چاہوں تو بھی نہیں نکل پاؤں گی۔" اس نے کہا اور پھر رونے لگی۔

"اچھا چلو آج تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ... اپنے گھر اور گھر والوں کے بارے میں بتاؤ اور یہاں تک تم کیسے اور کن ذریعوں سے پہنچیں میں تمہارے بارے میں اس لیے بھی جاننا چاہتا ہوں کہ تم بنیادی طور پر مجھے ایک اچھی لڑکی لگی ہو۔ تم میں اور جینا میں بہت فرق ہے لگتا ہے اس نے دل سے ان حالات اور ان لوگوں کو قبول کر لیا ہے وہ مجھے مطمئن دکھائی دیتی ہے۔" میں نے کہا تو وہ افسردگی سے نفی میں سر ہلانے لگی پھر غمگین لہجے میں بولی۔

"عورت چاہے جو بھی ہو بے غیرتی کی زندگی گزارنا اپنی مرضی سے قبول نہیں کرتی۔" کچھ وقت اور

حالات اور معاشرتی مجبوریاں ہوتی ہیں اور بہت وقت عورت اپنی کسی غلطی کی کیے کے طور پر پوری زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔"

"ہو سکتا ہے کہ تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔ یہ اللہ کا شکر ہے کہ میری اٹھائیس سالہ زندگی میں ایسی عورتوں سے واسطہ پہلی مرتبہ پڑا ہے۔ آج تک تو میں نے اپنی ماں جس نے اپنے گھر کی چار دیواری سے باہر کی زندگی دیکھی ہی نہیں اور اس جیسی بہت سی عورتوں کو دیکھا ہے جن کے لیے حالات خواہ کیسے بھی ہوں وہ کیوں نہ ہوں اپنے شوہر یا باپ اور بھائیوں کی دہلیز سے مر کر ہی نکلتی ہیں۔" میں نے کہا تو اس نے شاکی نگاہوں سے میری جانب دیکھا میں سمجھ گیا کہ اس کی نگاہوں میں یہ شکوہ کیوں ہے اس لیے جلدی سے کہا۔

"تم اپنے بارے میں کچھ بتانے والی تھیں۔ چلو اپنے الف سے کچھ شروع کرو۔"

اس نے ایک طویل سانس لے کر بہت ہی ہولے سے انداز میں پھر دوبارہ شروع ہوئی اور بولتی رہی میں نے درمیان میں اسے ٹوکنے کی کوشش نہیں کی وہ جیسے پوری طرح اپنے ماضی میں ڈوب چکی تھی ایک خواب کی سی کیفیت میں مسلسل بولتی جا رہی تھی اور پھر تمام رات ہی گزر گئی ہم یونہی آمنے سامنے بیٹھے رہے۔ اس نے اپنی کہانی ختم کی اور بولی۔ "اب تم میرے بارے میں کیا کہتے ہو۔۔۔؟"

"میں کیا کہوں۔۔۔ ابھی تک تو میں خود کو تمہاری کہانی کے سحر سے آزاد نہیں کر پایا ہوں اس بارے میں ہم بعد میں بات کریں گے فی الحال تو مجھے نیند آ رہی ہے۔" میں نے نیند کے خمار سے آنے والی جمائی کو منہ پر ہاتھ رکھ کر روکتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔۔۔!" اس نے ایک بار پھر گہری سانس لی اور اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔

"میں کمرے کا ہیٹر آن کر کے اپنے کمرے میں جا رہی ہوں اب تم سو جاؤ۔۔۔ اس یاد رکھنا کہ یہ ہمیشہ آن ہی رہتا ہے۔"

"ہاں میں اس بات کو یاد رکھوں گا۔" میں نے کہا اور بیڈ پر لیٹ گیا۔ بیڈ پر لیٹتے ہی میری آنکھیں بند ہو گئیں اور مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ کب میرے روم سے گئی۔

میں دوپہر تک سوتا رہا اور کسی نے بھی مجھے ڈسٹرب نہیں کیا۔ دوپہر ایک بجے میری آنکھ کھلی تو میں غسل کرنے گیا۔ باہر آیا تو میں تولیے سے اپنے بال خشک کرنے لگا پہلے میرے بال چھوٹے تھے مگر اب میں نے اپنے بال بڑھا لیے تھے۔ میرے بال کندھوں پر آتے تھے اور میں درمیان سے مانگ نکال کر انہیں دو حصوں میں تقسیم کر لیا کرتا تھا بالکل لڑکیوں کی طرح۔ میں نے چہرے پر ہلکی داڑھی اور مونچھیں رکھی ہوئی تھیں جن سے میرا اصلی چہرہ کافی حد تک چھپ گیا تھا لیکن جب میں سلو بھائی کے قتل کے ارادے سے گیا تھا تب جادو نے مجھے ایک وگ فراہم کر دی تھی جو کہ مردوں کی طرح گھنگھریالے چھوٹے بالوں کی تھی آنکھوں پر باریک کمانی کا فریم تھا کیونکہ چہرے سے بالوں کی وجہ سے میری شناخت میں آسانی ہو سکتی تھی۔

میں انہی سوچوں میں دوسری جانب نکل گیا۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میں غسل کر کے بالوں کو تولیے سے خشک کر رہا تھا تب ہی اکرم چائے کا کپ لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ اور میری جانب "معنی خیز" مسکراہٹ کے ساتھ دیکھتے ہوئے بولا۔

"آج تو آپ بڑی دیر تک سوتے رہے۔۔۔؟"

"ہاں رات کو دیر سے نیند آئی تھی۔" میں نے اس کے لبوں پر وہی مسکراہٹ کی "معنی خیزی" کو اہمیت دیے بغیر کہا۔

"کیوں نیند کیوں نہیں آئی خیریت۔" اس نے سادہ انداز میں کہا۔

"تم سے مطلب۔" میں نے ناگوار لہجے میں کہا۔

"نہیں میں تو ایسے ہی پوچھ رہا تھا وہ ابھی کیٹرینا بی بی بھی ابھی سو کر اٹھی ہے۔" اس نے سر کھجاتے ہوئے اپنی مسکراہٹ کو چھپانے کے لیے سر جھکایا۔

"اکرم تم صرف اپنے کام سے کام رکھا کرو۔۔۔ تمہیں دوسروں کی ٹوہ لینے کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"مجھے اپنی ساری ڈیوٹیز کے بارے میں اچھی طرح سے علم ہے اور میں وہی پوری کر رہا ہوں۔" اس نے کہا اور چپ چاپ کمرے سے نکل گیا۔

میں اس کا جملہ سن کر چونک پڑا۔۔۔ اور سمجھ گیا کہ اکرم یہاں محض کام کرنے والا ایک ملازم ہی نہیں ہے بلکہ اس کی ڈیوٹی میں ہم سب کی نگرانی بھی شامل ہے ورنہ محض ایک ملازم اتنی جرأت کبھی نہیں کرتا جو بات اس نے "معنی خیز" انداز میں مجھ سے کی تھی۔

میں باہر آیا تو جعفر اور کلیم دونوں موجود نہیں تھے کیٹرینا بھی تیار ہو کر کہیں جا رہی تھی مجھے دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔ "میں اپنی ڈیوٹی پر جا رہی ہوں۔"

میں سمجھ گیا کہ یہ کہاں اور کس کام سے جا رہی ہے میں نے مزید اس سے کچھ بھی پوچھنا مناسب نہیں سمجھا اور ناشتے سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ میں بالکل فارغ تھا۔ فی الحال میرے پاس کوئی اور کام نہیں تھا اس لیے میں نے ٹی وی کا ریموٹ اٹھایا اور ٹی وی آن کر کے نیوز چینل لگا دیا۔ اس خبر کے لیے مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا جو خبر میں دیکھنا چاہتا تھا۔

سلو بھائی کے قتل کی خبر آ گئی تھی نیوز کاسٹر نے بھی بتایا کہ ٹرانسپورٹرز سلو بھائی کے قتل کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں اور انہوں نے انتظامیہ سے مطالبہ کیا ہے کہ اگلے تین روز میں اگر قاتل کا سراغ نہ لگایا گیا تو صوبے بھر میں پہیہ جام ہڑتال کی جائے گی۔ مقامی پولیس قاتل کی تلاش میں سرگرداں ہے امید ہے بہت جلد اہم شواہد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔

میں نے مسکراتے ہوئے ٹی وی آف کر دیا میں اپنے ملک کی پولیس سے اچھی طرح سے واقف تھا یہاں روزانہ کا یہی معمول ہے آئے دن لوگ مرتے ہیں جگہ جگہ لاشیں ملتی ہیں مگر نامعلوم قاتل کے خلاف مقدمہ درج کیا جاتا ہے اور چند روز بعد فائل بند کر دی جاتی ہے اگر قاتل سامنے بھی ہو اور پولیس کی جیب گرم کر دی جائے تب بھی پولیس اس کی جانب سے اپنی آنکھیں بند ہی رکھتی ہے اور اس قزلباش آغا کے بقول پولیس میں بہت سے ہاتھ کٹے شامل ہیں جنہیں اپنے ملک اور عوام کے مفاد سے زیادہ اپنا مفاد عزیز ہوتا ہے۔

اس ملک میں جرائم کے پنپنے کی ایک بڑی وجہ اور پولیس ڈیپارٹمنٹ بھی ہے جو مجرموں کی بیخ کنی کے بجائے انہیں تحفظ فراہم کرتی ہے عام شہری ان سے ڈرتے ہیں اور مجرم دندناتے ہوئے دھڑلے سے جرم کرتے پھرتے ہیں۔

کیٹرینا نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ آغا قزلباش کے تعلقات بہت ہائی لیول تک ہیں۔ سیاسی لیڈر تک اس کے دوستوں میں شامل ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے کاروبار میں کوئی سیاسی لیڈر کوئی وزیر بھی در پردہ شامل ہو۔

اب اس کے بارے میں اتنی ساری باتیں سننے کے بعد میں اس بات سے بالکل بے فکر تھا کہ پولیس سلو بھائی کے قاتل تک پہنچ پائے گی۔

ساری باتیں سوچتے سوچتے میرا دماغ کیٹرینا کی اپنی

کہانی کی جانب چلا گیا اور میں اس کے بارے میں سوچنے لگی۔ اس نے اپنے بارے میں بتایا تھا۔

"میں ملتان کی رہنے والی ہوں، وہیں میری پیدائش ہوئی۔ ہم چار بہنیں اور دو بھائی تھے۔ والد کی صرافہ بازار میں ذاتی دکان تھی۔ حالات بہت اچھے نہیں تو خراب بھی نہیں تھے۔ بس اچھا گزارہ ہو جاتا تھا۔ ہم چاروں بہنیں بڑی اور دونوں بھائی چھوٹے تھے۔

اتفاق کی بات ہے کہ میری والدہ اور تینوں بہنیں خوب گوری چٹی تھیں۔ بھائی بھی گورے تھے لیکن چونکہ ابا کا رنگ سانولا تھا اس لیے بدقسمتی سے میرا رنگ بھی سانولا رہا۔

لوگ جب ہم سب بہن بھائیوں کو دیکھتے تو میں انہیں الگ ہی نظر آتی اور بچپن ہی سے میں ایک ہی بات سنتی آئی تھی کہ ربیعہ (میرا اصلی نام) تو اس گھر کی لگتی ہی نہیں، اس کا رنگ کالا کیوں ہے جبکہ تم سب کے درمیان یہ تو گھر کی لگتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔

اس قسم کی باتیں سنتے سنتے میں جوان ہوئی اور میرے اندر شدید احساس کمتری پیدا ہو گیا۔ میں لوگوں کے سامنے آنے سے گھبرانے لگی۔ باہر والے تو الگ خود میری بہنیں اور امی بھی مجھ سے مذاق میں بار بار یہی بات کہتیں کہ "ربیعہ تو ہمارے گھر پیدا ہی نہیں ہوئی کسی اور کی اولاد ہے۔" بس ایک ابا ہی تھے کہ اگر ان کے سامنے یہ لوگ بات کرتے تو وہ مجھے پیار سے گلے لگا کر کہتے "ربیعہ تو ابا کے جگر کا ٹکڑا ہے۔"

میں زیادہ تر خاموش رہنے لگی۔ ساری بہنیں شوخ رنگ کے لباس پہنتیں اور میرے لیے ہلکے رنگوں کا انتخاب کیا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ مجھے ایک اورنج کلر کا لباس پسند آیا اور میں نے اسے لے لیا تو بہنوں نے یہ کہہ کر میرا مذاق اڑایا کہ "اگر تم یہ رنگ پہنو گی تو سب تمہیں بن مانس کہیں گے۔"

اس دن میں بہت روئی اور کھانا بھی نہیں کھایا۔ ابا جب شام کو گھر آئے تو میں کمرے سے باہر نہیں نکلی۔ ابا نے وجہ پوچھی تو امی نے بتایا کہ بہنوں نے کس وجہ سے میرا مذاق اڑایا ہے تو ابا اندر کمرے میں آئے اور کہا۔

"میں اپنی بیٹی کے لیے اسی کلر کا سوٹ لاؤں گا۔ میری بیٹی اسے پہن کر پری لگے گی۔ اور اس کے نقش تو تم سب سے زیادہ اچھے ہیں۔ تم لوگوں کے پاس تو صرف گورا رنگ ہے، میری ربیعہ کی آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں۔"

پھر ابا میرے لیے جلدی اورنج کلر کا کامدار سوٹ لے آئے اور ان ہی کی ضد پر میں نے اسے سلوا بھی لیا۔ اتفاق سے میری کزن (خالہ کی بیٹی) کی شادی آگئی تو ابا کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے میں وہی سوٹ پہن کر چلی گئی۔ میں دل میں تھوڑا تھوڑا ڈر بھی رہی تھی اور چور نگاہوں سے دوسروں کی جانب دیکھ رہی تھی کہ کسی کی آنکھوں میں میرے لیے تمسخر تو نہیں ہے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا بلکہ میری دوست نے میری تعریف کی اور مجھے سراہا کہ شکر ہے تم نے آسمانی اور پنک کلر کا پیچھا تو چھوڑا۔

وہیں پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ دو آنکھیں مسلسل مجھے اپنے حصار میں لیے ہوئے ہیں۔ میں نے دیکھا وہ ایک جینٹلمین اور اسمارٹ لڑکا تھا اور مجھے گھورے جا رہا تھا۔ میں کنفیوز ہو رہی تھی کہ آخر وہ کیوں مجھے گھورے جا رہا ہے۔

کھانا شروع ہوا تو میں اپنی پلیٹ میں تھوڑا سا کھانا نکال کر ایک طرف کھڑے ہو کر کھانے لگی جب میں نے اسے اپنی جانب آتے ہوئے دیکھا۔

اسے اپنی جانب آتا ہوا دیکھ کر میرے ہاتھ کپکپانے لگے اور اتنے کپکپائے کہ جیسے ہی وہ میرے

نزدیک آیا میرے ہاتھ سے پلیٹ چھوٹ کر گر پڑی۔ نیچے گرتے ہی قالین کی پلیٹ ٹوٹ گئی۔ اب تو میرا گھبراہٹ سے برا حال ہو گیا۔ میرے چہرے کا رنگ دیکھ کر وہ بھی گھبرا گیا اور مجھ سے بولا۔

"کیا ہوا ...؟ آپ اتنی پریشان کیوں ہیں؟ ایک پلیٹ ہی تو ٹوٹی ہے، شادیوں میں تو ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔"

"وہ میں ... وہ میں ..." مارے گھبراہٹ کے میں اس سے کچھ بھی نہ کہہ پائی اور اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیر کر پسینہ صاف کرنے لگی تو اس نے اپنی جیب سے ٹشو کا پیکٹ نکال کر اس میں سے ٹشو پیپر نکال کر میری جانب بڑھایا جو میں نے جھجکتے ہوئے لے لیا۔

فوراً ہی وہ دوسری پلیٹ میں بریانی ڈال کر لے آیا اور میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

"اگر آپ برا نہ مانیں تو کیا میں آپ کا تعارف حاصل کر سکتا ہوں؟" پھر خود ہی بولا۔ "میں دولہن کے بھائی زمان کا دوست راحیل ہوں۔ آپ کے اوپر نگاہ پڑی تو جیسے نظر ہی اٹک گئی۔ معاف کیجیے گا میں بہت صاف گو اور جھٹ بات کہہ دینے والا ہوں۔ مجھے آج تک کوئی لڑکی اتنی اچھی نہیں لگی کہ اسے دیکھتے رہنے کو دل چاہے۔ آج کل کے ماڈرن زمانے میں آپ جیسی شرمیلی اور حیادار لڑکیاں اب ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتیں۔" اس نے مجھے شرماتے ہوئے دیکھ کر نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی ..." میں نے شدید حیرت سے کہا۔ "ان کپڑوں میں بھی ..." "میرا مطلب ہے اس کلر کے اس میں بھی۔" مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ جس کلر کو پہننے پر میری بہنوں نے مجھے بن مانس کا خطاب دیا تھا اسی لباس میں ایک اسمارٹ اور ہینڈسم لڑکا مجھے سراہ بھی سکتا ہے۔

"جی ہاں آپ کو لباس پہننے کا سلیقہ بھی ہے اور آپ کی کلر چوائس بھی بہت اچھی ہے۔ یقین کیجیے یہ کلر آپ پر بہت سوٹ کر رہا ہے۔" اس نے ایک زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"لیکن میں تو سانولی ہوں ... پھر آپ کو کیسے اچھی لگی؟" میں نے معصومیت سے کہا۔

"آپ کا سارا حسن ہی آپ کا سانولا پن ہے بہت حسین ہیں آپ ... اور حسین سے انسان کا دل بھی نہیں بھرتا۔" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا تو میں بری طرح شرما گئی۔ میرے [illegible] پڑ گئے۔

"شاید آپ کو میری باتیں بری لگی ہیں۔" اس نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

"نن ... نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا پھر عجیب سی لگی مجھے زندگی میں بھی کسی نے اس طرح سے بات نہیں کی تھی میری تعریف نہیں کی تھی اس لیے کسی لڑکے نے میری اتنی تعریف کی تو میں خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔

"میں آپ سے دوبارہ ملنا چاہوں گا۔ کیا آپ مجھ سے بات کرنا پسند کریں گی۔" اس نے پوچھا تو میں نے سر جھکا لیا۔

اتنے میں میں نے حمیدہ کے بھائی زمان کو اس طرف آتے دیکھا تو اس نے جلدی سے ایک کارڈ نکالا اور میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

"زمان اسی طرف آ رہا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ اسے یہ بات پتا چلے کہ میں نے آپ سے بات کی ہے۔ آپ میرا کارڈ رکھ لیں۔ اگر دل چاہے تو فون کر لیجیے گا۔ میں آپ کے فون کا انتظار کروں گا اور ہاں مجھے یقین ہے آپ حمیدہ سے میرا ذکر نہیں کریں گی۔" اس نے میرے ہاتھ میں کارڈ تھمایا اور تیزی سے دوسری جانب بڑھ گیا۔

شادی سے آنے کے بعد اس رات میں سو نہیں سکی ساری رات راحیل کی باتیں میرے دماغ میں گونجتی رہیں میں جو آج تک اپنے آپ کو دنیا کی بدصورت ترین لڑکی سمجھتی رہی تھی آج خود کو خوش قسمت تصور کر رہی تھی مجھے یہ سوچ کر بہت اچھا لگ رہا تھا کہ کوئی مجھے بھی پسند کر سکتا ہے وہ راحیل جیسے اسمارٹ لڑکے پر تو کوئی بھی حسین لڑکی فدا ہو سکتی ہے۔ پھر وہ میری جانب ہی کیوں آیا؟ اس نے وہ سب مجھ سے کیوں کہا۔

وہ تین دن گزر گئے..... میں اس کے بارے میں سوچ رہی تھی اب مجھے اپنی بہنوں کو دیکھنا بھی برا نہیں لگ رہا تھا۔

وہ ہفتے کی رات تھی صبح سب کی چھٹی تھی سب ہی رات دیر تک جاگتے رہتے تھے تینوں بہنیں ٹی وی لاؤنج میں کوئی انڈین مووی دیکھ رہی تھیں۔ امی ابو اپنے کمرے میں تھے۔

میں نے راحیل کا دیا ہوا کارڈ نکالا اور دیر تک سوچتی رہی کہ اسے فون کروں یا نہ کروں۔ دماغ روک رہا تھا لیکن دل ضد کر رہا تھا میرے کان پھر اس کی خوب صورت آواز اور گمبھیر لہجے کو سننا چاہ رہے تھے یوں سمجھ لیں کہ محبت بھری باتیں سننا چاہ رہے تھے۔ میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کارڈ میں لکھا ہوا موبائل فون کا نمبر دیکھا اور اپنے موبائل سے نمبر پنچ کیا۔

دوسری جانب تیسری کال پر اس نے فون ریسیو کیا اور بہت خوب صورت لہجے میں بولا۔

"یس..... راحیل اسپیکنگ۔"

اس کی آواز سن کر مجھے پسینہ آ گیا..... وہ دوبارہ میٹھے لہجے میں بولا۔

"یس..... ہو آر یو.....؟"

جواب میں، میں صرف گہری گہری سانسیں لے رہی تھی میرے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

"اچھا میں سمجھ گیا۔ میری آنکھیں بلیک اور پنک کلر میں ملبوس سانولی سلونی سی گہری آنکھوں والی کو دیکھ رہی ہیں..... ایم آئی رائٹ.....؟" اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"جی ہاں۔" بمشکل کہہ پائی۔

"زہے نصیب، حمیدہ! جو آپ نے اس ناچیز کو کال کی۔ یقین کیجیے جب سے آپ کو دیکھا ہے آنکھوں سے نیند غائب ہے میں نہ جانے کیوں یقین تھا آپ کے فون کا انتظار کر رہا تھا۔" اس نے میٹھے لہجے میں کہا اور مارے خوشی کے میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

"پہلے ایک بات بتا دیجیے کہ آپ نے حمیدہ سے میری اور اپنی ملاقات کا ذکر تو نہیں کیا ہے ناں۔" اس نے پوچھا۔

"نہیں تو....." میں نے آہستہ سے کہا۔

"بتائیے گا بھی مت..... دراصل زمان میرا بہت اچھا دوست ہے اور اس کی خواہش ہے کہ میں اس کی بہن حمیدہ سے شادی کروں..... وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں اس بات کا اظہار کئی بار کر چکا ہے ہو سکتا ہے کہ حمیدہ کو بھی اس بات کا علم ہو..... لیکن میں حمیدہ کو بالکل بھی پسند نہیں کرتا میرے دل کو پہلی مرتبہ کوئی صورت بھائی ہے تو وہ آپ کی ہے۔" اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا تو ایک دم سے ہی مجھے حمیدہ زہر لگنے لگی اور میں نے جلدی سے کہا۔

"نہیں نہیں آپ بے فکر رہیں میں حمیدہ تو کیا کسی سے یہ بات نہیں کہہ سکتی۔ ویسے بھی حمیدہ سے میری کوئی خاص دوستی نہیں ہے۔"

"گڈ۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔ "ایسی باتیں کسی کو بتانے والی تھوڑی ہوتی ہیں ہم ایک دوسرے سے اچھی

طرح سے واقف ہو جائیں تب میں اپنے والدین کو آپ کے گھر آپ کا ہاتھ مانگنے کے لیے بھیجوں گا۔"

اور پھر اس نے مجھے محبت کا اصول سبق پڑھانا شروع کر دیا اور میں احمق اور بے وقوف لڑکی اس کی چکنی چپڑی باتوں کے سحر میں گم ہوتی رہی۔

بہنوں میں میرا تیسرا نمبر تھا مجھ سے بڑی دو بہنیں تھیں مجھ سے پہلے تو دونوں بڑی بہنوں کی شادیاں ہونی تھیں پھر میرا نمبر آتا۔

آدھی رات کو جب سب گھر والے خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے ہوتے تو میں چھت پر چپکے سے چلی جاتی اور فجر کے وقت تک راحیل سے محبت بھری باتیں کرتی رہتی۔

اب راحیل مجھ سے ضد کرنے لگا کہ میں باہر کہیں اس سے ملوں، وہ مجھے دیکھنا چاہتا ہے اس کی آنکھیں میرے حسن کا دیدار کرنے کے لیے ترس رہی ہیں۔

لیکن میں اس طرح کیسے اس سے مل سکتی تھی۔ اس میں رسوائی تھی ابھی تک تو کسی کو کانوں کان اس بات کی خبر نہیں تھی کہ میں کسی کی محبت میں سر تا پا غرق ہو چکی ہوں، اگر باہر کسی نے مجھے راحیل کے ساتھ دیکھ لیا تو یہ بات میری رسوائی بن کر زمانے کی زبان پر آ جائے گی۔

میں اسے روز نت نئے کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے ٹال دیتی مگر وہ مسلسل ضد کر رہا تھا، اس دن وہ مجھ سے ناراض ہو گیا اور غصے میں فون بند کر دیا اور میرے بار بار ملانے پر بھی فون ریسیو نہیں کیا۔ پھر تو میں رونے لگی میں راحیل کی ناراضگی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی ناراضگی میری موت تھی۔ میں ساری رات روتی رہی۔

دوسری رات بھی میں مسلسل راحیل کو فون کرتی رہی مگر اس نے فون نہیں اٹھایا میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیسے مناؤں۔

اتفاق سے اسی شام کو لوگ آپی کو دیکھنے کے لیے آئے انہیں گوری چٹی آپی فوری پسند آ گئیں مگر جب انہوں نے مجھے دیکھا تو پوچھا کہ یہ کون ہے کیونکہ میں ان سب سے الگ کوئی اور ہی لگ رہی تھی۔

سب لوگ ہنسنے لگے اور آپی نے جھٹ کہا۔ "ابھی اسے تو ہماری امی کہیں سے اٹھا لائی ہیں یہ ہماری بہن تھوڑی ہے۔"

آپی کی ہونے والی ساس بولیں۔ "لیکن شکل تو آپ لوگوں سے مل رہی ہے۔"

تو آپی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ہمارے ساتھ رہتے رہتے ہماری شکلوں میں ڈھل گئی ہے۔"

آپی کی بات پر سب زور سے ہنسنے لگے اور مجھ پر مارے شرمندگی کے گھڑوں پانی پڑ گیا میں بھاگ کر اندر چلی گئی تو آپی آواز دیتی رہ گئی۔

"یہ لڑکی ہی بے وقوف ہے..... پاگل کہیں کی..... یہ کالی ہے ناں اس لیے اسے اپنے کالے رنگ کا کمپلیکس ہے۔" مجھے بہت رونا آیا..... آپی نے اپنے سسرال والوں کے سامنے بھی میرا مذاق اڑایا۔ مجھ سے کوئی بھی محبت نہیں کرتا..... میں بہت بری ہوں..... یہ احساس مجھے مارے ڈال رہا تھا۔ میری ویران اور اجاڑ زندگی میں راحیل بہار کے ایک خوشگوار جھونکے کی مانند آیا تھا میں کتنی خوش رہنے لگی تھی لیکن میں نے ان ہی لوگوں کی عزت کا خیال کرتے ہوئے اپنے پیار کو ناراض کر دیا جب یہ لوگ دوسروں کے سامنے میری عزت نہیں کر سکتیں تو میں کیوں کسی کی عزت کا خیال کر کے اپنی خوشیوں کو آگ لگاؤں۔

میں راحیل سے ملوں گی..... میں نے فیصلہ کر لیا!

پھر میں نے راحیل کو میسج کیا کہ میں تم سے ملنے کے لیے تیار ہوں۔ بتاؤ کہاں اور کب ملنا ہے۔

مسیج پڑھ کر راحیل خوش ہو گیا اور جب میں نے اسے کال کی تو اس نے فون ریسیو کر لیا۔ اور میرے ہیلو کہتے ہی اس نے "مائی ڈارلنگ مائی سوئٹ ہارٹ کہہ کر ریسیور کو چوم لیا۔ اور میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

اس نے مجھے ایک پارک میں ملنے کے لیے بلایا اور میں کالج جانے کے بجائے پارک پہنچ گئی۔

راحیل مجھ سے بہت پہلے ہی سے وہاں موجود تھا، صبح کا وقت تھا۔ پارک میں کوئی نہیں تھا۔ ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ میں نے اسے کل والا واقعہ بھی سنایا کہ کس طرح میری بہن نے مجھے اپنے سسرال والوں کے سامنے بے عزت کیا تھا۔

یہ سن کر راحیل کو بھی بہت غصہ آیا اور اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر بہت ہی پیار سے کہا۔"

اور میرا گال چوم کر مجھے چھوڑ دیا۔

مجھے راحیل کی یہ حرکت بری نہیں لگی بلکہ یہ مجھے اس کی محبت کا ایک انداز لگا۔

اور پھر میں جب بھی موقع ملتا راحیل سے ملنے لگی اس روز کے بعد راحیل نے کبھی میرے ساتھ کوئی بری حرکت نہیں کی۔ میں خوش بھی تھی اور مطمئن بھی۔

ایک روز راحیل نے مجھ سے کہا کہ کل تم ضرور آنا۔ مجھے تمہیں ایک سرپرائز دینا ہے۔ میں وعدے کے مطابق پارک پہنچ گئی۔

وہ دن میری زندگی کا بھیانک ترین دن تھا۔ باتوں کے دوران مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ کب راحیل نے میرے منہ پر کلوروفام سے بھیگا ہوا رومال رکھ دیا اور میں فوراً ہی ہوش وحواس سے بیگانہ ہو گئی۔

ہوش آیا تو اپنے آپ کو ایک چلتی ہوئی گاڑی میں پایا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں ایمبولینس میں پڑی ہوں۔ راحیل میری سامنے والی سیٹ پر بیٹھا ہے اس کے ساتھ ایک دوسرا لڑکا بھی موجود ہے۔

اچانک ہی ایک روح فرسا خیال ذہن میں آیا اور میں تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ راحیل نے مجھے جیسے ہی اٹھتے ہوئے دیکھا اس نے تیزی سے مجھے پکڑ لیا اور سختی کے ساتھ میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

میں راحیل کی گرفت میں بری طرح مچل رہی تھی۔ تب راحیل دوسرے سے بولا۔

"جلدی کرو انجکشن دو۔ ... سالی وقت سے پہلے ہی ہوش میں آ گئی۔"

اس کے ساتھی نے فوراً ہی دوا سے بھری سرنج بھری اور میرے بازو میں انجکشن انجیکٹ کر دیا۔ میرے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑنے لگے اور ذہن تاریک ہونے لگا اور میں ایک بار پھر بے ہوش ہو گئی۔

دوبارہ ہوش آیا تو اپنے آپ کو ایک بند کمرے میں پایا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ کمرے میں صرف ایک بیڈ پڑا تھا باقی سارا کمرہ خالی تھا کمرے میں اٹیچ باتھ بھی موجود تھا۔

میں سمجھ گئی کہ راحیل نے میرے ساتھ کتنا بڑا دھوکا کیا ہے۔ وہ ایک خوب صورت ناگ ہے اور مجھ جیسی احمق اور بے وقوف زدہ لڑکیاں اس کا آسانی سے شکار بن جاتی ہیں۔

میں سمجھ گئی کہ میں اپنے گھر سے بہت دور آ چکی ہوں۔ لڑکیوں کے اغوا کے بہت قصے سنے تھے اور پتا بھی تھا کہ انہیں طوائفوں کے کوٹھوں پر بیچ دیا جاتا ہے تو کیا میں کسی طوائف کے کوٹھے پر موجود ہوں۔ اس خیال کے آتے ہی جیسے میرے جسم سے جان ہی نکل گئی۔ اب انجام مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میرے والدین بہت خاندانی اور شریف تھے۔ وہ میرے بیاہ کا گھر تھا جہاں عزت کی چادر اور چھت تھی مجھے میری لیکن اپنی ذرا سی جذباتیت کے سبب آج میں کہاں پہنچ گئی

ہوں۔ پھر مجھے خیال آیا کہ اگر میری قسمت ہی روٹھ گئی ہو تو میرا مذاق بن جاتا ہے تو آج میں یہ احمقانہ قدم نہ اٹھاتی۔

راحیل بڑا ماہر اور گھاگ کھلاڑی تھا اس نے بہت جلدی مجھے بھانپ لیا کہ میں کیسی لڑکی ہوں۔ باقی اسے مجھ سے ذرا سی گفتگو کرکے اندازہ ہو گیا اور اس نے میری ذات سے بے وقوفی کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔

پچھلے پہر میں دیر تک بیٹھی روتی رہی۔ پھر باہر سے کوئی آواز سننے کی کوشش کی مگر باہر بالکل سناٹا تھا کسی کی آہٹ سنائی نہیں دے رہی تھی البتہ کبھی کبھار کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دیتیں۔

میں نے گھبرا کر بری طرح دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ "کھولو ... کوئی ہے ... مجھے باہر نکالو ...؟"

میری آواز کے جواب میں مجھے کسی کی قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر دروازہ کھل گیا۔ میں وحشت زدہ سی کھڑی تھی۔

دروازہ کھلا اور اندر تین افراد آئے ... جن میں باس نذیر ... اور گلزار شامل تھے۔

میرے پاس دوپٹہ نہیں تھا تین اجنبی مردوں کو یوں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر میں نے جلدی سے بیڈ کی چادر اتار کر اوڑھ لی۔ میں کسی چڑیا کے بچے کی مانند خوفزدہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔

مجھے چادر اوڑھتے ہوئے دیکھ کر وہ تینوں ہنسنے لگے ان تینوں کی آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی بات ہوئی اور ہنستے ہوئے۔

"پریشان مت ہو بے بی ... یہاں تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ چادر اتار کر بیڈ پر رکھ دو یہ اوڑھنے کی نہیں بچھانے کی چادر ہے۔" باس نے مسکراتے ہوئے بہت ہی نرم لہجے میں کہا۔

"تم ... میں کہاں ہوں؟" "یہ کون سی جگہ ہے؟ آپ کون لوگ ہیں ...؟" میں نے چادر کو مضبوطی سے اپنے گرد لپیٹتے ہوئے پوچھا۔

"تم کراچی میں ہو اب تم یہیں رہو گی ... تم راحیل سے محبت کرتی تھیں اور اس سے شادی کرنا چاہتی تھیں نا ... میں راحیل سے تمہاری شادی کرواؤں گا ... چلو شاباش اس چادر کو اتار دو۔" باس نے ساتھ بیٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں میں چادر نہیں اتاروں گی۔ تم راحیل کا نام مت لو وہ ایک کمینہ انسان ہے اس نے مجھے دھوکا دیا ہے اور بے ہوش کرکے یہاں لے آیا ہے۔" میں نے روتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے اگر تم کہہ رہی ہو کہ راحیل ایک کمینہ انسان ہے تو ٹھیک ہوگا۔ اس نے تمہیں دھوکا دے کر واقعی اپنے کمینے ہونے کا ثبوت دیا ہے دھوکا دینا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ اب چادر اتار دو۔" اس نے مجھے پچکارتے ہوئے بچوں کی طرح سمجھاتے ہوئے کہا لیکن آخر میں اپنے مطلب کی بات کی۔

"آپ مجھ سے بار بار چادر اتارنے کے لیے کیوں کہہ رہے ہیں۔ میں ایک شریف لڑکی ہوں آپ مجھے ایک اچھے اور ہمدرد انسان دکھائی دے رہے ہیں۔ پلیز مجھے میرے گھر پہنچا دیں۔" میں نے احمقانہ معصومیت سے کہا تو وہ تینوں پھر ہنسنے لگے لیکن فوراً ہی اس نے گرگٹ کی طرح رنگ بدلا اور دھاڑتے ہوئے کہا۔

"سنا نہیں تم نے ... چادر اتار دو۔"

باس کی بات سن کر میں بری طرح ڈر گئی اور میرے کانپتے ہوئے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے اور چادر میرے کندھوں سے پھسل کر نیچے گر پڑی۔

"گڈ ... ویری گڈ ... سیکسی اینڈ بیوٹی فل ... راحیل کو اس کا معاوضہ دے کر چلتا کرو۔"

میرے کانوں میں باس کی آواز آئی تو میں تیزی سے نیچے جھکی کہ چادر اٹھاؤں تو نذیر تیزی سے میری

WWW.PAKSOCIETY.COM

جانب بڑھا اور میں نے غصے سے اس کا منہ نوچ لیا۔ وہ ایک تیز سسکی لے کر پیچھے ہٹ گیا۔

"اس کے کپڑے اتار دو..." اس کے حلق سے کسی درندے کی سی غراہٹ ابھری اور پھر میں نے اپنی حد تک جدوجہد کی... مگر میں ہار گئی... اور تھوڑی دیر بعد انتہائی شرمناک حالت میں ان تینوں مردوں کے سامنے کھڑی تھی۔

میرا شدت سے دل چاہا کہ کاش یہ زمین پھٹ جائے اور میرا یہ شرمندہ وجود ہمیشہ کے لیے اس میں چھپ جائے میں نے صدق دل سے اپنی موت کی دعا مانگی۔

میرے برہنہ وجود کو دیکھ کر باس کی آنکھوں میں وہ تحسین تھی وہ بہت خوش ہوا لیکن ان تینوں میں سے کسی نے مجھے ہاتھ نہیں لگایا اور تینوں باہر نکل گئے دروازہ ایک بار پھر بند ہو گیا اور میں دھاڑیں مار کر رونے لگی۔

تھوڑی دیر بعد دلیر دوبارہ آیا اس کے ہاتھوں میں کھانے کی ٹرے اور پانی کی بوتل تھی مجھے دیکھ کر اس کے لبوں پر خباثت آمیز مسکراہٹ آ گئی اس نے ٹرے میرے آگے رکھتے ہوئے کہا۔

"کھانا کھا لو..."

میں نے غصے سے ٹرے اٹھا کر دور پھینک دی اور کھلے دروازے سے نکل کر بھاگنے لگی تو دلیر نے مجھے تیزی سے پکڑ لیا اس کی انگلیاں میرے بالوں کی جڑوں کو توڑنے لگیں۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے میرے منہ کو پکڑا اور میرا چہرہ اوپر اٹھا کر غراتے ہوئے کہا۔

"شرافت کی زبان تمہیں سمجھ میں نہیں آتی ہے تجھے... اپنے یار سے ملنے کے لیے جب گھر سے باہر نکلی تھی جب تیری عزت اور شرافت کہاں سو گئی تھی۔ حرامزادی! اور کان کھول کر سن لے یہاں سے باہر مر کر بھی نہیں نکل سکتی۔ ان بھوکے کتوں کی آوازیں سن رہی ہے نا باہر نکلی تو ان کی خوراک بن جائے گی۔ اس لیے خاموشی سے یہاں بیٹھ کر کھانا کھا اور باس کے حکم کا انتظار کر... ورنہ یاد رکھ تیرا وہ حشر کروں گا کہ تو زندوں میں رہے گی نہ مردوں میں۔" اتنا کہہ کر دلیر نے ایک جھٹکے سے میرے بال چھوڑ دیے اور تیزی سے باہر نکل گیا اور جاتے ہوئے باہر سے دروازہ بند کر دیا۔

میرا دماغ مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا کبھی قصور وار مجھے اپنے گھر والے اور ان کا رویہ دکھائی دیتا کبھی اپنی حماقت اور کبھی راحیل کی محبت... کچھ بھی تھا... مگر میں اب بری طرح پھنس چکی تھی۔ بس چڑیا کی طرح ان کے جال میں پھنس چکی تھی جو پھڑپھڑا تو سکتی ہے مگر اڑ نہیں سکتی۔

تین چار دن اسی طرح گزر گئے میں قید تنہائی میں رہی کھانا پینا مسلسل مل رہا تھا اس دوران کوئی مجھ سے ملنے کے لیے نہیں آیا پتا نہیں یہ کون سی جگہ تھی باہر نکل جانا تھا بس کبھی کبھار کتوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ پتا نہیں میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔

تب ہی ایک شام پھر دروازہ کھلا اور دلیر اندر آیا اور بولا۔ "تمہیں باس نے بلایا ہے۔"

میں خاموشی سے اٹھ کر دلیر کے ساتھ اس کمرے سے باہر آ گئی تب میں نے پہلی بار ان شکاری کتوں کو دیکھا لیکن وہ ایک بڑے سے لوہے کے پنجرے میں بند تھے۔

"انہیں اس وقت اس پنجرے میں تمہاری وجہ سے بند کیا ہے کیونکہ کسی بھی اجنبی کو دیکھ کر وہ اس پر جھپٹ پڑتے ہیں اور چیر پھاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔"

میں نے دلیر کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اس منحوس صورت انسان کی شکل سے مجھے شدید نفرت تھی جس کی نہ چاہنے کے باوجود مجھے بار بار صورت دکھائی دیتی تھی۔

دلیر مجھے لے کر ایک دوسرے کمرے میں آیا یہاں صوفے وغیرہ بچھے ہوئے تھے یہاں باس کو میں نے ایک صوفے پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔

"آؤ لڑکی... آؤ ادھر بیٹھو۔" باس نے اپنے قریب صوفے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو میں ڈرتے ڈرتے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"کیسی ہو...؟" باس نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو میں نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔

"میں تم سے دو باتیں کرنا چاہتا ہوں انہیں غور سے سن لو اور سمجھ لو... کیونکہ مجھے بار بار اپنی بات دہرانے کی عادت نہیں ہے۔" باس نے بدستور نرم لہجے میں کہا۔ میں نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے اس کی شکل دیکھتی رہی۔

"راحیل جس کو تم سے محبت کا دعویٰ تھا اور تمہیں راحیل سے... تو وہ تو تمہیں ہمارے ہاتھوں بیچ کر تمہارے دام کھرے کر گیا ہے پورے پچاس ہزار روپے دیے ہیں تمہاری قیمت۔ کیونکہ تم میری امانت پر پوری اتری ہو۔" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوا۔ چند لمحوں کے وقفے کے بعد بولا۔ "خان بہادر خان کا نام سنا ہے کبھی؟" میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"ایک سیاسی لیڈر ہیں۔ میرے بہت اچھے دوست ہیں اور خیر خواہ بھی... ہمارے ایک دوسرے سے بہت سے کام پڑتے رہتے ہیں۔ انہیں سانولا حسن بہت پسند ہے اب انہیں خوش رکھنا ہے اور ان کی پسند کا خیال تو رکھنا ہی پڑے گا نا۔ مجھے تمہاری جیسی حسین حسینہ کی تلاش تھی۔ اب تم مل گئی ہو تو میرے کام تو آ گئی... اب تم تیاری کرو... تمہیں خان صاحب کے ساتھ وقت گزارنا ہے انہیں خوش کرنا ہے اور تمہیں بھی..." باس نے دھیمے لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا۔ عجیب شخص تھا ہر وقت اس کے لبوں پر مسکراہٹ رہتی تھی۔

"میں ہرگز ایسا نہیں کروں گی۔" نہ جانے میرے ڈرے اور سہمے ہوئے وجود میں اتنی ہمت کہاں سے آ گئی کہ میں نے بے ساختہ کھڑے ہو کر سختی سے انکار کر دیا۔

"کیوں بھئی...؟" باس نے دلیر کی طرف دیکھ کر نرم لہجے میں کہا۔

"آپ مجھے شرافت سے میرے گھر واپس بھجوا دیں ورنہ اچھا نہیں ہوگا کیا آپ کی کوئی بیٹی نہیں ہے کیا کسی عورت نے آپ کو جنم نہیں دیا۔ جو آپ کسی دوسرے کے گھر کی عزت کو یوں پامال کر رہے ہیں۔" میں نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا۔

"دلیر!" باس نے مسکراتے ہوئے دلیر کو آواز دی... "بھئی میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ تم اس شریف زادی کو لے جاؤ... اور اس کو باعزت طریقے سے بے عزت کرو...؟"

"جی باس...!" دلیر نے اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بے تکلفی سے باس کو دیکھا۔

"سنا نہیں تم نے... "وہ دور سے دیا... گلزار کو بھی بلا لو... اب کل اس سے بات ہوگی۔" یہ کہہ کر وہ میری جانب دیکھے بنا اٹھ کر تیزی سے چلا گیا۔ میں آنکھیں پھاڑے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

"چل میری بلبل...!" دلیر نے مجھے دبوچتے ہوئے کہا اور میں نے اس کو بری طرح نوچ کھسوٹ ڈالا۔ مجھے ایک اور کمرے میں لے جایا گیا جہاں ہر جانب کیمرے اور لائٹس لگے ہوئے تھے۔

دلیر اور گلزار نے چند گھنٹوں میں میری عزت کی عصمت کر دی... میری برہنہ تصاویر اور ویڈیو ان کے پاس تھی۔

میں بے دام کی چڑیا تھی تب دلیر نے میرے گھر کا

از کم وہ لوگ پاکستان میں تو نہیں ہوں گے اور کسی کو معلوم بھی نہیں ہوگا کنیز کو بھی نہیں۔ اگر اسے معلوم ہوتا تو وہ مجھے یہ بات بھی بتاتی۔

اس کی باتوں اور رویے سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مجھے پسند کرنے لگی ہے مگر میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی کا جذبہ تو تھا مگر کوئی اور جذبہ نہیں تھا۔ اس جذبے سے مجھے فرق نہ تھا کیا تھا مگر اب نہ جانے کیوں اس کا عکس بھی میری آنکھوں میں جھلملانے لگا تھا۔

میری سوچوں کا دھارا بہتے بہتے ایک بار پھر ٹرین کے حادثے میں ہلاک ہونے والے جاوید کی جانب مڑ گیا۔ میں اس کی ماں اور بہن کے بارے میں سوچنے لگا کہ وہ لوگ اس کا انتظار کر رہی ہوں گی اس کے کسی فون کسی پیغام کا... اور جب کسی جانب سے کوئی اطلاع نہیں ملی ہوگی تو وہ کتنا پریشان ہو رہی ہوں گی۔ ماں کی آنکھوں سے تو نیند ہی روٹھ گئی ہوگی۔ اس کے کان دروازے پر ہوں گے' گلی میں چلنے کے قدموں کی آہٹ پر لگے ہوں گے... مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ اسے کون بتائے گا کہ وہ اب اس کا انتظار کرے۔ اس کا بیٹا اب کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔

مجھے اچانک ایک خیال آیا کہ میں جاوید کے گھر اس کا دوست بن کر جا سکتا ہوں اور کچھ رقم اس کی ماں کے ہاتھ پر رکھ کر کہوں گا کہ یہ جاوید نے بھیجے ہیں۔ وہ تو کسی وجہ سے نہیں آ سکا تو شاید اس کی ماں کو بے قرار مت کو قرار آ جائے۔ باس نے مجھے سوہا بچی کے قتل کا جو معاوضہ دیا تھا وہ لفافہ یوں ہی بند پڑا تھا میں یہ رقم جاوید کے گھر دے سکتا ہوں۔

پھر مجھے کوئی دوسرا خیال آیا کہ وہ سمجھ رہا ہوگا کہ میں مر چکا ہوں' اگر میں اسے اپنے زندہ ہونے کی خبر دوں گا تو وہ حیران ہو جائے گا اور مجھ سے ساری داستان سننے کی خواہش کرے گا جو میں فی الحال نہیں کر سکتا۔ اس لیے اس کام کو میں نے موخر کر دیا البتہ جاوید کے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس بات کو کسی سے چھپانے کی ضرورت بھی نہیں تھی میں یہاں سب کو بتا کر بھی جا سکتا تھا۔

میرے پاس ویسے بھی کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا اس لیے میں نے سوچا کہ آج ہی تھوڑا وقت پکڑ کر لیتا ہوں۔ میں نے فوراً تیار ہو کر باس کا دیا ہوا رقم کا لفافہ اٹھایا اس میں سے آدھی رقم نکال کر الماری کی دراز میں رکھی اور آدھی رقم اس ہی لفافے میں رکھ کر جیکٹ کی جیب میں رکھ لی۔

میں نے اکرم کو آواز دی تو وہ فوراً چلا آیا میں نے اس سے پوچھا کہ نیچے پارکنگ میں کوئی کار موجود ہے یا نہیں' کیونکہ اس وقت وہ تینوں گھر سے باہر تھے اور ظاہر ہے وہ گاڑیاں لے گئے ہوں گے تو اکرم نے جواب دیا کہ ایک کار موجود ہے خود آپ ہی کے استعمال میں دے دی گئی سب کی اپنی اپنی گاڑیاں موجود ہیں۔ میں نے اس سے کار کی چابی مانگی جو اس نے مجھے لا دے دی اور کہا۔ "آج سے اس چابی کو آپ اپنے پاس ہی رکھیں۔"

میں نے اسے بتایا کہ میں اپنے ایک دوست کے گھر جا رہا ہوں' ناشتہ تو باہر ایک سے دو گھنٹے لگ جائیں گے اگر کنیز یا شہزاد وغیرہ پوچھیں تو انہیں بتا دینا۔

"یہاں آپ کا کون سا دوست ہے' آپ تو چنڈی کے رہنے والے ہیں۔" اس نے پوچھا مجھے اس کے اس طرح سوال کرنے پر غصہ تو بہت آیا' مگر میں برداشت کر گیا اور کہا۔

"جب تم میرے بارے میں یہ جانتے ہو کہ میں چنڈی کا رہنے والا ہوں تو یہ بھی جانتے ہو گے کہ ٹرین کے حادثے میں جو شخص مرا ہے میں اس کے گھر

لیڈی بس وہراتے ہوئے کہا۔

"آج کے اس شاندار کھیل کی یہ شاندار ویڈیو اور تصاویر تمہارے گھر کے پتے پر ارسال کی جا رہی ہیں اور اس کی ایک ایک کاپیاں تمہارے چاروں کے گھروں میں بھی بھیجی جا رہی ہیں' کیسا لگے گا جب تمہارا باپ یہ سب دیکھے گا اور تمہارے چاروں کے لوگ اس ویڈیو کو دیکھ کر تمہارے باپ کے پاس مبارک باد دینے کے لیے آئیں گے کہ اب اس کی بیٹی کنواری نہیں رہی۔"

"نہیں نہیں تمہیں اللہ کا واسطہ تم لوگ ایسا مت کرنا۔ میں تم لوگوں کا ہر کہنا مانوں گی بلکہ اگر ہو سکے تو میرے گھر یہ اطلاع بھیج دو کہ ان کی بیٹی مر چکی ہے اسے تلاش کرنے کی کوشش نہ کریں۔" میں نے ولیم کے بیچ بلک روتے ہوئے کہا۔

"دوست ہے نا... بس آج سے تمہارا کام صرف باس کے حکم کو بجا لانا ہے۔ ایسا کرو گی تو سب ٹھیک رہے گا ورنہ... تمہاری ویڈیو تو ہمارے پاس محفوظ ہے۔" ولیم نے خباثت سے کہا۔

"نہیں... باس سے کہنا میں ان کی کنیز ہوں' جیسا وہ چاہیں گے ویسا ہی ہوگا۔" میں نے روتے ہوئے کہا۔

اور باس نے میرا نام "کنیز" ہی رکھ دیا۔ مجھے پورے پانچ سال ہو گئے ہیں ادھر آئے ہوئے۔ میرے گھر والوں کا کیا حال ہوا' وہ لوگ اب کہاں ہیں' زندہ بھی ہیں یا مر گئے۔ جن کی جوان بیٹیاں یوں اچانک لاپتہ ہو جائیں وہ لوگ زندہ ہوتے ہوئے بھی مر ہی جاتے ہیں۔

مجھے کنیز کی داستان سن کر بہت افسوس ہوا تھا بار بار میری آنکھوں میں فائزہ کی شکل آ رہی تھی اس کی بے بسی کی موت... اس کی بے حرمتی۔ کیا قصور تھا اس کا... کنیز تو اپنے آپ کو بہت کچھ مجرم سمجھ رہی تھی مگر میری بہن فائزہ تو بہت معصوم تھی اس کا قصور تو واحد لے سے بھی نہیں مل رہا تھا۔

یہ باس اور اس جیسے حضرت... چاہے وہ سردار شیر افضل ہو یا شہزادہ خٹک یا مسٹر کا باپ ارباب ہو سارے ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ میرے دل میں ان سب کے لیے انتہائی نفرت اور حقارت تھی۔ یہ لوگوں کو مجبور کر کے جرائم کرواتے ہیں۔ پھر ان جرائم کی مووی بنا کر انہیں زندگی بھر بلیک میل کرتے رہتے ہیں۔ شاید سب ہی کی کوئی نہ کوئی کمزوری اس آغا قزلباش کے ہاتھ میں ہوگی میرے ساتھ بھی اس نے ایسا ہی کیا تھا' یہ بات بھی مجھے کنیز نے ہی بتائی تھی۔

کنیز نے مجھے بتایا تھا کہ باس کے پاس کچھ لڑکیاں ہیں جو جوان لڑکوں کو پھنسا کر اغوا کرتی ہیں تو ایسے لڑکے بھی ہوں گے جو جوان لڑکیوں کو پھنسا کر لاتے ہوں گے اور باس ان لڑکیوں کو دوسرے ممالک میں فروخت کر دیتا ہے۔

میرے ذہن میں رہ رہ کر ایک ہی بات آ رہی تھی کہ باس کے ہاتھ میں کتنے لوگوں کی کمزوریاں ہیں۔ جن سے فائدہ اٹھا کر وہ انہیں اپنے اشاروں پر نچاتا ہے تو باس کی بھی تو کوئی نہ کوئی کمزوری ہوگی بلکہ ہر شخص کا کوئی نہ کوئی ویک پوائنٹ ہوتا ہے اب یہ سامنے والے پر اور اس کی عقل مندی پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ اس شخص کے ویک پوائنٹ کو کس طرح جانتا ہے اور اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

اور اس کام کے لیے مجھے زیادہ سے زیادہ باس کا اعتماد حاصل کر کے اس کے نزدیک ہونا ہے اور اس کا ویک پوائنٹ حاصل کرنا ہے' کیونکہ اس کی کوئی کمزوری ہی پتا نہیں اگر ہے تو وہ کہاں ہے مجھے پورا یقین تھا کہ کم

چاہتا ہوں۔" میں نے ناگواری لہجے میں کہا۔

"ذرا دھیان سے جائیے گا۔" اس نے کہا۔

"مجھے سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے مجھے اپنی حفاظت خوب اچھی طرح کرنی آتی ہے۔" میں نے ترش لہجے میں جواب دیا تو وہ بے پروا انداز میں کندھے اچکا کر چلا گیا۔

میں غصے میں بھناتا ہوا تیزی کے ساتھ فلیٹ کی سیڑھیاں اترنے لگا۔ لائٹ نہیں تھی اس لیے لفٹ بند تھی۔

اس بلڈنگ کے زیادہ تر فلیٹ باس کی ملکیت تھے اور اس میں زیادہ تر لوگ باس کے آدمی ہی تھے۔ یہ بات مجھے مظفر نے بتائی تھی اور ابھی تک ان میں سے میں زیادہ تر چہروں سے آشنا تھا۔

میں نے کار اسٹارٹ کی اور بلڈنگ کے احاطے سے باہر نکلنے لگا تب ہی میں نے ایک شخص کو وہاں کھڑے دیکھا جو بے پروا انداز میں ایک کار سے ٹیک لگائے کھڑا سگریٹ کے کش لے رہا تھا میرے گیٹ سے باہر نکلتے ہی وہ بھی تیزی کے ساتھ کار میں بیٹھ گیا۔ میں نے بیک مرر میں اسے ایسا کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا میرے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی یعنی اکرم نے میرے پیچھے بندہ لگا دیا ہے لیکن مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا میں نہ تو اس بات کو کسی سے چھپا رہا تھا اور نہ ہی کوئی جرم کر رہا تھا جو میں کسی سے ڈرتا۔

راستے میں میں نے اسے کئی جگہ ڈاج دینے کی کوشش کی لیکن وہ مستقل میرے پیچھے چپکا رہا تو مجھے اس احمق آدمی پر غصہ آ رہا تھا کہ اس آدمی کو یہ بھی نہیں معلوم کہ تعاقب کس طرح کیا جاتا ہے ایسے کہ اس شخص کو شبہ بھی نہ ہو کہ اس کا پیچھا کیا جا رہا ہے جب میں نے ہی اسے پہچان لیا تو دوسرے کیا تو خیر ہے میں نے سوچا کہ باس نے کس قسم کے بودے اور احمق آدمیوں کو ان کاموں کے لیے رکھا ہے ایسے کام تو کوئی تیز اور شاطر آدمی ہی کر سکتا ہے۔ میں نے سوچا کہ میں باس سے اس بارے میں ضرور بات کروں گا ہو سکتا ہے کہ میرے بے خبر ہو جائیں۔

راستے بھر میں اسی قسم کی باتیں سوچتا ہوا قاسم آباد کے اس محلے میں پہنچ گیا جاوید نے مجھے بتایا تھا کہ میری گلی کے سرے پر ایک میڈیکل اسٹور ہے "میڈیکل اسٹور" کے نام سے تم اس کے سامنے اندر گلی میں جا کر دائیں ہاتھ پر پانچواں مکان میرا ہے۔

میں نے اپنی گاڑی میڈیکل اسٹور کے قریب پارک کر دی۔ اسٹور پر اس وقت بھی کئی افراد کھڑے تھے۔ مکان نمبر بھی میرے ذہن میں تھا۔ میں گاڑی لاک کر کے اندر گلی میں داخل ہو گیا۔

اچانک ہی میرے ذہن میں خیال آیا کہ جاوید نے پہلی ہی ملاقات میں جبکہ میں اس کے لیے بالکل ہی اجنبی تھا مجھ سے اتنی ساری باتیں کیوں کیں اور نہ صرف باتیں کیں اپنے گھر اور گھر والوں کے متعلق بہت کچھ بتایا اور اپنے گھر کا ایڈریس بھی۔ شاید یہ سب اس سے قدرت نے کہلوایا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے اور پھر چونکہ میں اس کے گھر کے متعلق بہت کچھ جان چکا ہوں تو یہ میرا فرض بنتا ہے کہ میں اس کی بیوہ ماں اور جوان بہن کا خیال رکھوں۔

میں پانچویں مکان پر رک کر مکان کے باہر لگی نیم پلیٹ پڑھنے لگا یہاں جاوید کا نام اور گھر کا نمبر لکھا ہوا تھا جاوید کا نمبر پڑھ کر ہی مجھے اطمینان ہو گیا تھا اس لیے میں نے بڑی کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھ دی۔

گھر کے اندر بجنے والی بیل کی آواز مجھے باہر بھی سنائی دے رہی تھی۔ تقریباً چند منٹ بعد ہی اندر سے ایک لڑکی کی آواز سنائی دی۔

"کون ہے؟"

"میں جاوید کا دوست ہوں اور اس کا ایک پیغام لایا ہوں۔" میں نے دروازے سے لگ کر جواب دیا۔

"ایک منٹ رکیں پلیز۔" اندر سے پہچان تیز لہجے میں کہا گیا۔ میں انتظار کرنے لگا وہ یقیناً یہ بات اپنی ماں کو بتانے کے لیے گئی ہوگی۔ میں گھر کے باہر کھڑا گلی میں یوں ہی بے مقصد ادھر ادھر گردن گھما کر دیکھنے لگا تب ہی میری نگاہ گلی کے کونے کے پول سے ٹیک لگائے کھڑے ایک جوان لڑکے پر پڑی جو میری جانب ہی دیکھ رہا تھا۔ شکل سے ہی غنڈہ موالی دکھائی دے رہا تھا۔ منہ میں پان اور انگلیوں میں سگریٹ دبی ہوئی تھی گلے میں اس نے رومال باندھا ہوا تھا۔ ابھی میں اس لڑکے کا تفصیلی جائزہ لے رہا تھا کہ اندر سے ایک لرزتی کانپتی آواز آئی۔

"کون ہے بیٹا......"

"دروازہ کھولیں ماں جی میں غلط نہیں ہوں جاوید کا دوست ہوں اسی نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے مجھے آپ سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔" میں سمجھ گیا کہ اس مرتبہ جاوید کی والدہ آئی ہیں۔ دونوں خواتین صد درجہ احتیاط اختیار کیے ہوئے تھیں۔ انہیں کسی سے ڈر یا خوف تو نہیں ہے یہ ان سے مل کر ہی معلوم ہوگا میں نے دل میں سوچا۔

اندر سے کنڈی کھلنے کی آواز آئی اور دروازہ تھوڑا سا کھل گیا اور ادھ کھلے دروازے سے ایک بوڑھا خزاں رسیدہ اور حزن زدہ چہرہ مجھے دکھائی دیا۔

میری شکل پر نظر پڑتے ہی تو بڑی بی کچھ خوف زدہ ہو گئیں۔ میرا حلیہ ہی کچھ ایسا تھا بڑی بڑی مونچھیں داڑھی اور مضبوط کاٹھی بھی لیے۔

"بیٹا آپ کا نام بھی جاوید کے منہ سے سنا نہیں آپ اس کے کون سے دوست ہیں۔" انہوں نے انکار لہجے میں پوچھا۔

"ماں جی اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے اندر بلالیں۔ میں اطمینان سے بیٹھ کر آپ سے بات کر سکوں گا اور جاوید کے بارے میں آپ کو بتا سکوں گا اگر آپ مجھے گھر کے اندر بلانا مناسب نہیں سمجھتیں تو کوئی بات نہیں آپ یہ لفافہ رکھ لیں یہ جاوید نے آپ کے لیے بھیجا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے جیکٹ کی جیب سے براؤن لفافہ نکال کر اس کی جانب بڑھا دیا۔

ماں جی لفافہ لیتے ہوئے ہچکچا رہی تھیں۔ ان کی مشکل یہ تھی کہ وہ ایک جوان بیٹی کی ماں تھیں اور یوں ایک اجنبی پر بھروسہ کرنا دشوار تھا۔

"بیٹا مجھے ماں جی یا آپ کے بیٹے کے ہی جیسے ہیں۔" نہ جانے کیوں یہ بات کہتے ہوئے میری آواز بھرا گئی مجھے ایک دم اپنی ماں کی یاد آ گئی۔ مائیں تو سب کی سانجھی ہوتی ہیں ماں تو صرف ماں ہوتی ہے چاہے کسی کی بھی ہو اتنی ہی احترام اور عزت کے لائق۔

"اچھا ماں جی اب میں چلتا ہوں۔" میں نے لفافہ دوبارہ اندر کرتے ہوئے کہا جو انہوں نے تھام لیا پھر ہچکچاتے ہوئے بولیں۔

"بیٹا ایک منٹ رکو تم اندر آ جاؤ اور بتاؤ کہ جاوید کہاں ہے۔"

"بہت شکریہ ماں جی۔" میں نگاہیں نیچی کر کے ان کے گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ میں نے ایک نگاہ ہی میں دیکھ لیا کہ دو کمروں کے درمیان میں ایک چھوٹی سی گیلری تھی جس کا دروازہ گلی میں کھلتا تھا آگے کا آنگن تھا دونوں کمروں کے دروازے آمنے سامنے تھے۔

ماں جی دائیں طرف والے کمرے کی جانب مڑ گئیں کمرے میں اندھیرا ہو رہا تھا انہوں نے اندر جا کر لائٹ آن کی میں باہر کھڑا رہا روشنی ہو جانے

WWW.PAKSOCIETY.COM

انھوں نے آواز دے کر مجھے اندر بلا لیا۔

یہ ایک چھوٹا سا ڈرائنگ روم تھا کم قیمت اور سلیقے سے سجا ہوا۔ لکڑی کا صوفہ تھا زمین پر سستا سا ریڈ کارپٹ بچھا تھا۔ دروازے اور کھڑکیوں پر معمولی کرٹن تھے چاروں پر بیزاری بھی معمولی قسم کی تھی۔

ماں جی نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ کسی زمانے میں وہ خاصی حد تک حسین رہی ہوں گی اس وقت بھی ان کی رنگت سرخ و سفید تھی بڑی بڑی سی آنکھیں تھیں۔ تھکی اور غمگین پلکوں سے بے طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ ان کے معمولی سوت میں وہ صوفے پر کچھ بجھی بجھی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ اس وقت ان کے دل کی کیا حالت ہو رہی ہوگی۔ مگر وہ بظاہر تحمل سے بیٹھی تھیں۔ میں خاموش ہی رہا۔ تب وہ بولیں۔

"بیٹا جاوید کہاں ہے وہ خود کیوں نہیں آیا اس نے کوئی فون بھی نہیں کیا۔ نہ اپنی خیریت کی کوئی اطلاع دی۔ وہ تو تین دن کے لیے چھٹی گیا تھا۔ ٹرین میں بھی سوار ہو گیا تھا۔ تب آخری بار اس کا فون آیا تھا۔ اس کے بعد...." اس سے آگے وہ بول ہی نہیں سکیں۔ ان کی آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ ڈھیر سارے آنسو حلق میں اتر آئے اور آواز بند کر دی۔

"جی ماں جی ایسی ہی بات ہے لیکن...." میں اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ کچھ میں ہی نہیں آیا کہ فوری طور پر ان سے کیا کہوں۔ جوان بیٹے کی موت کی اطلاع یوں اچانک نہیں دینا چاہتا تھا۔

"لیکن کیا بیٹا....؟" انھوں نے بے قرار لہجے میں پوچھا۔ "ہمیں معلوم ہوا تھا کہ جس ٹرین میں جاوید آ رہا تھا اس کا حادثہ ہو گیا تھا ہم نے بہت بھاگ دوڑ کی سارے زخمی جس ہاسپٹل میں تھے سب جگہ دیکھا۔ مرنے والوں کی لسٹ دیکھی مگر میرا بیٹا کہیں نہیں تھا۔ اس بات کا تو اطمینان تھا کہ جاوید ماشاء اللہ زندہ ہے پھر وارث تو شیں بھی تھیں ان کے چہرے بھی دیکھے میری مشابہت بہت ملتی ہے اس نے دن رات ایک کر دیے بھائی کی تلاش میں لیکن اس کی کوئی خبر نہیں ملی آج اتنے عرصے کے بعد تم آئے ہو اس کا پیغام لے کر...."

میری نگاہ ڈرائنگ روم کے دروازے کی جانب اٹھ گئی جہاں گلابی دوپٹے کا پلو لہرا رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یقیناً جاوید کی بہن مشال ہے جو بے تابی سے بھائی کے بارے میں جاننے کے لیے دروازے سے لگی کھڑی ہماری باتیں سن رہی ہے۔

"بات یہ ہے ماں جی کہ جاوید اس ٹرین میں سوار ضرور ہوا تھا مگر چلنے سے پہلے اسے ٹرین سے اتار لیا گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"لیکن کیوں؟" انھوں نے احتجاج کے انداز میں کہا۔

"ماں جی ٹکٹ لیتے ہوئے جاوید کا ایک شخص سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ حالانکہ چاقو اس شخص نے جاوید پر حملہ کرنے کے لیے نکالا تھا لیکن جب وہ دونوں آپس میں گتھم گتھا ہوئے تو جاوید اس کے ہاتھ سے چاقو چھیننے لگا لیکن اچانک وہ دونوں نیچے گر پڑے اور چاقو جاوید کے ہاتھ سے اس شخص کے سینے میں گھس گیا۔"

"ہائے میرے اللہ...." میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ ماں جی کے منہ سے ایک چیخ سی نکل گئی اور انھوں نے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی بلند ہونے والی چیخ کو روکنے کی کوشش کی۔ گلابی دوپٹے کے لہراتے ہوئے پلو میں بھی ہلچل سی ہوئی۔

"پھر.... پھر کیا ہوا؟" میں بولتے بولتے رک گیا تو وہ بے تاب ہو گئیں اور میرے قریب آ کر کھڑی ہو گئیں۔

"آپ بیٹھ جائیں ماں جی....!" میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے نزدیک بٹھا لیا۔ وہ دہشت زدہ سی میرے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے بری خبر کی منتظر تھیں۔

"جاوید تیزی سے اس شخص سے علیحدہ ہو گیا اور خوف زدہ ہو کر بھاگ نکلا اور ٹرین میں سوار ہو گیا اور خاموشی سے ایک جانب بیٹھ گیا۔ ایک تو اس کا قصور نہیں تھا وہ تو خود حملہ آور ہوا تھا اور پھر وہ شخص تھا تو وہ جاوید سے لڑ گیا اور ہاتھا پائی پر اتر آیا چاقو بھی اس نے جاوید کو زخمی کرنے کے لیے نکالا تھا لیکن اپنے چاقو سے خود ہی زخمی ہو گیا۔ کہیں یہ کوئی لمبا چکر ہی نہ چل جائے جاوید کو تو کراچی آنا تھا ٹرین بھی اسٹیشن پر تھی اس لیے وہ بھاگ کر اس میں سوار ہو گیا اور شاید اسی وقت اس نے آپ کو فون کیا ہوگا۔

وہاں جب لوگوں نے ایک بندے کو زخمی حالت میں تڑپتے ہوئے دیکھا تو پولیس موبائل کو بلا لیا جو اسٹیشن پر موجود تھی۔

کچھ لوگوں نے جاوید کو ٹرین میں چڑھتے ہوئے دیکھ لیا تھا اس لیے پولیس نے فوراً خاص ٹرین کو روانہ ہونے سے روک دیا اور ٹرین میں جاوید کی تلاش شروع کر دی اور بے چارے کو گرفتار کر لیا گیا۔

وہ شخص جو جاوید کے ہاتھوں زخمی ہوا تھا ہاسپٹل پہنچا دیا گیا وہ زندہ تھا مگر چاقو کا زخم گہرا تھا۔ بہت ہوا تو ہوش کے قریب آیا تھا لیکن ان تیزی سے پھیلا اور تیسرے روز وہ شخص چل بسا۔ جاوید پر قتل کا مقدمہ قائم ہو گیا۔

تب اس نے بڑی مشکلوں سے ادھر سن کر مجھے کراچی کال کی تھی میں جیل سے آیا ہوا ہوں اس نے یہ ساری باتیں مجھے بتائی ہیں اور خاص تاکید کی ہے کہ اس کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتایا جائے خاص طور پر جیل میں موجود دہشت والوں کو سب سے پہلی کہا جائے کہ میں ملک سے باہر گیا ہوا ہوں۔

وہ خود بھی اس بات سے بہت پریشان تھا کہ آپ لوگ بھی بہت زیادہ پریشان ہو رہی ہوں گی۔ اس نے مجھے ایک لفافہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ میں یہ آپ کو دے دوں۔" میں اپنی بات ختم کر کے خاموش ہو گیا۔ ماں جی اب باقاعدہ سسکیوں سے رو رہی تھیں۔ میں نے انھیں بہت تسلیاں دیں اور کہا۔

"ماں جی آپ فکر نہ کریں جب تک جاوید گھر لوٹ کر نہیں آ جاتا آپ مجھے اپنا جاوید سمجھیں۔ میرا موبائل نمبر نوٹ کر لیں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو کوئی مسئلہ ہو مجھے بس ایک کال کر دیں۔ اور اگر ہو سکے تو مجھے اپنا بھی کوئی کانٹیکٹ نمبر دے دیں۔" میں نے کہا۔

"امی ان سے کہیں کہ کیا پتہ ہمیں بھائی جان سے جیل لے جا کر ملوا سکتے ہیں۔" باہر سے آنسوؤں میں بھیگی ہوئی آواز سنائی دی تو ماں جی میری جانب جواب طلب نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔ کیونکہ سوال تو میں ان ہی کا تھا۔

"نہیں نہیں آپ لوگ اس بات کی کوشش بھی مت کیجیے گا جاوید نے سختی کے ساتھ منع کیا ہے۔" میں نے تیزی کے ساتھ کہا۔

"بیٹا تم وہاں گئے تھے تو کم از کم میری اور اس کی بات ہی کروا دیتے۔" ماں جی نے بے چارگی سے کہا۔

"امی جان بھائی جان نے ان کو بھی تو فون کیا تھا تو کیا وہ ہمیں ایک فون کر کے اپنے بارے میں نہیں بتا سکتے تھے۔" باہر سے مشال کی آواز آئی۔

"میں آپ کی جاوید سے بات کرا سکتا تھا اور جاوید بھی آپ کو فون کر کے اپنے بارے میں بتا سکتا تھا مگر اس نے ایسا کرنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ ایک تو یوں اچانک اس طرح کی خبر دے کر وہ آپ لوگوں کو پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا دوسرے یہ کہ اس کی ہمت ہی نہیں

ہو رہی تھی کہ وہ آپ لوگوں سے بات کر سکتا اس لیے
اس نے مجھے بھیجا کہ آپ لوگوں کے پاس بھیجا ہے۔
تاکہ آپ لوگ خود کو تنہا نہ سمجھیں۔ میں نے جاوید کے
مقدمے کے لیے وکیل کیا ہے اس کا مقدمہ ابھی چل
رہا ہے۔ مگر پیشی کی تاریخ کافی لمبی آتی ہے۔ آپ اللہ
سے دعا کریں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے
آہستہ آہستہ سمجھانے کے انداز میں کہا۔
"اچھا بیٹا تم ایک منٹ رکو میں ابھی آئی۔" ماں جی
نے اپنے آنسو صاف کیے اور تیزی سے اٹھ کر کمرے
سے باہر چلی گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آئیں تو
ان کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا ڈبہ تھا۔ انہوں نے
میرے سامنے کھولتے ہوئے کہا۔
"بیٹا میرے پاس رقم تو نہیں ہے البتہ یہ اچھے
وقتوں کے کچھ زیور ہیں جو میں نے عشاء اور جاوید کی
دلہن کے لیے سنبھال کے رکھے تھے تم انہیں لے جاؤ
اور فروخت کر کے مقدمے میں جتنا خرچ آئے ان
روپوں کو استعمال کرو۔"
"کیسی باتیں کر رہی ہیں ماں جی ۔۔۔ آپ نے تو
مجھے بھری محفلوں میں رسوا کر دیا۔ کیا آپ مجھے اپنا بیٹا
نہیں سمجھتیں جو وہ اگر آپ کا بیٹا ہے تو میرا بھی بھائی
یار ہے اور یار ہو کر اگر جانے مجھے سب کچھ جانے گا
اور ایک بات بتاؤں ماں جی آپ کو ۔۔۔ جاوید تو اتنا
خوش نصیب ہے کہ اس کے لیے دعا کرنے والی ماں
موجود ہے لیکن میں تو اتنا بدنصیب ہوں کہ اس عظیم
نعمت سے محروم ہوں۔ نہ ماں نہ باپ اور نہ کوئی بہن
بھائی۔ میں تو دنیا میں بالکل ہی تنہا ہوں کیا چلا جائے گا
آپ کا جو میں چند دن آپ کے پاس آ کر ماں کی
محبت کی مٹھاس چکھ لوں گا۔" میں نے بھرائے ہوئے
لہجے میں کہا۔
"یہ بات نہیں ہے بیٹا میں تو بس ۔۔۔ تم اولاد
مت ہو۔ تم جاوید ہی کی طرح میرے بیٹے ہو۔ اللہ
تمہیں خوش رکھے کبھی زندگی میں کوئی دکھ نہ
ملے ۔۔۔" انہوں نے محبت سے میرے سر پر ہاتھ رکھ
کر دعا دی۔
"دکھ" میں نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ
کہا۔ "زندگی نے اتنے دکھ دیے ہیں ماں جی کہ اب
اگر دکھ آئے بھی تو یہ سوچ کر لوٹ جائیں گے کہ اب
اس شخص کو دکھوں کو اٹھانے کا یارا ہی باہر ہو چکا ہے
ہماری جگہ نہیں ہے۔ آپ یہ زیور پہلے کی طرح سنبھال
کر رکھیں جب میں ہوں تو آپ کو اس بات کی کوئی فکر
نہیں کرنی چاہیے۔" میں نے زیورات کا ڈبہ بند کر کے
ان کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔ "چاہیے پہلے انہیں
رکھ کر آئیے۔"
ماں جی ڈبہ اٹھا کر باہر نکلیں تو مجھے دروازے کے
باہر سے تیز سرگوشی سنائی دی۔
"امی آپ یہ زیور لے کر کہاں جا رہی ہیں۔"
"وہ میں تو بیٹے کو ۔۔۔؟"
"امی کیا ہو گیا ہے آپ کو ۔۔۔ جب تک ہماری
بھائی جان سے بات نہیں ہو جاتی" آپ نے اس کی
شاید بھائی کی بات پر یقین کیسے کر لیا اللہ جانے کون ہے
کہاں سے آیا ہے کیا چاہتا ہے آپ نے حلیہ دیکھا
ہے اس کا دہشت گردوں جیسا لگ رہا ہے بیچارا ۔۔۔"
"بے وقوفی کی باتیں مت کرو ۔۔۔ میں نے زیور
اس کے آگے رکھے تھے مگر اس نے لینے سے صاف
انکار کر دیا۔ اگر کوئی چال باز ہوتا تو جھٹ اٹھا لیتا وہ بے
چارہ تو دنیا میں اکیلا ہے۔"
"آپ تو بس جلدی یقین کر لیتی ہیں سب کی باتوں میں آ جاتی
ہیں۔ میری بھولی امی ۔۔۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں
اس سے بات کروں۔"
"نہیں کوئی ضرورت نہیں ہے اب میں اتنی بھی

احمق نہیں ہوں جو یوں منہ اٹھا کر ہر ایک کا اعتبار کروں
گی۔ دنیا دیکھی ہے میں نے لوگوں کی پہچان ہے مجھے
شکل سے ہی کسی شریف ماں باپ کی اولاد لگ رہا
ہے۔"
"مجھے تو شکل سے غنڈہ لگ رہا ہے۔"
"عقل زیادہ ہو رہی ہے تو اس کو استعمال کرو اور
چائے کی ٹرے مجھے پکڑاؤ۔"
"اب زیادہ خاطر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔
جلدی سے چلتا کریں اسے ۔۔۔" اس کے جاتے
جاتے میرے کان میں آواز آئی۔
دونوں کی گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا کہ عشاء
ایک سمجھدار لڑکی ہے اور خاصی ذہین بھی۔ اس نے
میرے بارے میں بالکل ٹھیک اندازہ لگایا تھا۔
ماں جی ہاتھوں میں ٹرے تھامے اندر آئیں اور ٹیبل
پر میرے سامنے رکھتے ہوئے بولیں۔ "بیٹا چائے پیو۔"
چائے کے ساتھ ایک چھوٹی طشتری میں چند
بسکٹ بھی رکھے تھے۔ "اس کی کیا ضرورت تھی ماں جی۔
میں اب چلتا ہوں ہاں آپ اپنا کوئی نمبر دے دیں۔
تاکہ میں آپ کی خیریت معلوم کرتا رہوں اور میرا
نمبر بھی نوٹ کر لیں تاکہ اگر آپ کو میری ضرورت ہو تو
مجھے بلا سکیں۔" میں نے کہا۔
"ہاں عشاء کے پاس موبائل فون ہے۔ عشاء بیٹی
ذرا اپنا موبائل نمبر تو دے دو۔" ماں جی نے آواز لگائی۔
مگر اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ تھوڑی دیر انتظار
کرنے کے بعد ماں جی کمرے سے باہر گئیں۔ مجھے
ان کی باتیں سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ بس الجھن بہت ہی
ہو رہی۔ یقیناً عشاء اپنے فون کا نمبر نہیں دے رہی
ہوگی لیکن ماں جی نمبر لے ہی آئیں۔ ان کے ہاتھ میں
ایک چھوٹی سی چٹ تھی جس پر نمبر لکھا تھا میں نے وہ
نمبر اپنے سیل فون میں محفوظ کر لیا جلدی جلدی چائے
پی اور ماں جی سے اجازت لے کر میں جیسے ہی کمرے
سے باہر نکلا۔
مجھے وہ سامنے کھڑی دکھائی دے گئی۔ صحن میں
کھڑی وہ اپنے بالوں میں کنگھا کر رہی تھی اس پر نگاہ
پڑتے ہی میرے قدم صحن کے بیچ میں ہی جکڑ لیے۔ میں
چند لمحوں تک تو اسے دیکھتا رہا پھر وہ تیزی سے کمرے
کی دیوار کی اوٹ میں ہو گئی تو مجھے ہوش آیا اور میں گلی
میں نکلنے والے دروازے سے باہر نکل آیا۔
عشاء کی حسین صورت میرے دماغ میں نقش ہو گئی
تھی۔ راستے میں حسن والے چہرے بہت کم دیکھنے کے
لیے ملتے ہیں۔ اس کی شکل میں ماں جی کی بہت
شباہت تھی۔ میں عشاء کے حسن میں کھویا ہوا تیزی سے
جا رہا تھا کہ اچانک کسی نے میرا راستہ روک لیا۔
"بڑی تیزی میں لگتے ہو ذرا سا ادھر گلی تو سنتے جاؤ
جی ۔۔۔؟"
میں رک گیا اور دیکھا تو یہ وہی شخص تھا جس کو میں
نے ٹیلی فون کے کھمبے سے ٹیک لگائے کھڑا دیکھا تھا
جب بھی یہ مجھے مسلسل گھور رہا تھا۔
"کہو کیا بات ہے؟" میں نے رک کر نرم لہجے میں
پوچھا۔
"کون ہو تم اور یہاں کس لیے آئے تھے؟" اس
نے بائیں جانب جھک کر زمین پر منہ سے پان کی
پچکاری نکالی اور منہ میں موجود پان کے ملغوبے کو زبان
سے ایک طرف کرتے ہوئے بولا۔
"آپ فرمائیے آپ کون ہیں اور مجھ سے اس طرح
سے سوال کس حیثیت سے کر رہے ہیں۔" میں نے
انہیں ان کے لہجے میں پوچھا۔
"میں محلے کا ٹھیکیدار ہوں سمجھے ۔۔۔" اس نے اپنی
باچھوں کو پھیلاتے ہوئے اور ایک جھٹکے سے گلے سے
رومال کو کھینچتے ہوئے بدمعاش کے انداز میں کہا۔

"میں تم جیسے خدائی فوجداروں کو اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ یہ میری خالہ جی کا گھر ہے جو آج کل یہاں نہیں ہے اس لیے میں کچھ ضروری چیزیں لے کر آیا تھا۔ آج تو آیا ہوں اور آئندہ بھی آتا جاتا رہوں گا۔ تمہیں کوئی تکلیف ہو تو اس کا علاج کرو اور آئندہ میرا راستہ روکنے کی کوشش مت کرنا' سمجھے ...... یا کسی اور زبان میں سمجھاؤں۔" میں نے غصے سے سخت اور تیز لہجے میں کہا۔

"بے بجا ہے ...... ذرا زیادہ ہی جوانی کا جوش ہے۔" اس نے طنزیہ انداز میں کہا اور مڑ کر مجھے دیکھتے ہوئے چلا گیا۔

میں نے فی الحال اس سے الجھنا مناسب نہیں سمجھا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔

وہاں سے واپسی پر میں نے پھر اس شخص کو اپنے تعاقب میں آتے ہوئے دیکھا لیکن وہ مجھے راستے سے وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور میں فلیٹ میں واپس آ گیا۔

واپس آیا تو فلیٹ ویسے کا ویسا ہی خالی پڑا تھا' سوائے اکرم کے اور کوئی نہیں تھا۔

"بڑی جلدی واپس آ گئے آپ۔" میرے اس سوال کے جواب میں کہ کوئی ابھی تک واپس نہیں آیا جو میں نے اکرم سے پوچھا تھا اس نے کہا۔

"ہاں مجھے اتنا ہی وقت لگتا' ویسے یار تم نے میرے پیچھے جس شخص کو بھیجا تھا اس سے کہہ دو کہ آئندہ کسی کا تعاقب کرو تو ایسے بھونڈے اور بچکانہ طریقے سے مت کرنا کہ اگلے شخص کو فوراً ہی اس بات کا پتا چل جائے۔"

"کیا مطلب ......؟" اکرم نے گھبرا کر کہا۔

"میرا خیال ہے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے اس میں سمجھ میں نہ آنے والی تو کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"شاید آپ کو یہ بات بری لگی ہے لیکن یہ میری مجبوری ہے۔ میرے لیے باس کا حکم اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ آپ نئے آئے ہیں۔ اس لیے آپ کہاں جا رہے ہیں' کن لوگوں سے مل رہے ہیں ان سب کی انفارمیشن ہمیں باس کو دینی ہے۔" اس نے شرمندہ ہو کر کہا۔

"یہ بات میں باس کو خود ہی بتا دوں گا اور یہ بھی کہ اگر مجھے بے ایمانی کرنی ہوگی تو ہزار طریقے بہانوں سے کر لوں گا اور تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا کیونکہ میں پٹھان ہوں' کھرا بندہ ہوں' اپنی بات اور اپنے وعدے کا پابند۔ میں دھوکا دینے والوں میں سے نہیں بلکہ دل کا تو سامنے سے وار کر ......"

یہ کہہ کر میں اکرم کو وہیں چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گیا اور جوتے اتارے بغیر ہی بیڈ پر سیدھا سیدھا لیٹ گیا۔

آنکھیں موندیں تو عشاء کا سراپا اپنی پوری سحر سامانیوں کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے تھا' میرا شدت سے دل چاہا کہ وہ میرے سامنے کھڑی رہتی اور میں اسے یونہی دیکھتا رہتا۔ میرے اوپر نگاہ پڑتے ہی اس کی بڑی بڑی جھیل سی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں لہرا گئیں اور وہ چپکے سے میرے سامنے سے ہٹ گئی اور مجھے ایسا لگا جیسے ہوا کا ایک خوش گوار اور خوشبو سے بھرپور معطر جھونکا مجھے چھو کر گزر گیا۔ میں دیر تک اس کے تصور میں کھویا رہا۔

اچانک ہی میرے سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ میں نے اسکرین پر نمبر دیکھا تو وہ عشاء کا تھا' نہ جانے کیوں میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

(باقی آئندہ)

[illegible]

محترم مدیر اعلیٰ نئے افق

آداب!

[illegible]

والسلام

[illegible]

[illegible] آزاد کشمیر

دن ڈھلتا جا رہا تھا۔ چڑیاں کبوتروں نے چھپ چھپ اپنے جالے تان رکھے تھے۔ پرندے ان جالوں سے بچتے بچاتے جلد از جلد اپنے گھونسلوں میں پہنچنے کے لیے بے تاب تھے۔ ہر سو شام کی اداسی کا پہرا تھا۔ زرد زرد ماحول نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا اور یہ ماحول یہ آوازیں اس کے دل میں عجیب سی کیفیت پیدا کر رہی تھیں۔

اندھیرے کے ساتھ ساتھ اس کی فکر بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ بہت دیر سے بے مقصد سڑکوں پر گھوم رہا تھا۔ چلتے چلتے تھک گیا تو وہیں فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔ شام ہو جانے کے باوجود بازار میں بہت بھیڑ لگی تھی۔ بچے عورتیں اور مرد خریداری میں اس طرح مصروف تھے جیسے یہی ان کا مقصد حیات ہو۔

اک وہی تھا جو سب کو خالی خالی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ مگر کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ ہر کوئی اپنی ذات میں گم تھا' دنیا کے کاموں میں مصروف و مشغول تھا۔ ہر کسی کے نزدیک اپنی ہی ذات کی اہمیت تھی۔ وہ دیر تک سب دیکھتا رہا۔ پھر اس خیال سے کہ گھر میں ماں پریشان ہو رہی ہوگی۔ وہ اٹھا اور گھر کو چل دیا۔ گھر کی چوکھٹ پار کرنے کے بعد بھی اس کے احساسات وجذبات وہی تھے۔ بلکہ اس سے کہیں زیادہ پریشان کن ......!

شام کے گہرے سائے نے گھر کو بھی دھندلا دیا تھا۔ ماں نے اس سے کھانے کا پوچھا مگر اس نے انکار کر دیا اور چارپائی پر دراز ہو گیا۔ ماں جانتی تھی کہ وہ آج کل نوکری نہ ملنے کی وجہ سے پریشان ہے اور یہ پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ اس سے پہلے بھی متعدد بار وہ جب بھی انٹرویو کے لیے گھر سے گیا واپس اسی حالت میں ہوتی۔ وہ لمبے قد اور گندمی رنگت کا بیس اکیس سال کا گریجویٹ نوجوان تھا۔ اس کے والد کا انتقال اس وقت ہوا جب وہ صرف پانچ سال کا تھا۔ ماں نے محنت مزدوری کر کے اس کو تعلیم دلوائی اور ہر ماں کی طرح وہ بھی اپنے بیٹے کو اعلیٰ افسر بنا ہوا دیکھنا چاہتی تھی۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ بھی ان پڑھ ہزاروں ڈگری یافتہ نوجوانوں کی طرح دفتروں اور کارخانوں میں چکر لگانے لگا جو تعلیم حاصل ہی اچھے

مستقبل کے لیے کرتے تھے۔ مگر قسمت سے بڑھ کر اس ملک کے کرتا دھرتا حکمرانوں نے جیسے ان سب نوجوانوں کی قسمت کا فیصلہ اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ اعلیٰ تعلیم ہونے کے باوجود بھی اسے ہر جگہ سے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا۔ وہ کسی جگہ جب بھی انٹرویو دینے کے لیے جاتا تو اس کی فائل تمام تر کاغذات کے مکمل ہونے کے باوجود بھی نامکمل ہوتی کیونکہ اس میں سفارش کا ٹیگ یا رشوت کی رقم کا چیک نہیں ہوتا تھا۔

اس کے برعکس وہ دیکھتا تھا کہ میٹرک پاس لڑکیاں منٹوں میں مطلوبہ سیٹ حاصل کر لیتیں۔ ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ سجائے گلے میں دوپٹے ڈالے گریبان چاک کیے وہ کسی بھی طرح پیٹ کی بھوک اور خواہشات کی ہوس مٹانے کو بے تاب نظر آتیں۔ چاہے اس کا نتیجہ بعد میں پے در پے ابارشنوں کے چکر ہوتے یا کسی کونے کھدرے میں جنم دیتے ناجائز بچے کی صورت غربت اور مہنگائی کا چابک ان سے ہر طرح کا جائز ناجائز کام کروا رہا تھا۔ وہ اکثر ایسے لمحوں میں ان لڑکیوں کی جگہ خود کو رکھتا اور سوچتا کہ گر وہ ان کی جگہ ہوتا تو کیا وہ ان کے لیے خود کو نیلام ہونے دیتا اور جب دماغ کے کسی کونے سے یکبارگی "ہاں" کی آواز ابھرتی تو وہ جھرجھرا اٹھتا۔

"آہ یہ بے روزگاری۔"

رقم تو اس کے پاس زندگی کی بنیادی ضروریات کے لیے بھی نہیں تھی۔ بھلا رشوت کے لیے کہاں سے لاتا۔ ادھر ادھر کے چکر لگاتے اب تو اس کے جوتے بھی گھس چکے تھے۔ مگر ہائے قسمت کہیں شنوائی نہیں ہوئی۔ اس کی ماں کے پاس جو چھوٹے موٹے زیورات تھے وہ اچھے مستقبل کے خواب میں بیٹے کی پڑھائی پر خرچ ہو گئے۔ گھر میں سامان پہلے ہی برائے نام تھا۔ رہا سوال کسی موٹی آسامی کی سفارش کا تو غریب لوگوں کی جان پہچان تو جیسے اونچے مرتبے کے لوگوں سے ایسے ہی نہیں ہوتی اور اگر ہو بھی تو وہ اپنا اثر و رسوخ غریب لوگوں پر استعمال کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں اور بالفرض کبھی دیں تو اس پشت ضرور کوئی اپنا مطلب رکھا ہوتا ہے۔

وہ اپنے گھر میں بیٹھا اپنی سوچوں میں گم تھا۔ ہر سوال منہ پھاڑے کھڑا تھا اور وہ ان کے مکمل جوابات تلاشتے تلاشتے جیسے نیم پاگل سا ہوا جا رہا تھا۔ تو کیا یہی زندگی۔

"کیا تھا خدا کے پاس اگر ہمارے ہاتھ بھی تھوڑا اقتدار دے دیتا۔ اور کچھ نہیں تو یوں در بدر ذلیل تو نہ ہونا پڑتا۔" الجھنوں کے ناگ شکوہ بن کر اس کی زبان سے پھسل پڑے۔

اس نے نظر اٹھا کر دو کمروں پر مشتمل اپنے چھوٹے سے گھر کو دیکھا کہ جس میں الگ سے کوئی کچن نہیں تھا۔ گھر کے چھوٹے سے صحن میں چھوٹے چھوٹے گملوں میں خوب صورت پودے لگے ہوئے تھے۔ گھر چھوٹا مگر بہت صاف ستھرا تھا۔

ایک سوچ کے بعد دوسری سوچ ذہن میں جگہ لے لیتی۔ سوچوں کے زاویے بدلے اور ایک نیا رخ سامنے آیا۔ اگر نوکری نہ ملی تو وہ اپنی بہنوں کو اعلیٰ تعلیم کیسے دلا سکے گا۔ ان کی شادیوں کی ذمہ داری بھی اس پر تھی۔ مرتے دم تک پیٹ کا جہنم خوراک کا ایندھن مانگنے کو بے تاب تھا۔ اس کی ماں کی عمر بھی اب ایسی نہیں تھی کہ وہ زیادہ کام کر سکے اور وہ چاہتا بھی نہیں تھا کہ ماں اب سلائی کیا کرے۔ وہ خود ان کا سہارا بننا چاہتا تھا۔ مگر چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ ہم بہت کچھ جیسا چاہتے ہیں ویسا ہوتا نہیں ہے۔

کافی عرصہ یوں ہی گزر گیا۔ نوکری اس کے لیے مرغے کی ایک ٹانگ ثابت ہوئی۔ اب وہ خود بھی نوکری نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ایک دن دوران سفر اسے ایک بس ڈرائیور ملا۔ کافی دیر گپ شپ کے بعد ڈرائیور اس سے بہت متاثر نظر آیا اور اسے کنڈیکٹر رکھ لیا۔ خالی ہاتھوں کے لیے یہ کام بھی بہت تھا۔ پڑھے لکھے ہونے کے سبب تھوڑا بھی بہت تھا۔ اگرچہ اس کی تنخواہ مہنگائی کا مقابلہ تو نہیں کر سکتی تھی۔ مگر اب وہ مطمئن تھا کہ وہ خود کما رہا ہے۔ اتنی بری حالت میں بھی اس نے حرام رستے کا نہ سوچا۔ جیسے بھی تھا اس کو اب محنت مشقت کا جو بھی اٹھانا پڑتا تھا۔

نیت صاف ہو تو خدا رستے خود صاف کر دیتا ہے۔ مشکل حالات بھی بندے کی آزمائش ہوتے ہیں۔ کچھ ان آزمائشوں میں ثابت قدم رہتے ہیں اور کچھ بھٹک کر خدا کی نعمتوں سے دور تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ چھ ماہ اس کی زندگی میں محنت کے وہ ماہ تھے جن میں اس نے جان توڑ کر کام کیا۔ پھر اس نے اپنے مالک سے بات کر کے ایک ویگن قسطوں پر لے لی اور خود چلانے لگا۔ دن میں تین چکر لگاتا اور رات گئے گھر واپس آتا۔ گھر کے مالی حالات میں بھی بہتری نظر آئی اور گھر والوں کے چہروں پر سکون بھی۔ چند برس گزرے تو مہنگائی کا بھوت غریبوں کے ساتھ ساتھ امیروں کے سروں پر بھی منڈلانے لگا۔ اس عرصے میں اس نے اس حد تک بچت ضرور کر لی تھی کہ اپنی ویگن لے لی اور چھوٹے موٹے قرضے اتار کر وہ خود کو بادشاہ محسوس کرنے لگا۔

دنیا میں "نظر لگنے" کو بہت مانا جاتا ہے۔ وہ بھی اپنے آگے کے حالات کو اپنی بدقسمتی سے زیادہ اب "نظر" کا شاخسانہ سمجھتا ہے۔

یہ ایک خوب صورت سرد صبح کا قصہ ہے۔ رات وہ کافی دیر سے گھر لوٹا تھا۔ پنڈی میں ایک سیاسی خاتون لیڈر پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے سارے ملک کے حالات تشویش ناک ہو گئے تھے۔ رات بھی ہر جگہ نہ کے برابر لوگ تھے۔ بہت مشکل سے وہ جان بچاتا بچاتا گھر پہنچا تھا۔ حالات کو سنانا اپنا خون ہی جلانے کے برابر تھا۔

وہ گھر سے نکلا تو ہر جگہ پہیہ جام ہڑتال تھی۔ اس نے اپنے کنڈیکٹر سے مشورہ کیا تو وہ بولا۔

"لالا ایک چکر لگا لینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ ہم چھوٹا چکر لگا لیں گے۔" اس نے بات مان لی اور ہڑتال کے باوجود گاڑی چلائی۔

واپسی پر جب وہ اپنے گھر سے تھوڑی دور تھا تو لوگوں کے ایک ہجوم نے اس کی گاڑی کو گھیر لیا۔ اس کی ہزار منتوں کے باوجود انہوں نے گاڑی کو دل ٹھنڈا کر کے توڑا اور تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔ نعرے لگاتے اور احتجاج کرتے ہوئے آگے نکل گئے۔

مرنے والی تو مر گئی مگر ساتھ میں ہزاروں گھروں کے چراغ بجھا گئی۔ چند سال پہلے اپنی محنت پر بھروسہ کرنے والا آج اسی محنت کی کمائی میں جل رہا تھا اور اس کا کنڈیکٹر اس جلتی گاڑی کے پاس کھڑا آنسو بہا رہا تھا۔

خالی دامن

بھائی عمران احمد!
آداب!
حوصلہ افزائی کا شکریہ! آپ کی سرپرستی اور خلوص ہی مجھ جیسی نئی لکھنے والیوں کا حوصلہ بڑھاتا ہے۔ میری ایک اور کہانی کے ساتھ حاضر ہوں۔ اللہ تعالیٰ سورۃ رحمٰن میں فرماتا ہے "اور تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے" لیکن انسان کی بارہا جو اس کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتا بلکہ ہمیشہ شکوہ ہی کرتا رہتا ہے۔ بس اس کہانی کا بنیادی خیال یہی ہے امید ہے ضرور آپ کے معیار پر پوری اترے گی۔

ماریہ جبیں دارا
لاہور

"اریبہ ڈیئر تم جن لڑکیوں کا رونا رو رہی ہو ان کا زمانہ ہونے والا ہے بہت جلد کوئی تمہاری مانگ میں افشاں بھرنے کے لیے بارات سجا کر آنے والا ہے۔"
"تو یہ کیا خواب ہے۔"
"جناب یہ خواب نہیں ہے آج میں آفس گئی تو محترم عاقب صاحب اسی لڑکی کی طرح بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی تو محترم خلا میں گھورنے لگے وہ تمہارا ہی سوچ رہے ہوں گے اور فرمانے لگے کہ تمہیں پتا ہے کیا ہوا ہے میری کوئی بات نہیں سنی۔ تمہیں پتا ہے کہ میں اپنی تایا کے بیٹی کی بات کر رہی ہوں میں نے سوچا دل میں ضرور کالا بھنورا اپنا ہی ہو گا سب ہی ہے کہ آنکھیں یوں تو وحشت زدوں کی ہوتی ہیں مگر اپنے عاقب صاحب وحشت زدہ ہو نہیں سکتے میں نے انہیں کریدا اور میرے بار بار اصرار پر بیچارے شرما شرما کر کہنے لگے کہ جی آپ وعدہ کریں کسی سے ذکر نہیں کریں گی میں نے کہا عاقب صاحب بولیں! تو پھر یوں گویا ہوئے وہ دراصل آپ کی دوست اریبہ جی مجھے بہت اچھی لگتی ہیں میں نے امی سے بات کی تھی ہم ان کے گھر جانا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں اریبہ جی سے بات کرنی تھی پر ہمت نہیں ہوئی پلیز آپ میری مدد کریں۔ عاقب ریحان کے اریبہ جی کہنے پر میں نے بڑی مشکلوں سے ہنسی روکی اور پھر ان کے شرمانے کی اداکاری انہوں نے تو لڑکیوں کو بھی مات دے دی ہے۔ ویسے یار بچے مجنوں لگ رہے تھے تمہارے عاقب صاحب۔"
"ثوبی ایک تو میں تم سے بڑی تنگ ہوں چھوٹی سی بات کو پوری تفصیل سمیت بیان کرتی ہو یار کسی کے پاس اتنا وقت نہیں ہے مختصر بات کیا کرو اور سنو مجھے یہ عاقب وہ کوئی پسند نہیں ہے۔ پلیز آئندہ ذکر نہ کرنا۔"
"کیسے؟ وہ ایسا کیا نہیں ہے کوئی تمہارے لیے دیدہ و دل فرش راہ کیے بیٹھا ہے اور تم اسے دیکھ رہی ہو ... کوئی اور ہوتا تو وہ دل فرش راہ کرتا پر یہ تمہاری قسمت۔"
"چھوڑو ایسی کیسی مجبوری ہو میں عاقب سے کہہ دوں گی وہ تمہاری طرف رجوع فرمائیں۔"
"تم نہ سمجھو کہ دس سیکنڈ جاؤ اس چیز کو میری طرف رجوع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے میں کسی سیکنڈ چوائس نہیں بننا چاہتی۔ ویسے بھی میں نے تو اپنے حق کی بات کی ہے اور سوچو تو تم کسی کے گھر کی زینت بنو۔ جس طرح چاند ہو گا آخر کیا قصہ ہے اور جاننا چاہتی ہوں۔"
"کیونکہ تم جانتی ہو کہ مجھے یہ سب کچھ پسند نہیں ہے اور زندگی مجھے کسی پر یقین ہے۔ یہ سب وقتی باتیں ہیں کون کسی کی خاطر مرتا ہے سب وقت گزاری کے قصے ہیں لوگوں کو تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے اپنی تمہاری انگلی کو پکڑ کر سب باتیں کیوں نہیں کرتی ہو تم۔"

"بس یار میرا جھگڑا کرنے کا کوئی موڈ نہیں ہے کہ تم سے کل کی بات ہو گی۔" اس نے سیل آف کر دیا۔

اریبہ اس کی بہت اچھی دوست تھی دونوں ایک جان دو قالب تھیں وہ شوخ و چنچل اور ذہانت کی پتلی تھی بہت ہنگامہ برپا کرنے والی زندگی انجوائے کرنے والی اور اریبہ اس کے بالکل برعکس سنجیدہ اور گمبھیر تھی اور ہر بات میں اس کی ایک ہی سوچ ہوتی جو ان کے دل میں بیٹھ گئی تھی کہ کوئی اس سے محبت نہیں کرتا اگر کوئی کرتا بھی ہے تو اس سے محبت کا اظہار کرتی تو وہ سمجھتی کہ یہ سب کوئی مطلب کی بات ہے۔ یہاں تک کہ اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے حوالے سے بھی وہ انتہائی کا اظہار کرتی کہ اس سے کسی کو بھی محبت نہیں ہے۔ ثوبیہ اسے بہت سمجھاتی لیکن وہ اسی سوچ کے ساتھ اپنی زندگی گزار رہی تھی۔

☆☆☆

ہمیشہ کی طرح اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی وہ سب سے چھپا کر ایک نگاہ گھر کی طرف دیکھ رہی تھی۔
"ہوم ورک کام ہو رہا ہے۔ باہر موسم کیسے آفت ہو رہا ہے۔ بادلوں کے ٹکڑے ایک دوسرے سے اٹکھیلیاں کرتے پھر رہے ہیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ بارش برسنے کو ہے اور تم ہو کہ ایسے موسم میں کون کام کرتا ہے۔ چلو ذرا باہر چلتے ہیں گرما گرم سموسے کھاتے ہیں اور سنو وہ تمہارے عاقب صاحب آئے ہوئے ہیں ان سے بھی مل لو۔"
"ثوبی پلیز تم جاؤ مجھے یہ ڈسٹربنس پسند نہیں ہے اور یہ بھی سب دل کا موسم ہوتا ہے جو انسان کو بھاتا ہے ورنہ تو یہ موسم کچھ بھی نہیں ہوتا۔"
"یہ تو سب جانتے ہیں کہ تم انتہائی بور ہو اور تمہارے اندر خوشی محسوس کرنے والی کوئی حس نہیں ہے۔ تم آج تک اپنے آپ کو ان خول میں ڈالے رکھتی ہو حالانکہ اللہ نے تمہیں ہر چیز سے نوازا ہے۔ کیا آج تک تمہیں کوئی ایسا لمحہ ملا ہے جس کے لیے تم نے اللہ کا شکر ادا کیا ہو۔ مجھے اس سے بہت گلہ ہے اور یہ سارے کام اور چلو موسم کو انجوائے کرتے ہیں۔ اللہ نے گرم موسم میں یہ ٹھنڈی ہواؤں کا تحفہ دیا ہے۔"

"تو ہم اللہ کی ناشکری کیوں کریں۔ سنا نہیں تم نے کہ — تم میری کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔"
"اگر ہم نے اس موسم گرما کے دوران اللہ تعالیٰ کی ان ٹھنڈی ہواؤں اور بادلوں کے تحفے سے فائدہ نہ اٹھایا تو اللہ ہم سے ناراض ہو گا اور دوبارہ سورج نکل کر اس کی آب و تاب سے ہمیں جلائے گا۔ سو چلو موسم انجوائے کرتے ہیں۔ زندگی کے جو لمحے ہماری گرفت میں ہیں ان سے ہمیں پورا انصاف کرنا چاہیے۔"
"ثوبی ڈیئر تم اسے زندگی کہتی ہو۔ یہ زندگی تو نہیں ہے بلکہ جان ہے میرے لیے۔ کبھی کبھی تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس مہذب سوسائٹی کو چھوڑ کر جنگل کی راہ لوں۔ ہر کوئی مفاد پرست ہے دولت اور حسن کا پجاری کسی کو کسی سے محبت نہیں والدین کو اولاد سے اولاد کو والدین سے دوستوں سے بہن کو بھائی سے بہن سے بھائی کو بہن سے رشتہ داروں کو اپنے رشتہ داروں سے کوئی کسی کا نہیں جب نفسا نفسی کا عالم ہو سب غرض کے بندے ہیں۔"
"شٹ اپ یار تم ہمیشہ ہی ایسی باتیں کرتی ہو حالانکہ میں جانتی ہوں انکل آنٹی تمہیں اور بھائی تمہیں بہت چاہتے ہیں۔ پھر تمہارا ایاز اور محمد ایاز سمیت سب تم سے محبت کرتے ہیں یہاں تک کہ اس اظہار کے باوجود ہم سب تم سے بغیر کسی مفاد کے محبت کرتے ہیں۔ پتہ نہیں تمہیں یقین کیوں نہیں آتا کہ تم خود کسی سے مخلص نہیں ہو۔ اس لیے ہر ایک کے اخلاص کو شک کی نظر سے دیکھتی ہو تم ناشکری ہو جو سب کی محبتوں سے منہ موڑ کر خود ساختہ بے حسی میں مبتلا ہو جاتی ہو۔ اچھا سنو اللہ کا بغیر کسی مفاد کے انسان سے محبت ہے اسی نے یہ زندگی عطا کی ہے اس لیے اس زندگی کی قدر کرو ناشکری اللہ کو سخت ناپسند ہے۔ لہٰذا انسانوں میں رہ کر انسانوں کی طرح جینا سیکھو۔"
"ثوبی اللہ کو بھی تو اپنی اطاعت کے لیے بندے کی ضرورت تھی کہ وہ دنیا میں رہ کر دنیا کی رنگینیوں میں کھو کر

ہے۔ پھر میری فضیلت کی پیروی کرتا ہے۔ بندے کو جنت کی طلب ہوتی ہے اس لیے وہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے اور اللہ بندے کی اطاعت قبول کرتا ہے اور اسے جنت عطا کرتا ہے ہر اک کے ساتھ "طلب" کی وجہ ہے۔"

"اُف اللہ! یار پلیز کافرانہ جملے مت بولو۔ اللہ کی اطاعت کے لیے فرشتے کم نہیں تھے۔ صرف محبت کی وجہ سے کائنات تخلیق ہوئی۔ اللہ کو اپنے نبی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت تھی تو صرف ایک بندے کی محبت کے لیے "کن فیکون" کہہ کر کائنات تخلیق کر دی اور بندے نے اللہ سے بے پناہ محبت کو عشق کی انتہا پہ پہنچایا۔ صرف اللہ کے عشق میں [illegible] کے تم سے [illegible] کا [illegible] نے [illegible] کی محبت پر [illegible] کیا بلکہ اس کی محبت میں [illegible] استقامت [illegible] کو قائم رکھا۔ ہم اس محبت کے پیکر کی اطاعت کرنے والے ہیں۔ پلیز اپنے یہ دوہے اور تکبر [illegible] تمہیں اس [illegible] کی سزا [illegible] ہے کہ [illegible] جیسے [illegible]"

"ٹھیک؟"

"میں عاقب کو بلاؤں گی۔"

"کیا؟"

"جی جناب۔"

"اُف ثوبی تم جیسی پاگل لڑکی سے خدا بچائے۔"

"ارے عاقب صاحب آپ بھی موسم انجوائے کر رہے ہیں یا ہمارا انتظار ہو رہا تھا" اس نے "ہمارا" پر زور دیتے ہوئے کہا تو عاقب نے اسے [illegible] نگاہوں سے گھورا۔

"ارے آپ کی آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں اور کمزور بھی لگ رہے ہیں۔ کیا رتجگے منانے جا رہے ہیں یا تارے گنتے رہے ہیں۔" وہ ان کا [illegible]

"تمہیں مس [illegible] کیا تو کوئی بات نہیں۔ [illegible] مطالعہ کر رہا تھا۔"

"کس کا؟"

"جی۔" وہ کنفیوز ہو گیا۔

"ارے وہ دیکھو عمرا آرہی ہے تم جنت شادی کے بعد اب آئی ہے۔ ہم تمہیں تعبیرہ میں ذرا گیٹ پہ ہی اس سے وہ باتیں کرتی ہوں۔ تمہارے سامنے تو ہماری دال نہیں گلتی اور ویسے عاقب صاحب [illegible] سے فائدہ ضرور اٹھائیے گا۔ آپ بھی کیا یاد کریں گے کس سخی سے پالا پڑا ہے۔"

"ارے عمرا کی بچی تمہاری وجہ [illegible] اور تم شادی کے بعد [illegible] دونوں [illegible]"

"اس نے گیٹ پر ہی عمرا کو جا پکڑا۔"

"ارے میری جان [illegible] ہو اور وہ تو [illegible] تمہیں ہم سے [illegible]"

"ارے اے ثوبی [illegible] جو تم نے میرے شوہر نامدار کی شان میں گستاخی کی۔ [illegible] شرم کرو۔"

"جناب ہم تو [illegible]"

"اچھا یہ کہاں سے [illegible] گزار رہی ہو۔"

"میرا اصل پوچھا نہیں اور پیا کہاں ہے؟ کی رٹ لگا دی ہے۔"

"اچھا یار تم دونوں مجھے عزیز ہو مگر یار تم سے ذرا سی زیادہ عزیز ہے۔ اس لیے [illegible] مت ہو [illegible] کے لیے سر کھپا رہی ہوں۔ چلو یہی کے کمرے میں چلو۔"

"اس کمرے سے [illegible] کرائی ہوں۔ سامنے پارک میں بیٹھی ہے چلو۔ پارک میں چلتے ہیں۔"

☆☆☆

چھٹی کے وقت جب وہ اس کی گاڑی میں بیٹھی تو اس نے کہا۔ "عاقب سے کیا کہا؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"بعض اوقات خاموشی کی بھی ایک اپنی زبان ہوتی ہے۔ دراصل خاموشی کی زبان سے زیادہ [illegible] ہے۔ ویسے محبت کا [illegible] ترین اظہار خاموشی ہی سے ممکن ہے محبت کرنے والوں کی یہ آفاقی زبان ہے خاموشی کے مقابلے میں تمام

زبانوں کی فصاحت و بلاغت پھیکی ہے۔"

"ارے واہ آج تو تم بڑی ادبی گفتگو کر رہی ہو۔"

"اس بار بھی کئی ادب ہونے کو جی چاہتا ہے۔"

"بہرحال میری بات پر غور کرو۔ مجھے اور تمہیں تب لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ لیکن تم چالاک ہو کر مجھے بس [illegible] آتی ہے سو [illegible] عاقب بیرس [illegible] کی [illegible] ہیں۔ پلیز اس کا [illegible] کر لو تم [illegible] ایک بندے کو تو شاد کرو۔ تم کب تک [illegible] کی [illegible] کرتی رہو گی۔"

"مجھے ڈسٹرب مت کرو پلیز۔ مجھے عاقب سے ہمدردی ہے۔ اور بس۔"

"اچھا تمہیں عاقب پر ترس آتا ہے۔ اچھی نشانی ہے ویسے بھی ہمدردی محبت میں بدل جاتی ہے۔"

☆☆☆

"مس [illegible] آج کل کہاں گم ہے؟ کئی دنوں سے ملاقات نہیں ہو رہی۔" شکیل صاحب نے پوچھا۔

"ارے آپ کو نہیں پتا؟ آج کل دارالامان کے بارے میں [illegible] کر رہی ہے اسی سلسلے میں وہ گھر سے ہی مختلف جگہوں پر چلی جاتی ہے۔ آفس آ ہی نہیں رہی۔"

"ویسے مس ثوبیہ کے [illegible] نہیں ہے۔"

"سچ کہہ رہے ہیں آپ۔ وہ ہر وقت [illegible] رکھتی ہے۔"

"ارے کس کے بارے میں باتیں ہو رہی ہیں۔" وہ [illegible] ہوئی۔

"شیطان کا نام لیا اور شیطان حاضر ہو گیا۔"

"جی نہیں میں شیطان تو ہو سکتی ہوں مگر شیطان نہیں۔"

"آپ کہاں گم تھیں میں سوچ رہا تھا کہ آپ کی [illegible] میں [illegible] دوں۔"

"تو [illegible] شکیل صاحب آپ نے [illegible] تھا تو اب میں آ گئی ہوں اس لیے [illegible] کی رقم

میرے حوالے کریں۔"

"یار تم فارغ ہو اس فیلڈ ورک نے تو مجھے تھکا دیا ہے۔ اُف ہمارے اردگرد بیٹھے والے انسانیت کی [illegible] سے ہی گر چکے ہیں۔ کس قدر ظالم چہرے ہیں [illegible] ان لوگوں نے [illegible] ہے کہ [illegible] کر [illegible] ہوں۔"

"[illegible] ہو رہی ہو کیا ہوا؟"

"یار اس فیچر نے تو مجھے ذہنی طور پر مفلوج کر کے رکھ دیا ہے [illegible] کس [illegible] کرے۔ ہمارے ملک میں کتنے ہی دارالامان ہیں۔ ان میں [illegible] تو واقعی بے سہاروں کے لیے پناہ گاہ ہیں مگر کچھ پناہ گاہوں کے نام کو بدنام کر رہے ہیں۔ یہاں عورتوں کو تحفظ نہیں دیا جاتا بلکہ عورتوں کی نیلامی کا گھناؤنا کاروبار ہوتا ہے۔ آشیانہ سرفہرست ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہو ثوبی! یہ تو مجبور اور بے سہارا عورتوں کی پناہ گاہیں ہیں اور آشیانہ تو ایک سیاسی لیڈر اور سوشل ورکر چلا رہی ہے۔"

"ہوں! پناہ گاہیں؟ یہاں مجبوریوں کا سودا کیا جاتا ہے۔ یہ پناہ گاہیں نہیں ہیں بلکہ شرافت کے لبادے والوں نے لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے اس تہذیب یافتہ سوسائٹی میں پناہ گاہوں کے نام سے قحبہ خانے کھول رکھے ہیں۔ یہ [illegible] چال ہے جس میں گھروں سے بھاگنے والی لڑکیاں اور بے سہارا لڑکیاں قید کر دی جاتی ہیں اور پھر انہیں [illegible] کر کے بھی [illegible] جاتا ہے۔ [illegible] شرفا اور سوشل ورکرز نے [illegible] یہ کاروبار چلا رکھا ہے اور [illegible] لوگوں کی [illegible] کھینچتے ہیں۔ کاش! میں انہیں اپنے ہاتھوں سے شوٹ کر سکتی۔"

"[illegible] ثوبی! [illegible] ہم اس معاشرے کو نہیں بدل سکتے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ ان پناہ گاہوں بلکہ قحبہ خانوں سے لڑکیوں نے نکلنے کی کوشش نہیں کی؟"

"یار یہ پاگل لڑکیاں بھی محبت کے [illegible] تو کبھی فلموں میں کام کرنے کے شوق میں مبتلا ہو کر بھی مغرب کی

چوری میں آزادی نسواں کی خواہش میں گھر کی دہلیز پار کرکے خود ہی اپنے در بند کرگئی ہیں۔ پھر کس منہ سے دوبارہ والدین کی دہلیز پر قدم رکھیں۔ اسی لیے مرا انجمن رہی ہیں۔ البتہ جانے کے بعد لڑکیوں نے یہاں سے نکلنے کی کوشش کی تھی مگر انہیں زمین نگل گئی یا آسمان کچھ پتا نہیں چلا کہ وہ فرار ہوتے ہوئے ماری گئی تھیں۔

یار ان لڑکیوں کا اندراج وغیرہ تو ہوا ہوگا۔ باقی لڑکیوں نے ان کے لیے کچھ نہیں کیا۔

"ارے چھوڑو بھئی موت کے کھیلے داروں سے بھی کسی نے پوچھا ہے اور ڈر کے مارے باقی لڑکیوں نے خاموشی اختیار کرلی۔"

"تمہیں یہ سب معلومات کہاں سے ملیں؟"

"ایسے باضمیر لوگوں سے جو انسانیت اخلاق اور عزت کی دھجیاں بکھرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے مگر ان درندوں کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ موت کے ڈر کی وجہ سے اپنے نام صیغہ راز میں رکھنے کو کہا ہے۔"

"تو بھی جب تمہارا فیچر شائع ہوگا ایک طرف تو تمہیں لوگ سراہیں گے مگر شرافت کے علمبردار تمہیں زک پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ پلیز اس فیچر کو شائع مت کرانا۔"

"ارے دو ماہ کی محنت اور تحقیق کے بعد میں نے فیچر تیار کیا ہے اور اس ڈر سے کہ وہ لوگ مجھے نقصان پہنچائیں گے۔ شائع نہ کروں تو غلط… یہ فیچر شائع ہوگا ہم سچ اور حق کے علمبردار ہیں اور اللہ کا شکر ہے کہ جس ادارے سے ہم منسلک ہیں انہوں نے بھی سچ کا سودا نہیں کیا۔ ناصر صاحب بہت خوش ہیں کیونکہ معاشرے کے رستے ناسوروں کو بے نقاب کرنا ہمارے قلم کا ایمان ہے۔ یہ فیچر ان لڑکیوں کے لیے ہے جو سنہرے وعدوں کے جال میں … اپنی خواہشوں کی تکمیل کی خاطر والدین کی دہلیز پار کرلیتی ہیں اور … سمجھتے ہوئے … اگر کسی ایک لڑکی نے بھی اس فیچر سے عبرت حاصل کی تو جانو میرے قلم کا حق ادا ہوگیا۔ ناصر صاحب نے کہا ہے کہ پھر چینل پر بھی لائیو کاسٹ کریں گے۔"

"اچھا سوچا تم کچھ کہہ رہی تھیں۔"

"ہاں وہ میں کہہ رہی تھی کہ تم نے اتنا کام کیا ہے تمہاری تھکاوٹ دور کی جائے کھانے پینے چلو گی؟"

"نیکی اور پوچھ پوچھ پیسے ہیں آج سورج کہاں سے نکلا ہے۔ یقین نہیں آرہا کہ تم اور قرض؟"

"چلو ہے تو چلو باتیں مت بناؤ۔"

کینٹین میں داخل ہوتے ہوئے اس نے پوچھا "وہی چھکا لگانے میں یا ہوا ہے؟"

"آج تمہارے رنگ … ہیں …"

"میری طرف کیا غور سے دیکھ رہی ہو؟"

"یہ نکھری نکھری رنگت اور آنکھوں کی چمک یہ لبوں پہ مسکان تیرا چہرہ کہہ رہا ہے تیرے یار کا افسانہ اس نے محفل جماتے ہوئے کہا۔"

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"اچھا تم ہم سے ہی پردہ داری۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو یقین اور بے یقینی کے دوراہے سے گزر رہی ہوں کبھی عاقب کی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے یقین کرنے کو دل چاہتا ہے مگر دماغ نفی کرتا ہے کہ کوئی انسان سچا نہیں ہے۔ سب "مطلب" کی چاہ ہے۔ … ویسے عاقب اور اس کی امی ہمارے گھر آئے تھے۔"

"واہ بھئی وہ ہم سے بازی لے گیا سارے مرحلے طے ہوگئے۔"

"نہیں یار ایسی کوئی بات نہیں ویسے اس کی امی بڑی چالاک عورت ہیں … تھوڑی تھی اور جن نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔"

"کوئی بات نہیں ویسے … ساس محبت بھرے دلوں کے درمیان آہی جاتا ہے لیکن یہ شادی ہوئی اور ضرور ہوگی۔"

☆☆☆

"تو بھی تمہارے فیچر نے تو تہلکہ مچا دیا ہے۔"

"جی ہاں آج کل دھمکیوں سمیت مبارکباد کے فون وصول کررہی ہوں۔ تم سناؤ کہ تم رنگ رہی ہو خیریت ہے نا۔ دو چار دن تم سے ملاقات نہیں ہوئی اور تمہاری یہ کیفیت یہ حالت … عاقب … پہلیاں کیوں بجھا رہی ہو۔"

"تو بھی تم سدا کی پاگل ہو۔ وہ سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں … کی گرفت میں … آجاتی ہیں۔"

"نہیں یار عاقب ایسا نہیں ہے۔"

"یہ تمہاری بھول ہے تو بھی سب مردوں میں وفا نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ محترم اس دن کے بعد میرے پاس نہیں آئے اور ادھر امی بار بار پوچھ چکی ہیں کہ اس کی امی آئی تھیں تو آپ کیا ارادے ہیں۔ بتاؤ میں کیا کہوں۔ مجھے تو اس پر یقین تھا ہی نہیں مگر جب وہ امی کو لے کر آیا تو مجھے یقین کرنا پڑا کہ … انسان … نہیں ہے۔ خراب اس کی چپ نے کیا مجھے … اس نے مجھے …"

… سمجھایا کہا۔ "اور تم تو سچ جھوٹ پرکھنے کا دعوی کرتی رہتی ہو مگر عاطف سے دھوکا کھا لیا۔ ابھی تک تم عاطف کے اسرار میں ہو۔"

"جی نہیں وہ بھی میں جانتی تھی کہ عاطف … ہے اس کا کام ہی نت نئے چہروں سے دل بہلانا ہے مگر میں اس جذبے سے مجبور تھی جو عاطف کو دیکھ کر میرے دل میں پیدا ہوا اس لیے میں نے … کے ساتھ … گزارا … مرنے کی حیثیت رکھتا ہے … داستان … اس کی امی سے پوچھیں کہ انہوں نے اس حرکت کیوں کی ہے؟"

"چلو تو بھی ہم ہی خود داری اور انا کو داؤ پر مت لگاؤ۔ مجھے پہلے ہی بہت شرمندگی ہے۔"

"تو کرو … ایک بار کے میں اس سے کیسے

بات کرتی ہوں۔"

☆☆☆

"کئی دنوں سے مجھے آپ کی کال کی تھی آپ تو آ ہی نہیں رہے۔"

"دراصل میں گاؤں گیا ہوا تھا۔"

"خیریت؟"

"ہاں بس خیریت ہی تھی۔"

"تو آپ صاحب مجھے آپ سے بات کرنی ہے بیا کے سلسلے میں۔"

"کہیے میں ہمہ تن گوش ہوں۔"

"کیا آپ بیا سے مخلص دل کی گہرائیوں سے پیار کرتے ہیں یا واقعی اسے اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔"

"آپ ایسی باتیں کیوں کر رہی ہیں دراصل میں اسی سلسلے میں گاؤں گیا تھا ابا جی اور امی کو جاب کرنے والی لڑکیاں پسند نہیں ہیں اور آپ جانتی ہیں کہ والد کی وفات کے بعد میں ہی اپنی بہنوں کو سپورٹ کر رہا ہوں۔ اس لیے میں امی کو ناراض اور دکھی نہیں کرنا چاہتا۔ میں پوری کوشش کر رہا ہوں اور مجھے امید ہے کہ امی مان جائیں گی آپ بیا کو بتا دیں کچھ عرصہ انتظار کریں۔ انشاء اللہ بہت بہتر ہوگا پلیز آپ بھی دعا کریں۔"

"ارے میری تو نیک دعائیں آپ دونوں کے ساتھ ہیں۔"

"ثوبی! تم ایک ماہ کی چھٹی پر جا رہی ہو۔ بیا … کا خیال کرو ہمارا رکھنا … کے بیان۔"

"ہوں" اس نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا "ثوبی … دیکھنا میری زندگی کی اولین تمنا ہے … پوری ہو رہی ہے تو بس انجوائے کرنے کے لیے تمہارے پاس کچھ نہیں کروں گی۔ سنو تم میرے پیچھے پیچھے شادی مت رچا لینا۔"

☆☆☆

"بیا میں کل رات پاکستان پہنچی ہوں اور اب تمہاری طرف آ رہی ہوں گھر ہی رہنا ہوگے۔"

"آپی بیٹھو ذرا نوید" اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سر ہانے چھیڑا۔

"ہائے تم ہو ہڈیوں کا ڈھانچہ… یہ اجڑی مانگ ویران چہرہ کبھی کبھی تمہیں ایک مہینے میں تمہیں کیا ہو گیا۔"

"کچھ بھی تو نہیں زندہ ہوں۔ تمہارے سامنے ہوں۔"

"اسی کو تو زندگی کہتے ہیں۔ کیسی ہو میرے اور بیا تو نہیں ہو گئیں۔"

"یہ دونوں بچھڑا۔"

"چلو اٹھو فوراً تیار ہو جاؤ آج تمہاری برتھ ڈے ہے لونگ ڈرائیو پر چلتے ہیں پھر تم مجھے K.F.C میں ٹریٹ دینا۔"

"پلیز ثوبی میرا دل نہیں چاہ رہا۔"

"اف بیا مرحوم ذرا اور ہاں تم نے یہ حال کیسا کیا۔"

"میں ثوبی ہی نہیں چاہتا کچھ کرنے کو۔"

"وہ تو ہمارے … مزاج ہوں تیں۔"

"ثوبی بیٹی تم کب آئی ہو بیٹی اسے سمجھاؤ زندگی سے دور ہوتی جا رہی ہے" بیا کی امی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"پتا نہیں کیا روگ لگا لیا ہے نہ کپڑے پہننے کا ہوش ہے نہ کھانا پینا یاد رہتا ہے نہ بہنوں سے نہ بھائی سے کوئی بات چیت ہنسی مذاق … ہم سب بہت پریشان ہیں اس کے لیے آج کل … آ رہے ہیں یہ کپڑے بدلے بغیر … ہیں اور … لڑکے تو تیز طرار شوخ چنچل لڑکیاں پسند کرتے ہیں۔ ویران چہرے اجڑی مانگ … کو کون پسند کرتا ہے؟ یہی تو عمر ہے شادی کی اگر یہ عمر گزر گئی تو کوئی پوچھنے والا بھی نہیں ہوگا۔ میں تو اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئی ہوں۔"

"امی پلیز آپ … میں ٹھیک تو ہوں۔"

"آنٹی آپ فکر نہ کریں میں اسے ابھی ٹھیک کرتی ہوں۔"

"ہاں جی اب بتاؤ کیا معاملہ ہے زندگی سے اتنی بے زاری کیوں؟ اور سناؤ عاقب کا کیا حال چال ہے؟"

"مت نام لو اس فراڈی شخص کا اب اس کے نام سے کراہت آتی ہے۔" وہ پھٹ پڑی۔

"ارے بیا اس بے چارے نے کیا بگاڑا ہے تمہارا اور زندگی جیسی خوب صورت نعمت کی ناشکری کر رہی ہو۔ محض ایک شخص کی خاطر سب کو پریشان کر رکھا ہے بہت فضول ہو۔"

"پلیز مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ دیکھو ہمیں سب کی محبتیں … دکھ دیا جب اللہ کو کوئی بندہ … محبت نہیں ہے تو لوگ چھوڑ جاتے ہیں۔ اگر اللہ کو مجھ سے محبت ہوتی تو…؟"

"بیا! تم اتنی بدگمان ہو آج میں تمہیں آئینہ دکھاؤں گی۔ بیا تم نے بدگمانی اور بے یقینی کا خود ساختہ خول چڑھا رکھا ہے … تمہاری خود پرستی ہے تم اپنے آپ کو … کی توجہ حاصل کرتی ہو اگر تمہیں واقعی محبتوں کا یقین نہ ہو تو عاقب کے گریز کو تم محسوس نہ کرتیں اس کا مطلب ہے کہ تمہیں عاقب پر یقین تھا اس کی چاہت تمہارے دل میں بھی موجزن تھی۔ صرف بات یہ ہے کہ تم ناشکری ہو … حال میں خوش رہنا نہیں چاہتی … اپنے آپ کو … کیونکہ تم … کہ ہمیں تو اللہ سے … محبت نہیں … محض نماز روزے کا ڈھونگ رچا کر … یہ کہتی ہو کہ تم بڑی اطاعت گزار ہو مگر۔"

"شٹ اپ ثوبی جسٹ شٹ اپ۔" وہ ایک دم سے چیخ پڑی۔

"نہیں بیا آج مجھے بولنے دو۔ جو لوگ واقعی دکھی ہوتے ہیں وہ دکھوں کو چھپا کر جینے کا سلیقہ سیکھتے ہیں۔ وہ ہر ایک دکھ اور غم پریشانی کو اللہ کی آزمائش سمجھتے ہوئے ہر وقت رونا نہیں روتے بلکہ صبر سے برداشت کرتے ہیں۔ وہ تمہاری طرح خود ساختہ دکھوں اور غموں کی نمائش نہیں کرتے وہ اپنے لبوں پر قہقہے سجائے رکھتے ہیں تاکہ لوگ ان کے اندر جھانک ہی نہ سکیں لیکن تم تو لوگوں کی ہمدردیاں بٹورتی ہو اور اس سے تمہاری انا کی تسکین ہوتی ہے بیا تم کتنے سالوں سے میرے ساتھ ہو کیا جانتی ہو میرے بارے میں؟"

"تم تو ثوبی ہو میری آپی اب سب کی محبتیں حاصل ہیں تمہیں مخلصوں کی جان ہو تم اس لیے تمہارے لبوں پر مسکراہٹ سجی ہوتی ہے کہ نفرت اور غم کے بادل تمہیں چھو کر نہیں گزرے۔"

"ہاں بیا میں لوگوں کی نظر میں بڑی خوش قسمت ہوں مگر آج میں تمہارے سامنے اپنے کئی راز منکشف کروں گی۔ دراصل میں نے تو اپنے دکھوں اور غموں کو دل کے نہاں خانوں میں چھپا رکھا تھا۔ تم نہیں جانتی کہ میں محبت کو ترستی رہی ہوں۔ گورنس کی گود میں پرورش پانے والی وہ معصوم لڑکی ماں کی گود کے لیے ترستی رہی ہے مگر ماں جو اپنے اندر بے پناہ چاشنی اور محبت لیے ہوئے ہے۔ … اٹینڈ کرنے میں مصروف رہی میرا بچپن تو … گزرا ہے۔ … یہ ہماری ایلیٹ سوسائٹی کا المیہ ہے جہاں ہر چیز پیسے کے ترازو میں تولی جاتی ہے یہاں تک کہ محبت اور رشتے بھی جب کبھی میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر پاپا سے طلب کی چاہ میں ان کے کمرے میں جاتی تو پاپا کہتے ثوبی بیٹے پیسے چاہئیں اور چیک کاٹ دیتے اور میں وہ بے جان چیک بے جان ہاتھوں میں تھام کر چلی آتی۔ یہی رویہ ممی کا ہوتا اور بھیا کو اپنے مشاغل سے فرصت نہیں تھی۔ ہم ایک ہی چھت تلے رہتے ہوئے بھی اور خونی تعلق ہونے کے باوجود اجنبی اور انجان بن کر رہے ہیں اور پھر میں نے جینا سیکھ لیا مگر … غم چہرے پر جھلکنے نہ دیا۔ خود ہی ٹوٹتی بکھرتی اور پھر خود ہی اپنے آپ کو سمیٹ کر دنیا کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جاتی۔ میں نے اردگرد کے لوگوں میں محبتیں تلاش کیں۔ کسی نے میری امارت سے فائدہ

اظہار کسی نے میری شوخی و شرارت سے میں محبتوں کو ترسی ہوئی ان جھوٹی محبتوں پر یقین کرتی رہی۔ تم عاطف کی بات کرتی ہو میں مانتی ہوں کہ اسے مجھ سے محبت نہیں ہے مگر مجھے اس سے محبت تھی میں نے اس کے ساتھ کافی وقت گزارا۔ اس کی جھوٹی باتوں پر یقین کیا' کیونکہ وہ میری زندگی کی اولین خواہش تھی اولین اور آخری چاہت اور جب وہ میری زندگی سے نکل گیا تو میں نے اسے روکنے کی بجائے اس کی رضا پر راضی ہوگئی یہ سوچ کر کہ اللہ جو بہتر ہو وہ ہی کرتا ہے ہر انسان سے زیادہ محبت کرتا ہے اسی میں میری بھلائی ہوگی۔ میں نے اللہ کی دی ہوئی اس زندگی کو عذاب ہرگز نہیں سمجھا بلکہ اس کی قدر کی ہے اس کے بعد میرے اندر کی شوخی کی فراوانی بے پناہ اور خلوص۔ وہ میرا … جتنے مسکراتے چہروں کی عادی ہے روتے ہوئے چہرے پسند نہیں کرتی۔ مجھے دیکھو میرے دونوں ہاتھ خالی ہیں پھر بھی میں خوش ہوں لیکن اس تکمیل زندگی گزار رہی ہوں۔ اس بات پر اپنا اتفاقی شکر گزار ہوں کہ اگر مجھے کسی چیز کی کمی رہ گئی ہے تو ہوسکتا ہے اس میں میری ہی کوئی کوتاہی ہو اور سوچو یا محبت انسان کو زندہ نہیں رہنا ہے بلکہ لاوارث ہے۔ بلکہ تم بھی اس محبت کو روگ مت بناؤ محبت روگ نہیں ہے بلکہ معرفت الٰہی کا ذریعہ ہے جو لوگ محبت کی خاطر وفا کو جو کر لیتے ہیں یا راہوں کو تلاش کر کے اپنی دنیا بسا لیتے ہیں وہ محبت نہیں کرتے ان کی محبت کی ہوتی ہے منزل پانے کی خواہش۔ اگر عاقب کی ماں نہیں مانی ہوں تو وہ بے ماں کی سچی کو چھوڑ کر تمہیں اپنا لے۔ اگر وہ ماں کو ناراض کر کے تمہیں اپنا لے تو میرے نزدیک وہ شخص تم سے بھی محبت کا دعویٰ نہیں کرسکتا جو خونی رشتوں کو محبت کے نام پر چھوڑ دے۔ وہ کیسے مخلص ہوسکتا ہے اس جیسا تو خود غرض دنیا میں نہ ہوگا اس لیے بلکہ بیٹا وفاشناس اور یہ بھی کہ اس خود ساختہ خول کو توڑو تم سے سب محبت کرتے ہیں اور ماں باپ کی محبت تو بغیر کسی غرض کے آتی ہے کسی طرح شفاف ہوتی ہے۔ سب کو پریشان مت کرو۔ اف

یار بول بول کے میرا حلق خشک ہوگیا ہے پلیز کچھ پلاؤ ورنہ میں فوت ہوجاؤں گی۔

"اوکے ڈونٹ یو آر ویری گریٹ۔" اس نے پل میں تولہ اور پل میں ماشہ ہونے والی اپنی اس دوست کو دیکھا جو دنیا سے اپنی محبتیں وصول کرنے کا ہنر جانتی تھی۔

☆☆☆

"عاقب صاحب مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی آپ لوگ اس قدر بزدل بھی ہیں کہ"

"کس بات پر تم اتنی بہتر لوگوں کو میری طرف کیوں؟ آتش فشاں بنی ہوئی ہیں آپ کیا ہوا؟"

"آپ جیسے کم ظرف انسان اور گھٹیا لوگ ہی آتش فشاں بنا دیتے ہیں ہمارے جیسوں کو آپ نے میری دوست کی بھی ہے بے وقوف بنانے کے لیے۔ اس کی زندگی تباہ کر دی آپ نے آپ کی وجہ سے اس نے جاب چھوڑ دی وہ صبر کا ایک مکمل تصویر بن گئی ہے۔"

"تم کچھ بے مطلب کی باتیں کہاں اور باتیں کس کے لیے؟"

"اف بہت برا کیا آپ نے اب آپ خود ساختہ مجبوریوں کا رونا رو رہے ہیں۔ ایسی باتیں تھیں آپ سے لوگ اپنی ماں سے پوچھ کر محبت کیا کریں۔ محبت خود غرض ہے آپ لوگ محض چند لمحوں کو حسین بنانے کی خاطر جھوٹی انا کی تسکین کے لیے معصوم لڑکیوں کی زندگی داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ میں آپ کو ان لوگوں سے الگ سمجھتی تھی مگر آپ تو ان سے بھی دو ہاتھ آگے نکلے۔ اگر میری دوست جو آپ کی محبت میں تاریک راہوں کی مسافر بن رہی ہے بچھتا ہو تو میں آپ کو معاف نہیں کروں گی۔ زندگی بھر یاد رکھنا آپ کا برا حال ہوگا۔"

"مس قوسیہ آپ ایسے سوچ رہی ہیں آپ نے تو الزامات کی بوچھاڑ کر دی ہے۔ میری بھی تو سنیں۔"

"کیا سنوں آپ کی؟ بزدلانہ لوگوں کی طرح اپنی خود ساختہ مجبوریوں کا رونا روئیں گے۔"

"تمہیں کس نے کہا کہ یہ بات نہیں میں نے چند دن پہلے بتا دیا ہے کہ عاقب نے مجھ سے محبت کا اظہار کیا ہے۔ میں نے اسے بتا دیا ہے کہ میں دل و جان سے … ہے میری چاہت میں احترام اور عقیدت کا جذبہ ہے۔ میں نے اپنے لفظوں کو سمجھایا نہیں کے لیے زندگی اس کے ساتھ وابستہ نہیں ہے اور جب تک یہ جان نہ جاؤں کہ وہ اپنے چند لمحوں کو یہاں تک پہنچا دے میرے خاموش جذبوں نے آپ کے ذریعے اس تک رسائی حاصل کی ہے مجھے اس سے محبت ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ مگر میں اس کو کھو کر کسی اور کو نہیں چاہوں گی یا نہیں چاہتا۔ میری ہی بات کو تم بھی جانو کہ ہماری تقدیر میں وہ مقام حاصل نہیں کر پائے گی جو ایک من چاہی ہوا کا مقام ہوتا ہے۔ اس میں ہم سب کی بہتری پوشیدہ ہے۔ میں نے اپنے اردگرد لوگوں کا ہجوم بھی دیکھا ہے۔ محبتوں کو نفرتوں میں بدلتے دیکھا ہے۔ اس میں نے فیصلہ کیا کہ اس سے شادی نہیں کروں گا میں اپنی محبت کو نفرت میں بدلتے نہیں دیکھنا چاہتا ہو سکتا ہے کہ میں اس کی محبت کی خاطر اس سے زیادتی کر بیٹھوں اس کی محبت میں آ کر اس کی طرفداری کر بیٹھوں دونوں صورتوں میں خسارہ میرا ہوگا۔ یہ میری اولین محبت ہے وہ ہمیشہ ایک اچھی یاد کی طرح میرے دل میں رہے گی۔ تو موسموں اور وقت کے تھپیڑے اس پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتے۔"

"کیا آپ شادی نہیں کریں گے؟"

"ہم مشرقی لوگ جانتے ہیں کہ ہم کس قدر روایتی معاشرے میں رہتے ہوئے اس کے تقاضے پورے کرتے چلے آتے ہیں۔ میری بھی شادی ہو جائے گی محبت ایک بار ہو کے کافی ہے۔ محبت کا ہو وہ بہت ہوتا ہے۔ ایک کی محبت دل میں … دوسری محبت کا جذبہ جنم لے بن جاتی ہے۔ آپ … کو سمجھا دیں کسی اچھے شخص سے شادی کر لیں۔"

"کیا یہ آسان کام ہے عاقب صاحب ہم لڑکیاں جب کسی جذبے کی اسیر ہوتی ہیں تو اس جذبے کے پورا ہوتے ہی ایک گھر کے خواب بننا شروع کر دیتی ہیں۔ یہ نہیں کہ دوسری روح کو کسی اور کی جستجو رہے اور ہمارے ہاتھوں میں کسی اور کے نام کی مہندی رچ جائے یہ جذبے ہمارے لیے ہی ہمیں لے ڈوبتے ہیں آپ پلیز ایک بار کوشش کریں اور اپنے فیصلے پر نظرثانی کریں۔"

"سوری مس قوسیہ مجھے یہ دوراہا نہیں لگتا ہے میں اپنی امی اور بہنوں کی مرضی کے بغیر مرضی نہیں کر سکتا جو ہوئی کامیاب رہتی ہے تو میں ہر اس چیز کو حاصل ہوسکتا ہوں جو چاہی ہو کے ساتھ جو خوشی بھی ہو … ہے۔ یوں میں اپنی محبت کو پامال نہیں کرنا چاہتا کہ کبھی مجھے پچھتاوے کا احساس ہو۔ میں نے چاہا ہے یہی محبت کی ہے اور یہی محبت شادی کی خاطر … نہیں یہ ہمیشہ میرے دل میں رہے گی۔ بچھڑنے کی تڑپ میں تمام عمر محسوس کرنا چاہتا ہوں۔ میری محبت بچھڑ کر امر ہوجائے گی۔ یوں بھی محبت قربانی کا نام ہے ایک کو پانے کے لیے میں باقی لوگوں کو جنہوں نے مجھے اس مقام پر پہنچایا کو دے پامال کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

"اوکے عاقب میں آپ کے جذبے کی قدر کرتی ہوں۔"

☆☆☆

"جا رہی ہوں یہاں سے جا رہی ہوں۔"

"کہاں؟"

"خوابوں کے شہر میں۔"

"کیوں؟"

"ہاں یار ملنا اب ہو جاتے ہیں کہ میں ان کے ساتھ رہوں اور ہاں سنو یار اور میرا یقین کرو کہ سب تم سے محبت کرتے ہیں۔ یہ تو ہوئی کہ عاقب نے بالکل ٹھیک کیا کہ وہ تمہیں اچھی یاد کی طرح دل کے نہاں خانوں میں رکھنا چاہتا ہے اور یاد محبت ملاپ کا نام تو نہیں محبت تو قربانی کا نام ہے۔ مرمٹنے کا نام ہے۔ کاش کوئی مجھے بھی اس طرح یاد رکھتا۔ تم یہ چھوڑو۔ اب اللہ کی ناشکری کرنا چھوڑ دو اس بات پر یقین رکھو کہ اللہ جو بھی کرتا ہے ہمارے لیے بہتر کرتا ہے کیونکہ ہم کچھ نہیں جانتے مگر وہ سب کچھ جانتا

ہے اور کسی دوسرے شخص سے شادی کر لینا۔"

☆☆☆

ماہ و سال بیت گئے۔ بالوں میں سفیدی آ گئی چہرہ جھریوں زدہ ہو گیا۔ آج وہ ان میں کھوئی سسک رہی تھیں اور وہ سوچ رہی تھی اس نے ہمیشہ ناشکری کی اور خود اپنے ہاتھوں سب کچھ کھو دیا اور وہ جو کبھی تہی دامن تھی؟ اس نے ایک بار پھر تصویر کو اٹھا کر دیکھا آج خوشیوں اور محبتوں کی خوشبو میں بسی ہوئی تھی۔ وہ دونوں مسکرا رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی اور ہونٹوں پر دل آویز مسکان۔ جیسے کہہ رہی ہو دیکھو میں کبھی محبت کے پیچھے بھاگا کرتی تھی اور آج محبت میرے پیچھے بھاگ رہی ہے اس نے کانپتے ہاتھوں سے خط اور ایک بار پھر اپنی شادی کی تصویر تکتی رہی ہوں کیا یہ پیار ہے یا مجھے یہ ہوا جاتا ہے تا کہ میں تصور بھی نہیں کر سکتی۔ مجھے بھی اس سے محبت ہو گئی۔ ہاں یار ہم محبت تو ہر ایک سے کر سکتے ہیں مگر عشق تو ایک ہی بندے سے ہوتا ہے۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ میں نے زندگی میں صرف ایک ہی شخص سے عشق کیا ہے اور اس کا نام عاطف ہے۔ تم اپنی نوازشوں کی وجہ سے مجھے اچھے لگتے ہو اور بس۔ جانتی ہو اس نے کیا کہا۔ بولا میں تمہیں جانتا ہوں اور میرے نزدیک یہی بات کافی ہے اگر تم خوشی سے میری چاہت قبول کرتی ہو تو میں اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھوں گا اور پھر میں نے اس کی چاہت محبت کے ساتھ قبول کر لی ہے۔ انکل اور آنٹی شہروز سے بھی بڑھ کر مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ دیکھو میں جو کبھی محبت کی بھوکی تھی' تہی دامن تھی آج محبتوں کی پھوار میں نہا رہی ہوں میرے دونوں ہاتھ جو کبھی خالی تھے آج محبتوں کو سمیٹتے سمیٹتے تھک جاتے ہیں۔ دیا آئی ایم سوری فار یو میرے رب کا شکر ہے کہ میں نے کبھی اس کی ناشکری نہ کی اس نے جس حال میں رکھا اس کا سجدہ شکر بجا لائی۔ میرا رب ستر ماؤں سے بڑھ کر مجھ سے محبت کرتا ہے وہ کیسے اپنی شکر بجا لانے والی بندی کو فراموش کر دیتا۔ مجھے لگتا ہے دیا عزیز تم آج بھی یونہی روٹھی ہوئی دنیا سے خفا سب سے بدگمان ہو۔ میرے کی دعا کا جواب تمہیں دیتی ہوں کہ میں عید اور نعمتوں تمہارا کلا ہو جاتا ہے۔ میں نے تمہیں کہا تھا کہ جو لوگ اللہ کی رضا میں خوش رہتے ہیں وہ محبتیں حاصل کرتے اور پھر جانتے ہیں وہ کبھی تنہا نہیں رہتے اور دیکھو میں آج تنہا نہیں ہوں۔ بس میں اور وہ جلد تمہارے پاس ہوں گے اور کیے ہیں خیال رکھنا تمہاری ثوبی۔"

"ہاں ثوبی تم نے سچ کہا تھا میں نے ہمیشہ رب کی ناشکری کی۔ اس لیے میں نے سب کچھ خود کھو دیا آج صرف پچھتاوے ہیں' کتنے ہی ہاتھ میری طرف بڑھے اور میں نے بدگمانی کی رو میں سب کو جھٹک دیا تم ٹھیک کہتی تھیں کہ میں اپنے آپ سے مخلص نہیں ہوں دوستو اس لیے تو میں یہاں سب سے دور تنہائی کی آگ میں جل رہی ہوں۔ بیمار ہوں تو کوئی دو گھونٹ پانی پلانے والا بھی نہیں۔ کبھی میرے گرد بھی محبتوں کی پھوار برسا کرتی تھی مگر میں نے ہمیشہ ناشکری کی' بیزاری اور بدگمانی کو اختیار کیا یہاں تک کہ سب نے مجھ سے کنارہ کر لیا۔ کسی حال میں خوش نہ رہی تم چھوٹی تک تمہیں خالی دامن تھیں مگر تمہیں دنیا سے محبتیں حاصل کرنے کا ہنر آتا تھا تم ناشکری نہیں تھیں اس لیے رب نے آج تمہاری جھولی بھر دی ہے اور میں جس کے دامن میں ہر ایک نے محبتوں کے پھول ڈالے وہ شخص اپنی ناشکری اور حماقت و بدگمانی کی بدولت خالی ہاتھ رہ گئی ہوں یا پھر مجھے دنیا سے اپنا حصہ وصول کرنے کا ہنر ہی نہیں آیا۔ آج صرف پچھتاوے کے آنسو ہیں کہ یہ تنہائی کی آگ ہے جو سب سے آخر کو جلا رہی ہے۔ تنہائیاں کاٹنے کو دوڑتی ہیں۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور آج دل کی آگ بجھتی جا رہی تھی۔ ذہن و دل میں ایک آواز گونج رہی تھی۔

"اور تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔"

عزیزم عمران احمد قریشی!
السلام علیکم!
امید ہے مزاج بخیر ہوگا' روانہ سی ہونا کہ کہانی ارسال کر رہا ہوں۔ [illegible]

والسلام
[illegible]

''غفور نے باپ کو گھر سے نکال دیا۔''

صبح کے ناشتے پر یہ سنسنی خیز خبر اڑی۔ بات یوں کہ متوسط گھرانے کی تھی' شام تک پہنچتے پہنچتے ادھر سے ادھر پورے محلے میں سفر کر گئی۔ بعد میں پتا چلا کہ اس افسوس ناک خبر کا محرک' منبع و مرکز تائی نوراں ہے۔ تائی نوراں محلے کا ٹیپ تھی۔ بچوں کے پیچھے میں مگر دم خم اب بھی قائم تھا۔ بات کرنے کا ڈھنگ اور طریقہ رکھتی تھی۔ ایسی ایسی ہوش ربا خبریں جمع کر رکھتی تھی کہ سننے والا دم بخود رہ جاتا تھا۔ بات کتنی معمولی کیوں نہ ہو لیکن تائی نوراں کا انداز بیان یہ اتنی تیز ترین خبر دیتی تھی کہ سامع کا تجسس سوا ہو جاتا۔ محلے کی کوئی بات اس سے پوشیدہ نہیں تھی' شادی ہو یا ولیمہ' غم ہو یا خوشی کی کوئی تقریب' اطلاع تو لیبوں کی طرح موقع پر پہنچ جاتی تھی۔ ان موقعوں پر اس کی موجودگی عجیب سا تاثر چھوڑتی۔ بوڑھی عورتوں کے ابرو تن جاتے۔ بہار رسیدہ آنکھیں چمک اٹھتیں اور بچے کھل کھلا کر اس کے گرد حلقہ بنا لیتے۔ محلے کے کسی فرد کو کوئی خبر یا معلومات مطلوب ہوتی تو تائی نوراں سے رجوع کیا جاتا۔ اس وقت تائی کی شان اور وقار دیدنی ہوتا۔ وہ ناک پر انگلی لگا کر کہتی ''مجھ سے کیا چھپا ہوا ہے۔'' یوں یہ اس کا تکیہ کلام بھی تھا۔

غفور درجہ چہارم کا ملازم تھا۔ چار بچوں کا اس کے سر پر بار تھا۔ معمولی تنخواہ اور اوپر سے بوڑھے ماں باپ کا بوجھ' ان سب چیزوں نے اس کا معاشی توازن خراب کر رکھا تھا۔ مگر بہت سعادت مند اور برخوردار مزاج کا آدمی تھا۔ محلے کے ہر آدمی سے صاحب سلامت تھی۔ والدین کی خدمت کرتا' بچوں سے پیار اور بیوی سے کچھ واجبی سا تعلق تھا۔ جسے نہ نفرت کا نام دیا جا سکتا تھا اور نہ محبت' بس وضع داری نبھائے جا رہا تھا۔ اصل میں غفور بے چارے کا اس میں کوئی قصور نہ تھا۔ سات برس کی عمر میں اس کی شادی ہوئی۔ دلہن کی عمر اس وقت کوئی سولہ برس تھی۔ اس بے جوڑ شادی پر رشتہ داروں نے اس کے والد کو بہت سمجھایا' اہل محلہ نے بھی باز رکھنے کی بہت کوشش کی' مگر اس کے والد نے کسی کی نہیں سنی'

کہتا تھا۔ جب گھر میں شہنائی بجے گی اور چاند سی دلہن کے قہقہے آنگن میں گونجیں گے تو میری عمر دوگنا ہو جائے گی۔

غفورے کی شادی پر اس نے دل کی ساری حسرتیں پوری کیں۔ بڑے چاؤ سے بہو گھر لایا۔ اس کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو گیا۔ مدتوں پس انداز کی ہوئی رقم اپنے بیٹے کی شادی پر اڑا دی۔ محلے والوں نے بہت سمجھایا میاں ہاتھ روک لو' کچھ کفایت کرو لیکن وہ غفورے کی محبت میں پاگل ہوا جا رہا تھا۔ اس کے پاس ایک ہی جواب تھا۔ بڑے ارمانوں سے آج کا دن نصیب ہوا ہے۔ میں سارے ارمان نکالوں گا۔ لوگ خاموش ہو گئے۔ کچھ قیافہ شناس اور جہاں دیدہ تبصرہ کرتے کہ میاں بیوی کی عمروں کا یہ تفاوت کسی دن بوڑھا سید ویران کرے گا۔ ان کا قیافہ اور تبصرہ کچھ غیر واضح مبنی بھی نہ تھا۔ گلستان کو غفورے سے محبت تو تھی ہی بہو کی راہ میں بھی آنکھیں بچھا لیتا۔ اس کی ہر خواہش پر سر جھکا لیتا اور بیٹے بھی سسر کو شکایت کا موقع نہیں دیتی تھی۔ محلے میں سسر بہو کی محبت مثال بن گئی۔ جوان لڑکیاں بیٹے کی خوش گوار زندگی پر رشک کرتیں۔ اسے خوش نما زرق برق لباس میں دیکھ کے ان کی پلکوں کے چراغ جل اٹھتے۔

غفورے نے جب چودہویں برس میں قدم رکھا تو بیٹے کے سر پر ایک سفید بال لہرانے لگا۔ یعنی محفل پر رنگ آیا تو چراغ کی لو مدھم پڑنے لگی۔ کبھی کبھی غفورے کے جوان بیٹے سے گفتگی آہ برآمد ہوتی اور دل میں کانٹا سا چبھتا مگر گھر کا نظم ونسق پوری طرح اس کے ہاتھ کی گرفت میں تھا۔ اس کی بوڑھی آنکھوں میں تدبر' فراست اور زمانے کا وسیع تجربہ تھا۔ سرکش جوانی' عمر رسیدہ بڑھاپے کے سامنے بے بس تھی۔ اس لیے گھر کے ماحول میں کبھی ابال نہیں آیا۔ چھ افراد پر مشتمل خاندان میانہ روی اور کسی حد تک خوش و خرم زندگی بسر کر رہا تھا۔ اب غفورے کے بچے بھی تھے۔ زندگی رواں دواں تھی کہ اچانک تائی نوراں نے دھاوا کر کے گھر کا سناٹا شکست کر دیا۔ محلے کا ہر شخص مبہوت' گم اور سراسیمہ تھا۔ جانے کیا آسیب داخل ہوا جس نے پرسکون زندگی کو شل کر دیا اور گھر کا سارا نظام درہم برہم کر دیا۔ میں اس پر جتنا سوچتا اور الجھ جاتا۔ ذہن کا سرا نہیں مل رہا تھا۔ آخر ایک دن [illegible] تائی نوراں کو بلایا اور یہ الجھن ان کے سامنے رکھتے ہوئے مغموم لہجے میں کہا۔ تائی' اس گھر کی تباہی پر میرا دل کڑھتا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کیا کیا جائے۔

"پر تیرے پیٹ میں کیوں مروڑ اٹھ رہے ہیں۔" وہ تیوری چڑھا کر بولی۔

"ایک شریف کا گھر اجڑ گیا ہے۔ انسانی ہمدردی کا......"

"میں کیا کروں؟" اس نے میری بات اچک لی۔

"دیکھ تائی تو جانتی ہے کہ غفورے سے میرا کوئی رشتہ نہیں۔ مگر ایک رشتہ ایسا اٹوٹ ہے جس سے ہر آدمی دوسرے سے مربوط اور بندھا ہوا ہے۔ انسانیت کا لازوال رشتہ۔ محلے کا ہر آدمی تجھے عزت اور تکریم کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ سارے لوگ تیری قدر کرتے ہیں تو اگر ذرا سی کوشش کرے تو باپ بیٹے میں صلح صفائی ہو سکتی ہے۔ ایک خاندان کی آبادی اور عزت کا مسئلہ درپیش ہے۔"

"مگر مصالحت نہیں ہو سکتی۔"

"کیسے ہو سکتی ہے اگر تو......" میں نے اصرار کیا۔

"میں کہتی ہوں نہیں ہو سکتی' زندگی بھر نہیں ہو سکتی۔" وہ میز پر مکا رسید کرتے بولی۔

"مگر کیوں؟" میرے لہجے میں سر بسر استفہام اور احتجاج تھا۔

"بات ہی کچھ ایسی ہے رے۔" اس کا لہجہ بدستور اکھڑا ہوا تھا۔

"نہ تو تو کچھ بتاتی ہے اور نہ مصالحت پر آمادہ ہے۔ اتنی کٹھور دل نہ بن تائی۔" میں نے دست بستہ ہو کے پھر التجا کی۔

تائی آنکھ بند کر کے گہری سوچ میں ڈوب گئی اور تادیر چپ سادھ لی۔

"کیا سوچنے لگی ہو تائی۔" اس کا انہماک ٹوٹ گیا۔

"میں تمہیں بتاتی ہوں۔" اس نے ادھر ادھر دیکھ کر انتہائی سنجیدگی سے کہا۔ "تجھے شاید معلوم نہیں جس روز غفورے نے باپ کو گھر سے نکالا اس شام وہ ساتھ والے گاؤں گیا تھا۔ رات پچھلے پہر گھر لوٹا اور اسی روز صبح اس نے باپ کو گھر سے نکال دیا۔ اب سمجھا۔" وہ بیزاری سے بولی۔

"تمہاری کوئی بات میرے پلے نہیں پڑی۔ کھل کر بات کرو پہیلی نہ بجھواؤ۔"

"تیری عقل شاید چرنے گئی ہے۔" وہ برافروختہ ہو گئی۔ "چودھراں جماعت کیا پاس کیا کہ خود کو افلاطون کا چچا سمجھتا ہے۔ اتنی سی بات تیری عقل میں نہیں سماتی اور اتراتا تو ایسے ہے جیسے عقل کے گھوڑے پر سوار ہے۔ ان کتابوں کو چولہے میں ڈال دے۔" اس نے میز پر رکھی ہوئی کتابوں کی طرف اشارہ کیا۔

"تائی' تو تو کوسنے دینے لگی' تیری زمانہ ساز بصیرت کے سامنے میری کیا حیثیت ہے۔"

"مجھے مسکا لگاتا ہے۔" وہ زہر خند لہجے میں بولی۔

"نہیں نہیں' میری کیا مجال ہے۔ بعد میں چاہے جتنے طعنے دینا پہلے بات تو بتا۔" میری نرمی سے اس کی درشتی میں کمی آ گئی۔

"کان قریب کر۔" اس نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ میں اس کے قریب جھک گیا۔ اس نے آہستگی سے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"کیا! سسر نے ....؟نہیں!" میں چیخ پڑا۔

"ہاں! اب اپنے ہونٹ سی لے اور ان سفید بالوں کا کچھ لحاظ کرنا۔" اس نے تنبیہ کی۔

"میرے خدا۔" میں سر تھام کر رہ گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے زمین پھٹ گئی ہو۔

"یہ بات سینے میں اتار دے۔" اس نے اٹھتے ہوئے دوبارہ انتباہ کیا۔

قاتل مجرم

محترم بھائی عمران احمد قریشی،
السلام علیکم!
امید اور تفتیشی کہانی حاضر ہے۔ آپ نے جس طرح میری رہنمائی اور سرپرستی کی اس کے لیے میں شکر گزار ہوں۔ آپ کے تعاون اور سرپرستی نے ہی مجھے لکھنے کا حوصلہ دیا آپ کی معرفت میں ان تمام قارئین کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے میری تحریروں کو پذیرائی بخشی۔ ان شاء اللہ میں آئندہ بھی اپنے قارئین کو مایوس نہیں کروں گا۔

آپ کا اپنا
ریاض بٹ
حسن ابدال

میں نے اپنی پہلی تفتیشی کہانی میں اس بات کا ذکر کیا تھا کہ میں آپ کو نہیں بتاؤں گا کہ میں نے کب کب کس کس تھانے میں تھانیدار کی حیثیت سے ڈیوٹی انجام دی تھی۔ صرف تفتیشی کہانیاں سناؤں گا۔ آج بھی میں اس بات پر قائم ہوں اور یہ میری مجبوری ہے لیکن ایک حقیقت تو اپنی جگہ اٹل ہے کہ میں تمام برسوں ایک تھانے میں تو رہا نہیں تھا یہ میری اور شوکی اور باقی ٹیم کے ساتھ آخری تفتیش تھی۔

وہ ایک خوشگوار صبح تھی۔ گرمیوں کا آخری پرندہ بھی اڑ چکا تھا۔ ہلکا ہلکا جاڑا شروع ہو چکا تھا۔ ہمیں اطلاع ملی کہ پیر شریعت والی سرکار کو رات کسی نے بڑی بے دردی سے قتل کر دیا ہے۔ اطلاع پیر کا ایک مرید لے کر آیا تھا۔ ہم نے ضروری تیاری کے بعد مرید کو ساتھ لیا اور پیر کے ڈیرے کی طرف روانہ ہو گئے۔

میرے ساتھ سپاہی اللہ دتہ اور سلطان گوندل تھے۔

پیر کا ڈیرا شہر کے بڑے قبرستان کے پاس تھا۔

یہ مکان یا ڈیرا تقریباً پانچ مرلے میں تھا۔ دو کمرے اور ایک حجرہ تھا۔

صحن میں ایک آم کا درخت بھی تھا۔ جو کافی گھنا تھا۔ جو مرید اطلاع لے کر ہمارے پاس آیا تھا اس سے ہم نے ابتدائی باتیں پوچھ لی تھیں اس مرید کا نام فضل دین تھا اور فضلو کہلاتا تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ رات کو میں اور سائیں اس ڈیرے پر ہوتے ہیں۔

مجھے کل شام پیر صاحب نے ایک کام سے کسی دوسرے شہر بھیجا تھا۔ آج صبح منہ اندھیرے میں آیا تو حجرے کے ساتھ والے کمرے کی طرف بڑھا۔ ارادہ یہ تھا کہ کچھ دیر آرام کروں گا اس وقت تک پیر صاحب بھی جاگ جائیں گے۔ ایک بات پر میں حیران تھا کہ آج صحن کی بتی کیوں بند ہے لیکن ابھی میں صورت حال جاننے کے لیے سوئچ بورڈ کی طرف بڑھا ہی تھا کہ کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ میں جلدی سے اٹھا۔ میری جیب میں ماچس موجود تھی۔ میں نے دیا سلائی جلا کر دیکھا اور اچھل پڑا یہ تو سائیں تھا۔ اس کا سر پھٹا ہوا تھا اور پھٹے ہوئے سر سے خون نکل رہا تھا۔ میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ مگر میرے ذہن نے ساتھ دیا۔

ہوش کرو، جلدی سے اس کا خون بند کرو۔ وہ...... اس دوران میں پانچ چھ دیا سلائیاں جلا چکا تھا۔

دیا سلائی جلا کر ہی میں نے صحن میں لگے بلب کا سوئچ آن کیا۔ شکر ہے صرف سوئچ ہی بند تھا یا کیا گیا تھا۔

اب ہر چیز واضح تھی۔ میں نے پہلے کمرے سے صاف کپڑا لا کر سائیں کے سر سے بہتا ہوا خون صاف کیا اور پھر کس کر کپڑے کی پٹی بنا کر اس کے سر پہ باندھ دی۔

اب پیر صاحب کو صورت حال بتانا ضروری ہو گیا تھا۔

میں نے تیز قدموں سے حجرے کے دروازے پر دستک دی لیکن دروازہ میرے ہاتھ کے دباؤ کے ساتھ ہی کھل گیا۔ اندر بلب جل رہا تھا اور پیر صاحب چت پڑے تھے۔ وہ اپنے ہی خون میں لت پت تھے۔

❁ ❁ ❁

اور اس وقت ہم دیکھ رہے تھے کہ پیر صاحب کو کلہاڑی کے وار کر کے بڑی بے دردی سے قتل کیا گیا ہے۔ تقریباً دس زخم میں نے انگلیوں پر گنے۔ ہم نے ضروری کارروائی کر کے لاش کو تھانے پہنچا دیا۔ ڈیرے کے صحن کو پہلا تھا۔ کمرے اٹھانے کا کام بھی سپاہی اللہ دتہ نے مکمل کر لیا تھا۔ میں نے فضل دین کو ساتھ لے لیا تھا۔ اسے فی الحال ایک علیحدہ کمرے میں بٹھا دیا اور ایک سپاہی کو اس کی نگرانی پر مامور کر دیا۔

یہاں دو باتوں کی وضاحت کر دوں کہ سائیں اس وقت اسپتال میں تھا۔ اسپتال ڈیرے سے قریب ہی تھا۔ فضل دین نے سائیں کو اپنے کاندھے پر لاد کر وہاں پہنچایا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ پہلے تھانے جاؤ۔

اس نے تھانے تو آنا ہی تھا۔ کیونکہ پیر قتل ہو گیا تھا۔

دوسری بات جس پر آپ کو بھی حیرانی ہو رہی ہوگی کہ اگر پیر قتل ہو جائے تو ان کے ڈیروں پر ایک جم غفیر لگا ہوتا ہے لیکن یہاں معاملہ الٹ تھا۔ دراصل یہ پیر اور اس کے یہ چیلے (میں ان کو چیلے ہی کہتا ہوں) ابھی چند دن پہلے ہی یہاں آئے تھے اور یہ ڈیرا کرایہ پر لیا تھا۔ باقی تفصیل آگے آئے گی۔

لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا کر ابھی میں اپنے کمرے میں آیا ہی تھا کہ شوکی بھی آ گیا۔ اس کی یہ عادت تھی کہ وہ ہر صبح تھانے میں آتا تھا۔ سلام دعا کرنے میرے کمرے میں آ جاتا تھا۔

جب اسے واردات کے متعلق بتایا تو اس نے کہا۔

"اب کیا پروگرام ہے سر......؟"

"میرا ارادہ یا پروگرام تو اس اسپتال میں جانے کا ہے جہاں سائیں داخل ہے۔" میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے سر میں چائے اور انڈوں کا کہہ آیا ہوں۔ ان سے دو دو ہاتھ کر کے چلتے ہیں۔" شوکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

لیکن ہمیں اسپتال جانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اس کے بدلے یہ اطلاع آ گئی کہ سائیں بے ہوشی کی حالت میں چل بسا ہے۔ اب یہ دوہرے قتل کی واردات بن گئی تھی۔

بہرحال سائیں کی لاش بھی پوسٹ مارٹم کے لیے کے پاس پہنچا دی گئی۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹیں اگلے دن آنی تھیں۔ اس دوران ہم نے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا نہیں تھا۔ ہم نے فضل دین کو بلایا۔ فضل دین مضبوط ہاتھ پیر کا ایک قبول صورت بندہ تھا۔ عمر کا اندازہ میں نے چالیس سال کے قریب لگایا۔

"ہاں بھئی فضل دین اب سچ بولو۔" شوکی نے

اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"سرکار! میں نے پہلے بھی سچ ہی بولا تھا۔" اس نے ہاتھ باندھ دیے۔

"یہ بندوں کی طرح ہاتھ نہ باندھو۔ اصل بات بتا دو۔ ورنہ الٹا لٹکا کر نیچے مرچوں کی دھونی دی جائے گی۔" میں نے خونخوار لہجے میں کہا۔

وہ باقاعدہ رونے لگ گیا۔ ہم نے اس کے آنسوؤں پر توجہ نہیں دی تھی۔ اس لیے شوکی نے اسے ڈپٹ کر کہا۔

"شروع ہو جاؤ۔"

اور وہ شروع ہو گیا۔ اس نے جو کہانی سنائی وہ اس طرح ہے۔

پیارے لعل عرف پیر صاحب، فضل دین اور سائیں اس سے پہلے پچاس میل دور ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ گاؤں کا نام میں ظاہر نہیں کروں گا۔ وہاں مریدوں کی کمی نہیں تھی۔ یہ دو مرید دن رات پیر صاحب کے ساتھ رہتے تھے۔ وہاں پر پیر صاحب، پیر شربت والی سرکار کے نام سے مشہور تھے۔ دراصل پیر صاحب چٹکی دم کر کے دیتے تھے اور سائل گھر جا کر اسے پانی میں حل کر کے شربت بناتے تھے اور فیض حاصل کرتے تھے۔ جب لوگ کمزور عقیدے کے ہوں گے تو شربت والی سرکار جیسے پیروں کی چاندی تو ہوگی۔ سب کام ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ اچانک ایک ایسی بات ہو گئی جس نے پیر صاحب کے پاؤں اکھاڑ دیے۔

ایک عورت پیر صاحب کے پاس آئی اور بتایا کہ اس کا زیور گم ہو گیا ہے۔ حساب لگا کر بتائیں کہ زیور کون لے گیا ہے۔ عورت خوب صورت تھی۔ پیر صاحب نے حساب لگا کر کچھ اشارے بتائے جو ایک عورت پر فٹ آ گئے۔ جس کا زیور گم ہوا تھا وہ عورت ان کے گھر آئی تھی۔ اپنی چالاکی سے پیر صاحب نے اس عورت کا حلیہ معلوم کر لیا تھا۔ جس عورت کا زیور گم ہوا تھا۔ اس کو پتا بھی نہیں چلا کہ پیر صاحب نے کیا چکر چلایا ہے؟ بہرحال اس چکر نے پیر کو چکر میں پھنسا دیا۔ دراصل جب اس عورت نے (جس کا زیور گم ہوا تھا) دوسری عورت پر الزام لگایا۔ تو ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ بات مرنے مارنے پر پہنچ گئی۔ ایک سمجھ دار بزرگ نے دونوں فریقوں کو ٹھنڈا کیا اور کہا۔ اس الزام کا محرک کیا ہے اور جب اسے محرک پتا چلا تو اس نے کہا۔ کن خرافات میں پڑ گئے ہو۔

بہرطور وقتی طور پر تو معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا لیکن ایک دن پھر لڑائی ہو گئی اور بات تھانے کچہری تک جا پہنچی۔ دونوں طرف کے کچھ آدمی اور عورتیں زخمی ہوئیں۔ اس علاقے کے تھانیدار نے ان کا راضی نامہ کروا دیا۔

بقول فضل دین کے ایک صبح ایک جوان آدمی پیر صاحب سے ملنے آیا اس وقت فضل دین پیر صاحب کے پاس ہی موجود تھا۔ جوان نے پیر صاحب سے غصے میں کہا۔

"میں تم جیسے پیروں کو خوب جانتا ہوں۔ تمہارے پاس کون سا غیب کا علم ہے جو تم نے میری ماں پر الزام لگوا دیا۔"

پیر صاحب نے جوان سے کہا۔ "مورکھ! میں نے تمہاری ماں کا نام تو نہیں لیا تھا۔ تم ذرا اب تھوڑا رکو ورنہ......"

"ورنہ تم کیا کرو گے؟" جوان نے آگے بڑھ کر پیر صاحب کا گریبان پکڑ لیا۔ فضل دین نے شور ڈالا تو سائیں بھی دوڑا چلا آیا۔ چونکہ اس وقت صبح صبح کا وقت تھا اس لیے ابھی سائلوں کی آمد شروع نہیں ہوئی تھی۔

شاید اس لیے جوان نے یہ وقت چنا تھا۔

بہرکیف دونوں نے بڑی مشکل سے پیر صاحب کو اس جوان سے نجات دلائی۔

جوان جاتے جاتے دھمکی دے گیا کہ میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں تمہارے ٹونے ٹوٹکے کر کے گاؤں کو دکھا دوں گا۔ میرا نام عشرت ہے عشرت۔

فضل دین یہاں تک پہنچ کر خاموش ہو گیا۔ میں اور شوکی اس کی یہ کہانی بڑی توجہ سے سن رہے تھے۔ کافی دیر خاموشی میں گزر گئی۔

"آگے کیا ہوا؟" شوکی نے پوچھا۔ کیونکہ خاموشی کا وقفہ طویل ہو رہا تھا۔

"سرکار......!" وہ جیسے خیالات سے چونک پڑا۔ "ایک رات ہم نے ڈیرے پر پراسرار حرکات دیکھی تھیں۔"

"کیا مطلب کیسی حرکات؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے ذرا سخت اور تیکھے لہجے میں کہا۔

"اس وقت ہم خود ان حرکات کو کوئی معنی نہیں دے سکے۔ البتہ ہم اور پیر صاحب ڈر گئے۔"

"تمہارے پیر صاحب تو پہنچی ہوئی چیز تھے۔ ان کو بھی کچھ پتا نہیں چلا۔" شوکی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے پاس ہمارے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

پھر بنا کہے اس نے اگلی بات خود ہی بتا دی۔

انہوں نے پیر صاحب سے کہا کہ یہاں سے کہیں اور چلتے ہیں۔ یہاں ان کی جان کو خطرہ ہے۔ اس طرح معاملات ان کو گھیر کر تھانے کی حدود میں لے آئے۔ آگے جو کچھ ہوا وہ آپ کے علم میں آ چکا ہے۔

جس مکان کو انہوں نے اپنا ڈیرا بنایا تھا۔ وہ انہوں نے کرایے پر لیا تھا۔ ابھی یہاں کسی کو بھی پتا نہیں تھا کہ یہ کون ہیں۔ ابھی انہوں نے یہاں پاؤں جمانے تھے۔ اسی لیے جب ہم ڈیرے پر گئے تھے تو چند مرد وزن کے علاوہ وہاں کوئی نہیں تھا۔

فی الحال فضل دین کو ہم نے حوالات میں بند کر دیا۔

اگلے دن میں نے تھانے کا انتظام شوکی کے حوالے کیا اور خود سپاہی اللہ دتہ کو ساتھ لے کر فضل دین کے بتائے ہوئے گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا ہم گاؤں کی حدود میں واقع تھانے میں گئے۔

وہاں کے تھانے دار نے ایک ہیڈ کانسٹیبل اور ایک سپاہی ہمارے ساتھ کر دیا۔ چھوٹا گاؤں ہونے کی وجہ سے عشرت کا گھر جلدی مل گیا۔ عشرت ایک خوب صورت اور سرخی مائل بدن کا حامل نوجوان تھا۔ اس کی بڑی بڑی مونچھیں اس کے چہرے کو رعب دار بنا رہی تھیں۔ عمر بائیس کے لگ بھگ تھی۔

ہم نے اسے کیسے پکڑا؟ اس کو بیان کرنے کے لیے قیمتی صفحات کو ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ آپ کی کہانی پیچھے لیکن یہاں اتنا کہنا ضروری ہے کہ فی الحال ہم نے فضل دین کی ہر بات پر یقین نہیں کر لیا تھا۔ لیکن عشرت مشتبہ تھا اور اس کے پاس پیر کو قتل کرنے کا جواز بھی موجود تھا۔

ہم نے اس سے کلہاڑی بھی مانگی تھی۔ جوان نے لا کر ہمارے حوالے کر دی تھی۔ بظاہر کلہاڑی پر کسی قسم کا نشان نہیں تھا لیکن میری تجربہ کار نگاہیں یہ دیکھ رہی تھیں کہ کلہاڑی کو رگڑا گیا ہے۔

بہرحال کاغذی کارروائی مکمل کر کے ہم شام ڈھلے واپس اپنے تھانے میں پہنچ گئے۔ عشرت نے صرف اتنا کہا تھا کہ میں نے پیر کو قتل نہیں کیا ہے۔

البتہ اس کے بعد وہ چپ ہو گیا تھا۔

تھانے میں شوکی کی گرفت تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹیں آج نہیں آ سکیں گی کل صبح متوقع تھیں۔

میں نے اور شوکی نے مشورہ کر کے فی الحال عشرت کو ایک الگ حوالات میں بند کروا دیا اور آرام کرنے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ دوسری صبح جب ہم تھانے میں پہنچے تو ابھی دفتری کام باقاعدہ شروع نہیں ہوا تھا۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ آج میں اور شوکی ساتھ ساتھ تھانے میں داخل ہوئے تھے۔

کلہاڑی کو ہم نے رات کو ہی پارسل بنا کر ٹیسٹ کے لیے بھیج دیا تھا۔ ہم کوئی لمحہ ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹیں دن دس بجے موصول ہو گئیں۔

پہلی رپورٹ پیر صاحب کے متعلق تھی۔ پیر صاحب کا قتل رات دو اور تین بجے کے درمیان ہوا تھا۔ جسم پر پندرہ زخم تھے اور رپورٹ میں آلۂ قتل کلہاڑی جیسے ہتھیار کو ظاہر کیا گیا تھا۔ یہ بات بھی واضح ہوتی تھی کہ قاتل پیر کے لیے اپنے دل میں شدید نوعیت کی نفرت رکھتا تھا۔

دوسری رپورٹ سائیں کے متعلق تھی۔ اس کے سر میں کسی مضبوط لکڑی کے ڈنڈے یا دستے سے چوٹ لگائی گئی تھی اور اس کی موت زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے واقع ہوئی تھی۔ یعنی اسے اسپتال تاخیر سے پہنچایا گیا تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹوں کے ساتھ لاشیں بھی آ گئی تھیں۔

فی الحال ان لاشوں کا کوئی والی وارث نہیں تھا۔ بقول فضل دین تینوں کے لواحقین مر کھپ گئے تھے۔ فضل دین کو ہم چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ کیونکہ ابھی معاملہ اندھیرے میں تھا۔

بالآخر ہم نے فیصلہ کیا کہ جو ان لاشوں کا کرتے تھے۔ یعنی ایک فلاحی تنظیم کو یہ لاشیں دے دیں۔

انہوں نے انہیں دفنا دیا تھا۔

یہ سارے کام نمٹاتے نمٹاتے سہ پہر ہو گئی۔ شوکی نے چائے منگوائی۔ چائے ہم نے اسی ہوٹل سے منگوائی تھی جس کے مالک کا نام امانت ہے۔ اس کا ذکر میری تفتیشی کہانی منصوبہ ساز میں آ چکا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر اس وجہ سے کرنا پڑ رہا ہے کہ اس تھانے میں یہ میری آخری تفتیش تھی۔

"سر امانت کے ہاتھ میں واقعی جادو ہے۔" شوکی نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"واقعی جو چیز تعریف کے قابل ہو اس کی تعریف ضرور کرنی چاہیے۔" میں نے اپنی خالی پیالی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ پھر مزید کہا۔ "اور چائے لاؤ۔"

اس طرح امانت کی باتیں کرتے ہوئے چائے ختم ہو گئی۔

وہ دور اس بڑھاپے میں بھی مجھے یاد آتے تو دل سے ایک آہ نکل جاتی ہے۔ کتنا پُرسکون دور تھا کتنی خالص چیزیں ہوتی تھیں۔ نہ خود کش دھماکے تھے نہ دہشت گردی نہ ذہنی ٹینشن۔

البتہ قتل اس وقت بھی ہوتے تھے۔ آج بھی ہو رہے ہیں۔ اس وقت قتل کی نوعیت جو ہوتی تھی آج کل سب کچھ آپ کے سامنے ہے۔ خیر ان باتوں پر دل دکھتا ہے۔ میں آپ کو پیر کے قتل کی کہانی سنا رہا تھا۔

اس کے بعد ہم نے عشرت کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔

"ہاں بھئی عشرت اقبال جرم کرو گے یا نہیں۔"

میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"جناب میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا ہے کہ۔۔۔"

"پہلے اور آگے کو چھوڑو۔ تم نے مردوں والا کام کیا ہے ایسے ذیادہ اس کا بھی انجام ہونا چاہیے تھا۔ اب مردوں والا ایک اور کام کرو اور اقبال جرم کرلو۔" میں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"سنا ہے آپ لوگ تو گونگوں سے بھی اقبال جرم کروا لیتے ہیں۔ وہی طریقہ مجھ پر بھی آزمائیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں نے اپنی کسی کہانی میں کہا تھا کہ شوکی غصے کا تیز تھا جونہی اس نے اٹھنا چاہا میں نے اس کا کاندھا دباتے ہوئے اسے بٹھا دیا اور خود اٹھ کر عشرت کے پاس جا کھڑا ہوا۔

"ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خشک لہجے میں کہا۔ "البتہ ہاں۔" مجھے اچانک یاد آ گیا کہ یہ لفظ اس نے استعمال کیا تھا۔

"میں نے تمہارے گاؤں میں تم سے پوچھا تھا کہ پیر کو تم نے قتل کیا ہے تو تم نے کہا تھا نہیں البتہ۔۔۔ اس البتہ سے تمہاری کیا مراد تھی؟"

"جناب اس البتہ سے میری یہ مراد تھی کہ میں پیر کو قتل کرنا چاہتا تھا۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

پھر اس نے اپنی بے گناہی میں دلیلیں دینی شروع کر دیں۔ سب سے بڑی دلیل یہ دی کہ اسے پیر کے متعلق پتا ہی نہیں تھا کہ وہ یہاں آ گیا ہے۔ البتہ پیر اور اس کے چیلوں کا اچانک غائب ہو جانا اس کے لیے حیرانی اور تشویش کی بات تھی کیونکہ وہ ہر حال میں پیر کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ بقول اس کے ایسے پیروں کا

خاتمہ ضروری تھا۔ اس بات کا اس نے اقرار کرلیا کہ رات کے اندھیرے میں کلہاڑی لے کر وہ پیر کو قتل کرنے پرانے ڈیرے پر گیا تھا لیکن وہ دونوں پہلے جاگ رہے تھے وہ واپس آ گیا اور پیر کو قتل کرنے کے منصوبے بناتا رہا۔ پرانے ڈیرے کے متعلق اس نے بتایا کہ وہ ڈیرہ ابھی شروع میں [illegible] گیا تھا لیکن بعد میں جب پیر کا کام چل نکلا اور وہ مشہور ہو گیا تو الگ سے [illegible] چھوڑ دیا اور اس کا ٹھکانہ بن گیا۔

ان باتوں سے ہمارا مسئلہ حل نہیں ہوا تھا۔ ہمیں قاتل یا قاتلوں کی تلاش تھی۔ عشرت کی باتوں سے سچائی جھلک رہی تھی۔

پھر قاتل کون تھا؟ اور پیر کے ساتھ سائیں کو کیوں قتل کیا تھا۔ فی الحال ہم نے عشرت کو دوبارہ حوالات میں بند کرایا اور سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ ہمارے دماغ گھوم رہے تھے لیکن ہم اپنے فرض سے مجبور تھے۔ ڈیرے پر قتل کی رپورٹ پر [illegible] گزر چکے تھے۔ تاخیر اچھی نہیں تھی۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ اللہ دتہ نے اپنا کام مکمل کرلیا ہوگا۔

ابھی میں اسے بلانے کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ وہ خود ہی آ گیا۔

"ہاں بھئی کیا خبریں ہیں۔" شوکی نے کندھے ہلاتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں استفسار کیا۔

پھر اس نے اپنی مرتب کی ہوئی رپورٹ ہمیں دے دی۔ رپورٹ نے ہماری مزید کوئی رہنمائی نہیں کی۔ کیونکہ مجرم یا مجرموں نے سارے کھرے مٹا دیے تھے۔

اس کا مطلب تھا کھوج دوبارہ سے پڑا ہے۔

جب سپاہی اللہ دتہ چلا گیا تو ہم وہیں کھڑے تھے۔ جہاں پہلے تھے کسی کسی کیس میں ایسا بھی ہو جاتا تھا۔

"سر قتل کا محرک کوئی اور بھی ہو سکتا ہے۔" شوکی کی آواز نے مجھے خیالات سے چونکا دیا تھا۔

"وہ ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہو سکتا ہے پیر صاحب نے کوئی اور بھی گل کھلا دیا ہو؟" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے کہا۔

آخر ہم نے ایک فیصلہ کیا ابھی میں آپ کو اس فیصلے سے آگاہ نہیں کروں گا۔

پھر ہم آرام کرنے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ یعنی میں اور شوکی۔ دوسری صبح ایک سنسنی خیز اطلاع ہماری منتظر تھی۔ لیکن یہ اطلاع ہمارے لیے سنسنی خیز نہیں تھی۔ ہم نے اطلاع لانے والے کو کچھ ضروری ہدایات دے کر رخصت کردیا اور اسے اپنی زبان بند رکھنے کی تاکید کی۔

کلہاڑی کے متعلق رپورٹ بھی موصول ہوگئی۔

جس [illegible]۔

پروگرام کے مطابق میں نے سپاہی انور کو ساتھ لیا اور ایک بار پھر عشرت کے گاؤں جا پہنچا۔ اس بار ہم گاؤں کے نمبردار کے گھر میں بیٹھے۔ نمبردار ہماری خاطر تواضع کے لیے دوڑ دھوپ میں لگ گیا تھا۔ میں نے اسے منع کردیا تھا۔

بہر حال کھوئے والے حلوے اور گرم گرم دودھ سے ہمیں وہ خاطر کر چکا ہے۔

نمبردار کا نام شفقت علی تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ تمہارے گاؤں کا ایک جوان ہے عشرت اس کے متعلق کچھ معلومات چاہئیں۔

"جناب مجھے پتا چلا تھا کہ آپ لوگ پہلے بھی گاؤں میں آئے تھے اور عشرت کو لے گئے تھے لیکن آپ نے مجھ سے کچھ پوچھا نہیں تھا۔"

"دیکھو شفقت علی ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔"

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے آپ پوچھیں۔"

"کیا عشرت صرف پیر کو ہی مارنے والا ہے یا...؟" میں نے دانستہ فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"میں آپ کا مطلب سمجھ گیا ہوں۔ وہ اصل میں خاندانی شریف ہے۔ کسی کے ساتھ اس کا جھگڑا وغیرہ نہیں ہوا لیکن ان کی بہت بے عزتی ہوئی ہے۔ زیورات کی چوری کے سلسلے میں اور عشرت گاؤں میں کہتا پھرتا تھا کہ وہ پیر کو دنیا کے تختے سے اکھاڑ پھینکے گا۔" شفقت علی نے جواب دیا۔

"اور وہ بھی اس نے ایسا کر دیا۔ کیوں...؟" میں نے ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ تو صاحب جی جاننے والی ایک بات ہے کہ پیر اور اس کے دو چیلے تو راتوں رات غائب ہو گئے تھے۔" "عشرت نے [illegible] کس طرح ہوگا؟"

"کیا یہ ممکن ہے؟" میں نے اسے گھورا۔

"میرا یہ مطلب نہیں جناب میں تو ایک امکان ظاہر کررہا تھا۔ وہ گھبرا گیا۔ پھر اس نے مجھ سے ایک بات پوچھی۔ جس کا میں نے اسے جواب دیا اور ساتھ یہ تاکید بھی کردی کہ منہ بند رکھے۔ شام تک ہم واپس آ گئے۔

❁ ❁ ❁

رات کے بارہ بج چکے تھے آسمان پر ہلکے ہلکے بادل اکٹھے ہو رہے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی رونگٹے کھڑے کر دینے والا موسم تھا۔ کیونکہ ہم قبرستان میں چھپے ہوئے تھے۔ میرے ساتھ سلطان محمود اور سپاہی انور تھے۔ ہم مسلح تھے اور ہمارے پاس بڑی بڑی ٹارچیں تھیں۔

ہم سے پچاس گز کے فاصلے پر شوکی دو مسلح اہلکاروں کے ساتھ مشرق کی طرف چھپا ہوا تھا۔ مجھے یہ احساس تھا کہ ہمیں شیروں کا شکار کرنا پڑ سکتا ہے لیکن اصل میں ہمارا پالا ایسے گیدڑوں سے تھا جنہوں نے گھٹیا طریقے سے اپنے آپ کو شیروں کی کھال میں محفوظ کیا ہوا تھا اور سمجھ رہے تھے کہ وہ محفوظ رہیں گے اور اپنا کام کر کے صاف نکل جائیں گے۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ صرف کبھی کبھی کتوں کے بھونکنے کی آواز اس خاموشی کا سینہ شق کر دیتی تھی۔

پھر وہ وقت آ گیا۔

اس طرح مزید ایک گھنٹہ گزر گیا۔ ہمیں یقین نہیں تھا کہ آج کی رات کچھ ہوگا لیکن یہ ایک جوا تھا جس سنسنی خیز خبر کا میں نے ذکر کیا تھا وہ یہی تھی کہ کل رات بھی کچھ پراسرار نقل و حرکت دیکھی گئی تھی قبرستان میں۔

اطلاع آج صبح گورکن دے کر گیا تھا۔ ہم نے اسے جو ہدایات دی تھیں ان میں یہ ہدایت بھی تھی کہ آج وہ اپنی کوٹھری میں نہ سوئے اور مجھے یقین تھا کہ اس نے ہماری ہدایت پر ضرور عمل کیا ہوگا۔ اس سے پہلے کہ مایوسی ہمارے ذہنوں پر دستک دیتی۔ ہمیں الرٹ ہونا پڑا۔

گورکن کی کوٹھری سے ہمیں ہلکی سی آہٹ محسوس ہوئی۔ اندھیرا اتنا تھا کہ کوئی چیز واضح نظر نہیں آ رہی تھی۔

پھر ہمیں کچھ ٹمٹماتی روشنیاں نظر آئیں۔ انہوں نے ٹارچیں جلا رکھی تھیں اور وہ تین تھے۔

وہ اس طرف بڑھ رہے تھے۔ جس طرف ابھی کوئی قبر نہیں کھودی گئی تھی۔ جگہ خالی تھی۔ مجھے امید تھی کہ شوکی وغیرہ بھی الرٹ ہو چکے ہوں گے۔ میں نے اللہ دتہ اور سلطان محمود کو سرگوشی میں آگے بڑھنے کے لیے کہا اور ہم چیتے کے مانند آگے سرکنے لگے۔ خطرہ تو موجود تھا۔ مگر فرض کی راہ میں خطرے تو مول

لیٹے پڑے تھے۔

سائیوں کی حرکت ایک جگہ رک گئی۔ میں نے ان سے بیس قدموں کے فاصلے پر رک جانا مناسب سمجھا۔ ظاہر ہے میرے ہمراہی بھی رک گئے ہوں گے۔

یہ احساس بھی مجھے ہو گیا تھا کہ شوکی وغیرہ سے ہم صرف دس قدموں کے فاصلے پر ہیں۔

پھر......!

رات کی تاریکی میں زمین کھودنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم سانس روکے پڑے رہے۔

جب یہ آوازیں بند ہو گئیں تو ہم نے دو منٹ انتظار کیا۔

اچانک رات کی تاریکی میں مجھے شوکی کی سانپ کی پھنکار سے مشابہ آواز سنائی دی۔ "ہاتھ اوپر اٹھا لو۔ تم ہماری گنوں کی زد پر ہو۔" اور ساتھ ہی اس وقت دو ٹارچوں کی روشنی سائیوں کی آنکھوں پر پڑی۔ ہم کب پیچھے رہنے والے تھے۔ اللہ دتہ اور سلطان محمود نے بھی ٹارچیں روشن کر لیں۔ میں نے بھی ٹارچ روشن کی اور ریوالور نکال کر اس کا رخ بوکھلائے ہوئے مجرموں کی طرف کر دیا۔ وہ اس اچانک پڑنے والی افتاد سے گھبرا چکے تھے۔ انہیں ہاتھ پاؤں ہلانے کا موقع بھی نہیں ملا۔

اور ہم نے مال غنیمت سمیت انہیں جا لیا۔

وہ تین تھے اور ہم چھ۔ اس وقت ہر طرح سے ہمارا پلہ بھاری تھا۔ ان کے پاس بھی اسلحہ تھا لیکن کسی قسم کا خون خرابہ نہیں ہوا۔

اور......!

ہم نے انہیں لا کر حوالات میں بند کر دیا اور تھانے کا نظام سلطان محمود کے حوالے کر کے میں اور شوکی آرام کرنے چلے گئے۔

بارہ بجے واپس آ کر میں اپنی سیٹ پر بیٹھا ہی تھا کہ شوکی بھی تازہ دم ہو کر آ گیا۔

ہم نے مجرموں کو حوالات سے نکال کر تفتیش روم میں پہنچا دیا۔ جمال، حسرت خان اور سلطان محمود نے انہیں گھیرے میں لے لیا۔

مگر انہوں نے ہمیں ذرا بھی پریشان نہیں کیا۔ وہ رنگے ہاتھوں پکڑے گئے تھے۔ ان کے پاس حیل، حجت اور انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ انہوں نے اقبال جرم کر لیا اور ہم نے انہیں دوبارہ حوالات میں بند کر دیا۔ اب چالان مکمل کر کے انہیں حوالۂ عدالت کرنا تھا۔

یہ سب کچھ تو ہو گیا، آپ سوچ رہے ہوں گے۔ ان کی نقاب کشائی کب ہوئی؟ لیجیے جناب نقاب کشائی حاضر ہے۔

ان میں ایک تو پیر کا چیلا فضل دین تھا اور دوسرے دو اس کے ساتھی۔ بات اس فیصلے سے شروع کرتے ہیں۔ جو ہم نے کیا تھا ہم نے متفقہ فیصلہ کر کے عشرت اور فضل دین کو رہا کر دیا تھا اور ان کے پیچھے دو اہلکار مختلف بھیسوں میں لگا دیے تھے۔ عشرت کی کلہاڑی کے متعلق رپورٹ نے ظاہر کر دیا تھا کہ اس پر کسی قسم کا خون نہیں ہے۔ صرف اسے تیز کرنے کے لیے رگڑا گیا تھا۔ کلہاڑی کے متعلق رپورٹ پڑھ کر عشرت پر شک کم ہو گیا تھا۔ فضل دین کی کچھ باتیں ہمیں بھی کھٹک رہی تھیں۔

عشرت پیر کا دشمن کیوں ہوا تھا۔ اس کا ذکر آ چکا ہے۔ پیر کا چیلا فضل دین ڈاکوؤں کے ایک گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ پیر صاحب کی آمدنی بے شمار تھی۔ اس نے جنگل میں تقریباً دو لاکھ روپیہ دفن کر دیا ہوا تھا۔ بقول فضل دین کے پیر روز ہزاروں روپے لوگ نذرانے کے طور پر دے جاتے تھے۔ یہاں تک

پیر کے متعلق باقی باتیں نہیں کروں گا۔ صرف اتنا بتاؤں گا کہ یہ اس دور کے دو لاکھ روپے تھے۔ جب سونا تین ہزار کے لگ بھگ فی تولہ تھا۔

ہوا یہ کہ ڈاکوؤں کا سردار بیمار پڑ گیا اور وقتی طور پر ڈاکے ڈالنا بند کر دیے۔ وہ ڈاکو فضل دین سے آ ملے۔ فضل دین کی مخبری پر وہ ڈاکو روپے پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ عشرت والا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ فضل دین نے پیر کو باتوں باتوں میں راضی کر لیا کہ جنگل سے روپیہ نکلوایا جائے۔ پھر وہ ڈاکو سمیت وہ یہاں آ گئے۔

وہ پیر کی جیب میں رہتا تھا۔ فضل دین نے ہم سے جھوٹ بولا تھا کہ پیر نے اسے کہیں بھیجا تھا۔ پروگرام کے مطابق دونوں ڈاکو گئے اور ایک ڈاکو نے کلہاڑی کے پے در پے وار کر کے پیر کا کام تمام کر دیا۔ وہ عشرت کو قاتل ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ وہ جو کے لیے دل میں بہت زیادہ نفرت رکھتا تھا اس لیے بہت زیادہ وار کیے گئے تھے۔ فضل دین کو پتا نہ چلا، چاہتا تھا کہ ہم عشرت کو ہی مجرم سمجھ رہے ہیں۔ اسی لیے میں اس کے گاؤں جا کر مخبر سے ملا تھا۔ ہمارا ایک اہلکار ایک فقیر کے بھیس میں اس کے گاؤں میں موجود تھا۔ اس کا تو آپ کو پتا ہی تھا۔

ادھر ہمارا اہلکار فضل دین کے پیچھے تھا اس نے ہمیں اطلاع دے دی تھی کہ فضل دین دو بندوں سے ملا ہے۔ جو اجنبی لگ رہے تھے۔

جس صبح گورکن نے ہمیں اطلاع دی تھی کہ رات قبرستان میں کچھ پراسرار سرگرمیاں دیکھی گئی ہیں اس رات یہ دو ڈاکو تھے۔ دراصل کلہاڑی اور روپے انہوں نے قبرستان میں چھپا دیا تھا۔ یہ ڈاکو جنگل کے خوف کی وجہ سے وہاں سے روپیہ اور کلہاڑی نکالنا چاہتے تھے لیکن گورکن کے شور مچانے پر بھاگ گئے تھے۔ وہ یہ کام خاموشی سے کرنا چاہتے تھے۔

جب انہیں اطمینان ہو گیا کہ پولیس عشرت کے پیچھے پڑی ہوئی ہے تو اس رات وہیں وہاں پہنچ گئے۔ آج رات وہ گورکن کو بے ہوش کر کے اپنا کام کرنا چاہتے تھے۔ گورکن انہیں وہاں نہ ملا۔ اس کے بارے ان کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی نہیں بجی۔

شاید وہ زیادہ دن دو لاکھ کو زمین میں دبا نہیں رہنے دینا چاہتے تھے۔

اب بات ہو جائے سائیں کے قتل کی اس نے انہیں پہچان لیا تھا۔ انہوں نے بلکہ فضل دین نے کلہاڑی کا دستہ (جو مضبوط لکڑی کا تھا) زور سے سائیں کے سر پر مارا۔ کچھ دیر کے بعد وہ بے ہوش ہو گیا۔ انہوں نے جان بوجھ کر اس کا خون بہنے دیا۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ وہ چند گھنٹوں کا مہمان ہے فضل دین نے اسے اسپتال پہنچا دیا۔ جب میں کہانی لکھتا ہوں تو میری کوشش ہوتی ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی نہ رہ جائے۔ تبصرہ نگار نے مجھ سے یہ پوچھا تھا کہ آپ کو عشرت پر شک ہے تو اسے چھوڑا کیوں......؟ کیونکہ اس نے عشرت کو دیکھا تھا۔ اس کیس میں سب سے اطمینان والی بات ہمارے لیے تھی کہ عشرت قاتل بننے سے بال بال بچ گیا تھا اور ڈپٹی صاحب اور اس کے چیلے اپنے انجام کو پہنچ گئے تھے۔ اس کیس کے ختم ہونے کے چند دن بعد میرا تبادلہ ہو گیا تھا اور ڈاکوؤں کے باقی گروہ کے متعلق مجھے کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا۔

⌘

WWW.PAKSOCIETY.COM

روبینہ احمد

نوشین اشفاق ۔۔۔ میرپور آزاد کشمیر

یوں بھی کرتا ہے کوئی چاہنے والوں پہ ستم
پیار کی داستانیں لکھی نہیں ہیں اشارے کیسے

مہر گل بانو ۔۔۔ گجر

بکھری ہے یکھو اس طرح محبت اسے کہنا
آنکھوں میں اتر آئی ہے وحشت اسے کہنا
کہنا کہ تیرے بعد سے جی لگتا نہیں ہے
بے چینی سی رہتی ہے طبیعت اسے کہنا

مجاہدہ عباسی ۔۔۔ گجرپورہ

یہ دنیا گلی تیرے بن پاگل ادھوری ہے جاناں
کہ لوٹ آؤ اب تیرے بن جیا نہیں جاتا

ریاض بٹ ۔۔۔ حسن ابدال

میں خود کو ڈھونڈتا ہوں ہر شہر آرزو
مجھ کو بھی دل کے ساتھ چرا لے گیا کوئی

صدف سلیمان ۔۔۔ شور کوٹ

ہر سانس محبت پہ فدا کرتا رہوں گا
سائل ہوں تیرے در پہ صدا کرتا رہوں گا
یہ دولت آنسو میری قسمت کی عطا ہے
ہاں تیرے لیے دل سے دعا کرتا رہوں گا

عبدالرحمن سیاہ فام ۔۔۔ کشمیر

تم سب کی یاد آتی رہی ساری رات
سو نہ سکا رات کے آخری پہر تک

فقیر محمد بخش ۔۔۔ خانیوال

میری دنیا میں کسی روز سویرا ہوتا
وہ کسی روپ میں آتا اور میرا ہوتا
اس کی حسرت میری تقدیر میں لکھنے والے
کاش اس کو بھی میری تقدیر میں لکھا ہوتا

محمد سلیمان ۔۔۔ منڈی بہاؤالدین

تو نے دیکھا ہے کبھی اک نظر شام کے بعد
کتنے چپ چاپ سے لگتے ہیں شجر شام کے بعد
تو ہے سورج تجھے معلوم کہاں رات کا دکھ
تو کسی روز میرے گھر میں اتر شام کے بعد

عبدالمالک کیف ۔۔۔ واہری

محبت کی بجلی سے جو من کے کندن نکلتے ہیں
بے خوف و خطر وہ درد کے صحرا میں اترتے ہیں
چاہت کے پیچھے جو سمٹ کے عمر شمار ہوں کیف
وہ کچے گھڑے پہ بیٹھ کے دریا میں اترتے ہیں

تنزیل احمد ۔۔۔ کراچی

تنگی تنگی ملتی ہے
تنگی تنگی بڑھتی ہے
اور پھر تنگی محبت کی
غیر محدود ہوتی جاتی ہے

حمزہ اشرف ۔۔۔ کراچی

ستارے ٹمٹماتے ہیں تو کوئی یاد آتا ہے
نظارے جھلملاتے ہیں تو کوئی یاد آتا ہے
اسے واپس نہیں آنا مگر ہم پھر بھی ہاتھ اپنے
دعا میں جب اٹھاتے ہیں تو کوئی یاد آتا ہے

مہرین ۔۔۔ بہاولپور

تجھ سے مل کر بچھڑ گئے تجھ سے بچھڑ کر مل گئے
ایسی بھی قربتیں رہیں ایسے بھی فاصلے رہے
تو بھی نہ مل سکا ہمیں عمر بھر رواجوں کی
تجھ سے تیرا عشق تھا خود سے بچھڑ کے رہے

کرن ثاقب ۔۔۔ لاہور

میری آنکھوں میں تیرا پیار چھلکتا ہے ابھی
تیرے نام پہ میرا دل دھڑکتا ہے ابھی
مانا کہ میری زمانت میں فقط تو ہی بچا ہے
تجھے پا کے کھو دینا میرے بس میں ہے ابھی

سیدہ ارم ۔۔۔ کوٹ ناظم

بڑے خلوص سے بنتے ہیں ہمسفر
چھوڑ جاتے ہیں وہ کام نکل کر

محمد عمیر ۔۔۔ سکھر

یوں تو کوئی بھی تنہا نہیں ہوتا
چاہ کر کسی سے جدا نہیں ہوتا
محبت کو مجبوریاں ہی لے ڈوبتی ہیں
ورنہ کوئی خوشی سے بے وفا نہیں ہوتا

فراز ۔۔۔ شور کوٹ

زندگی خواب ہونے کو ہے
اک دل ویران ہونے کو ہے
امید کا آخری دیا بھی اب بجھ جانے کو ہے
کیونکہ رات اپنی تاریکی کے ساتھ ہونے کو ہے

ایف ۔۔۔ صادق آباد

سونا آنگن تنہا عورت لمبی عمر
خالی آنکھیں بھیگا آنچل سلے ہونٹ
اتنا بولی تو کیا سوچیں گے لوگ
رسم یہاں کی ہے لڑکی سی لے ہونٹ

اقصیٰ ۔۔۔ ڈگری سندھ

مجھے ضبط غم پہ غرور تھا میرے آنسوؤں نے وفا نہ کی
میرے رازِ دل پہ عیاں ہوئے یہ میری آنکھ سے چھلک گئے
مجھے چھوڑ دے یہ سنبھل نے ہے میری ذات اس کے ہاتھ میں
مجھے اعتراف شکست ہے میرے پاؤں راہ میں تھک گئے

مہک ۔۔۔ راولپنڈی

لگتا ہے کئی راتوں کا جاگا تھا مصور
تصویر کی آنکھوں سے تھکن جھانک رہی ہے

اُمِ عمیر ۔۔۔ جہلم

کیسی ذو یک سی رکی ہے بچھڑنے کی گھڑی
اس سے ملنے کے سبب ہم ہو گئے ہیں
اس قدر ترسے رہی ہے شب ہم اپنا نصیب
ہم کو اب خود ہی نصیب شب غم ہو گئے ہیں

گل ناز ۔۔۔ میرپور آزاد کشمیر

وہ فرقتوں کے سوال کرے محبتوں کے جواب لگے
[illegible]
[illegible]

کوئی تو میرا ہو جاتے کوئی تو اس سے حساب ساتھ لگے

دلدار حسین ۔۔۔ راولپنڈی

ہے سبب ذلت عالم میں نہیں آتا
کوئی بے تاب تہہ خاک تڑپتا ہو گا

وادہ خان ۔۔۔ رحیم یار خان

یقین کرو کبھی مرنے کے ڈر نہ اترے تھے
کہ تو ماشوں پہ میری جب یہ نہ اترے تھے
بڑا غرور تھا ہم کو بھی خود بینی کا
کہ جب تلک یہاں آئینہ گر نہ اترے تھے

ہم بھی ۔۔۔ لیہ

میں نے ساری خوشبو آنچل سے باندھ کے رکھی
شاید ان کا آخر تو اپنے کسی سوال میں رکھے
جا سے تیرے آنے کی سرگوشی کو سنتے ہی
میں نے کتنے پھول چنے اور اپنی شال میں رکھے

عمران شیخ ۔۔۔ کراچی

کسی نے کب ہمیں جینے کا اختیار دیا
تجھے وصل نے مجھے زندگی نے مار دیا
کسی سے عشق کا اظہار جس میں کرنا تھا
خبر نہیں کہ وہ لمحہ کہاں گزار دیا

جہانگیر ۔۔۔ ملک وال

وہ خواب تھا جو بکھر گیا خیال تھا ملا نہیں
مگر دل کو کیا ہوا یہ کیوں بجھا پتا نہیں
ہر ایک دن اداس دن تمام شب اداسیاں
کسی سے کیا بچھڑ گئے کہ جیسے کچھ بچا نہیں

شکیل ۔۔۔ آزاد کشمیر

محبتوں کا حساب تھا نہ عداوتوں کا شمار تھا
کبھی اس کی ذات عذاب تھی کبھی وہ روح کا قرار تھا
اسے میں نے حرف کے صدا دی کہ پلٹ گیا وہ راستے
میں خزاں ہوا تو پتا چلا میری ذات کا وہ نکھار تھا

حرا ۔۔۔ بورے والا

ہے یوں تھکن کہ طلب کا محبت میں بھی
دل کی گہرائی سے تو نے مجھے چاہا ہی نہ ہو

عمر بھر ساتھ رہیں ساتھ جئیں ساتھ چلیں
ان وعدوں کے ٹوٹنے کے ساتھ الفاظ بھی نہ رہ

ندا طارق — کورنگی کراچی

مراسم اتنے بھی گہرے رکھے نہیں جاتے
بعد میں زخموں پہ مرہم رکھے نہیں جاتے
منافقت ہم سے تو بالکل نہیں ہوتی فارق
اک چہرے پہ سو چہرے رکھے نہیں جاتے

عرش — ملتان

بس اسے بہار کے موسم جو سما چاہو تم کو رنگ
جاتی ہے تیری دھوپ میرے شہر کا رنگ
ابھی تو میں نے سمندر میں ہوا دی تھی
یہ کیا ہوا کہ بدلنے لگا ہے لہر کا رنگ

کلیم — لاہور

محبتوں کا اپنی حساب مانگتا تھا
چاہتوں کا اپنی حساب مانگتا تھا
لبِ شکن تقاضا جاننے کے باوجود
وہ باتوں کا اپنی جواب مانگتا تھا

شہاب الدین — گوجرانوالہ

کہتے ہیں محبت اجالی ہوتی ہے
لیکن بہت جلدی چھپالی ہوتی ہے
بہت لوگ وعدہ کر کے مکر جاتے ہیں
یہ بے وفا لوگوں کی کہانی ہوتی ہے

میمونہ — آزاد کشمیر

ہوش والوں کو خبر کیا ہے خودی کیا چیز ہے
عشق کیجیے پھر سمجھیے زندگی کیا چیز ہے
ہم ان سے کہہ پائے ان سے حال دل کبھی
اور وہ سمجھے نہیں یہ خاموشی کیا چیز ہے

ثناء — جھنگ

اگر ہو سکے تو کرو خود میں کشش پیدا
ہر کسی کو حسرت سے دیکھا نہیں کرتے
محبت کیا نہیں جاتا ہر شخص کے قابل
ہر شخص کو اپنے لیے پرکھا نہیں کرتے

عبدالرحمٰن — کراچی

تیری چاہ میں تیری راہ میں میرے حوصلوں کا بھرم گیا
کبھی وہ آندھیاں تیرے شہر کی میرا گھر گیا میرا در گیا
تیرے شہر میں اسے بے مہر تیرے دوستوں کا یہ حال ہے
کوئی پیچھے سے ہی اٹھا کوئی پیچھے سے مر گیا

ثمن — صدر کراچی

مجھے جتنی ضرورت ہے میرے اتنا ملے وہ رہے
کسی سے مانگ کر لینا مجھے اچھا نہیں لگتا
دیا گل کر دیا ہے اس لیے اے جان جاں میں نے
کوئی آئے گزر جاتا مجھے اچھا نہیں لگتا

عشق رنگی — دہلی کالونی

میری آنکھوں میں روشن ہوئے امید کے دیے
کون ہے وہ میرے لیے خوابوں کی خوشی لایا ہے
یہ سال مجھے اس لیے بھی خوب صورت لگا مجھے
کہ اپنے سنگ یہ تیری دوستی ہم لایا ہے

ہانیہ — کراچی

محبتوں کا حساب تھا نہ عداوتوں کا شمار تھا
کبھی اس کی ذات عذاب تھی کبھی روح کا وہ قرار تھا
میں سے اسے مہر کر سدا جو پلٹ گیا تھا وہ وہ
میں شہر میں ہوئی تو پتا چلا میری ذات کا وہ شکار تھا

کاشف ملک — بہاولپور

ہم کسی سے نہ ملے تجھ سے ملاقات کے بعد
دل میں اتری نہ کوئی ذات تری ذات کے بعد
بیت جاتے ساون رت بسنت سب ہی بیتے جائیں
ہم کو کوئی موسم نہ بھائے تیرے جانے کے بعد

حسین شاہد — کراچی

یہاں پیار کا اظہار دوست سے گناہ ہے
پھولوں سے بھی تتلیاں پوچھا نہیں کرتیں
الجھن میں مگھڑے کے پیچھے تیری یادیں
میلہ سا لگا دیتی ہیں اچھا نہیں کرتیں

خوشبوئے سخن

سیما بنت عاصم

غزل

تب وہ منظر کیسا ہوگا
جب وہ ہاتھوں سے بچھڑا ہوگا
خوشبو کی دھول میں اپنے لوگوں
خشک پتوں کی طرح بکھرا ہوگا
میرے آنے کا وہ سن کر
اس کا چہرہ پھر اترا ہوگا
جہاں جہاں میری خوشبو پھیلی ہوگی
وہاں وہ بھی ضرور گیا ہوگا
جب وہ چھوڑ چلا سب لوگوں کو
دل پھر کیسا تڑپا ہوگا
گیا معلوم تھا اتنی جلدی ہوگی
اب وہ کہیں اس کا سایہ ہوگا

وسیم اختر — راولپنڈی

غزل

شب تاریک کو دن یاد صبر کو صبا کہنا
یہی دستور دنیا ہے روا کو ناروا کہنا
لب خاموش سے بھی داستان غم سنا دیں گے
ہماری آنکھ میں آنسوؤں کا ہے طوفاں چھپا کہنا
کبھی طوفان غم جاناں کی زد میں کشتیاں بکھری تھیں
کہاں سے داستاں کے ورق میں آ کر خدا کہنا
مرے چاروں طرف غم کے کھولنے لگنے لگتے ہیں
کتنا ہے ٹوٹنے والا قسموں کا سلسلہ کہنا
یہ سونا اور چاندی ہیں بھی بے کار کی باتیں
گزر جاتا ہے آج بھی محبت کا یہ شرم و حیا کہنا
حقائق کو چھپانے کی بھی غلطی نہ کر جانا
جو چنگی بات ہے بے باک ہو کر برملا کہنا
فخر کرنا تو ہے بخشش ظلم کو بھول جانے کی
مگر ان کا خیال ہو تجھے نہیں دل سے جدا کہنا

ریاض حسین قمر — منگلا ڈیم

غزل

اے میرے دوست اتنی سی آرزو ہے تجھ پہ کوئی غزل کہوں
کوئی مصرعہ کوئی قطعہ کوئی نظم کہوں
اشعار کی الفاظ کی رعنائی ہو جس میں
بکھرے ہوئے اوراق لفظوں کی کہانی ہو جس میں
جس میں ہو تیری ذات کا حسن تمام
جس میں ہو پیار تو کہیں دوست تیرا نام
میں کہوں جس میں اپنے دل کی ہر ہر بات
جس کے لفظ لفظ میں پرائی ہو تیری ہی بات
اے میرے دوست کہ جس میں تیری عادات کو لکھوں
تیری خوبی تیری اچھائی تیری صفات کو لکھوں
جس میں لکھوں تیرے دیکھے پن کو بارش کی پھوار
یا میں لکھوں تجھ پہ یونہی ہر روز نظمیں ہزار
اے میرے دوست کہ جس میں میں تجھ کو اپنا دوست کہوں
اے میرے دوست کہ جس میں میں تجھ کو اپنا ہمراز کہوں
ہم صفات کہوں ہم راز کہوں ہم ذات کہوں
اے میرے دوست اتنی سی آرزو ہے تجھ پہ کوئی بات کہوں

ہما سلطان — مظفرآباد کشمیر

غزل

کن کے دل اور جان زمانے میں
ملتے ہیں مہربان زمانے میں
عشق وہ رہ ہے جس پہ دیوانے
بس لٹاتے ہیں جان زمانے میں
سچ کی راہ پہ چلنے والوں کی کون
کاٹتا ہے زبان زمانے میں
کاش صبر و وفا کی میرے سبب
لب ملے کوئی دکان زمانے میں
قسمیں سے بھی پڑی ہوئی حالت
عشق میں کامران زمانے میں

کامران شاہ کاکی — راولپنڈی

چوہے

چوہے گھر کے چوہے ٹھنڈے
کیسے مٹے گی اب سنڈے کے سنڈے
ختم ہوا اب روز پکانے کا چکر
کھانا پکاؤ اب سنڈے کے سنڈے
کیسے کھائیں ہم سرد موسم میں انڈے
صبح و شام چڑھتے ہیں گرمی کے ڈنڈے
پکڑو تو رنگ سفید چوٹی کا جھوم اٹھے
کیسے بھی آئی جناب سنڈے کے سنڈے
دیکھو یارو ہم نے چاروں طرف
کیا خوب گاڑے جمہوریت کے جھنڈے

عبدالرحمٰن ---- صدر کراچی

غزل

بات خوشبو کی طرح وہ کھول رہی تھیں
مرا سے آنچل کی گلیاں بول رہی تھیں
صدائیں بکھر رہی تھیں جانی انجانی سی
نیند سے چونکیں تو مری ڈول رہی تھیں
صبح خیز تھے برگ و بار گلستاں ابھی تو
ہوائیں ہجر کا زہر سا اس میں گھول رہی تھیں
ہمارے تو خاموشی سے آئے تھے نئی تھیں کچھ
تلاش کر میں گرتیں کیوں یہ تول رہی تھیں
ابھی ابھی تک ہار کے سوئی تھیں سب تتلیاں
تیز ہوائیں چمن میں تھکے رول رہی تھیں
چاند سے تو چند لمحوں کا ہی ساتھ رہا تھا
کالی راتیں پھر سے زلفیں کھول رہی تھیں
جھونکوں نے گلزار میں ڈیرے ڈالے تو
وہ کلیاں چیخ چیخ کے بول رہی تھیں
بھولی بھالی دوشیزائیں بس اپنی دھن میں
خوابوں کے در چپکے چپکے کھول رہی تھیں
میرے چمن میں آمد پہ مری خوش ہو کر
قمر و شعور کی پریاں بھی کچھ بول رہی تھیں
دے گیا پلکوں کو مری وہ غم کا اک سمندر
ورنہ یہ آنکھیں تو مری انمول رہی تھیں

عصمت اقبال میمن ---- ملکاوڑیم

نظم

بارشوں کے موسم میں
وقت کے اندھیروں میں
میں نے اس سے پوچھا تھا
چھوڑ تو نہ جاؤ گے؟
ہاتھ تھام کر اس نے
کان میں یہ بولا تھا
کیسے چھوڑ سکتا ہوں
تم تو جان ہو میری
اور آج پھر ایسے ہی
وقت کی تمازت میں
دشتوں کے موسم میں
میں نے اس سے پوچھا ہے
اگر
چھوڑ کر ہی جانا تھا
آس کیوں دلائی تھی
پیاس کیوں جگائی تھی
میرے سارے سوالوں پر
چلتے چلتے وہ بولا
موسموں کی عادت ہے
وقت پر بدل جانا

رابعہ حسن صابر انگلہ ---- خانیوال

غزل

جدائی کا احساس ہی اب ہوا ہے
یہ مانا کہ وہ مدتوں سے جدا ہے
بہاروں کو کیسے گلے سے لگاؤں
بہاروں کا موسم جو مجھ سے خفا ہے
یہ اپنے نصیبوں کا ہے کھیل کیسا
کہ ہر ایک مجھ سے ہی روٹھا ہوا ہے
گلہ بے وفائی کا کس سے کروں میں

مجھے اپنی قسمت نے دھوکا دیا ہے
یہ حالات میرے ڈبو دیں گے مجھ کو
خدایا تیرا ہی مجھے آسرا ہے
مجھے اب خوشی کی تمنا نہیں ہے
کہ اب جب کہ تو ہی مجھ سے خفا ہے

محمد ارشاد قریشی ---- اسلام آباد

غزل

جدائی کے صدمے اٹھاتے رہیں گے
مگر ہم سدا مسکراتے رہیں گے
محبت نے ہم کو بنایا ہے شاعر
محبت کے ہم گیت گاتے رہیں گے
کوئی لاکھ روکے کوئی ہم کو ٹوکے
حقیقت سے پردہ اٹھاتے رہیں گے
محبت ہے وفا کی توقع ختم ہے
وہ رسم دنیا نبھاتے رہیں گے
کہاں تک چھپائیں گے وہ اپنا چہرہ
کہاں تک ہمیں یوں ستاتے رہیں گے
جلاتے رہیں گے جو نمرود عالم
ہم اس آگ میں گل کھلاتے رہیں گے

محمد عبداللہ عاطر ---- ملکا کنٹ

غزل

ایک چہرہ جو چشم خواب میں تھا
عکس اس کا ہر اک گلاب میں تھا
سحر کے چھپتے تھے اس کی آنکھوں میں
وہ تو سارا میرے حساب میں تھا
ہم نفس مجھ سے بے رخی کے بعد
جانا خود بھی اک عذاب میں تھا
اک فسانہ جسے کہیں چاہت
وہ عمل ہر اک کتاب میں تھا
نشہ جو اس کی آنکھ میں تھا بھلا
وہ بھلا کب کسی شراب میں تھا

صبیح جمال ---- کراچی

غزل

اگر یقین نہیں تو آزما مجھے
یا خود گرفتہ کوئی دکھا مجھے
چاہت ہے اگر تیرے دل میں
چھپا میں اپنے بسا مجھے
پتھروں کی طرح خاموش کیوں ہو
پھولوں کی طرح گلے لگا مجھے
ہر وقت خوشی میں رہتا
نفرت سے اپنی رلا مجھے
کیا ملا سکون مجھ سے دور جا کے
آ بھی کتاب دل دکھا مجھے

محمد اسحاق انجم ---- لکھن پور

غزل

لہو کی بوند میں کوئی شرارہ جاتا ہے
زبان گنگ ہے اور استعارہ جاتا ہے
یہ کہہ رہا ہے سمندر سے چودھویں کا چاند
ابھی نہ موج میں آ شہر سارا جاتا ہے
لہو کے رشتے کہیں سو گئے زمانے میں
بس ایک رشتہ اور ہمارا تمہارا جاتا ہے
گلے لگا کے جو سو جائیں اپنی قسمت کو
تو شہر خواب کا روشن ستارہ جاتا ہے
قدیر ان کا تعلق بھی کیا انوکھا ہے
کہ کوئی دوا میں ہے مجھے سہارا جاتا ہے

عبیر قدیر ---- راولپنڈی

غزل

اب اگر آؤ تو جانے کے لیے مت آنا
صرف احسان جتانے کے لیے مت آنا
میں نے پلکوں پہ تمنائیں سجا رکھی ہیں
دل میں امید کی سو شمعیں جلا رکھی ہیں
یہ حسیں شمعیں بجھانے کے لیے مت آنا
اب اگر آؤ تو جانے کے لیے مت آنا
پیار کی آگ میں زنجیریں پگھل سکتی ہیں

چاہتے والوں کی تقدیریں بدل سکتی ہیں
تم ہو بے بس یہ بتانے کے لیے مت آنا
اب اگر آؤ تو جانے کے لیے مت آنا
زین شانی ۔۔۔ کراچی

غزل

زندگی رہی تو وفا بھی کریں گے
تجھے چاہنے کی خطا بھی کریں گے
دنیاؤں کی بندشیں بھی اگر ہوں
ہم ایک دوسرے سے ملا بھی کریں گے
نہیں ہے جہاں میں کوئی تیرے جیسا
ہم دل میں خدا کے تیری پوجا کریں گے
محبت ہماری ہے شمع کی مانند
تو پروانے تم پہ فنا بھی کریں گے
جو دنیا کی پرواہ میں جان اے دوست!
تو جان دے کے بھی ہم گلہ نہ کریں گے
نورصبا ۔۔۔ کراچی

غزل

وہ بے وفا تو ہے تمہیں پہ بے وفا سے کم نہیں
اس نے جو کی تھی دل لگی وہ تو جفا سے کم نہیں
وہ سنگدل ہے وہ ستم پہ بے رحم سے کم نہیں
دیکھی جو اس کی بے رخی وہ بھی دغا سے کم نہیں
نظروں سے اوجھل وہ نہیں دل کی سرائے میں ہے وہ
ہر زخم تازہ پھر دیا کیا وہ دوا سے کم نہیں
تنہا مجھے چھوڑا ہے کیوں دل توڑ کے جوڑا ہے کیوں
وہ ساتھ میرے پھر بھی ہے کیا وہ جدا سے کم نہیں
اب کیوں صنم جلتا ہے وہ دل توڑ کے ہنستا ہے وہ
مجھ کو جلایا پیار نے کیا وہ سزا سے کم نہیں
مجھ کو اس نے دی دغا رہتا ہے وہ مجھ سے خفا
سچ ہے کہ ظالم ہے وہ مگر مہرباں سے کم نہیں
تنہا واجد مجھے پھر کر دیا سب سے جدا پھر کر دیا
پھر بھی وہ میرا ہمنوا کسی راز داں سے کم نہیں
پروفیسر واجد گیلانی ۔۔۔ کراچی

نظم

سنو!
جب بھی کوئی غم ستائے
دل کو کوئی بات نہ بھائے
آنکھ سے ساگر چھلک جائے
تو بات کر کے دیکھنا ہم سے
کیا پتا
ایسا کچھ ہو جائے!
جب بھی دل بے چین ہو جائے
بچھڑنے پہ پیار رلائے
ملنے پر اور تڑپائے
تو بات کر کے دیکھنا ہم سے
کیا پتا
دل کو سکون آ جائے!
جب بھی کوئی یاد آئے
چپکے سے کوئی آئے
تو بات کر کے دیکھنا ہم سے
کیا پتا
وہ تمہارا ہو جائے!
شہروز ۔۔۔ کراچی

ذوقِ آگہی

علان احمد

اللہ کی نصیحت

"(مسلمانو) بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے حق داروں تک پہنچاؤ اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ کرو۔ یقیناً اللہ تم کو جس بات کی نصیحت کرتا ہے وہ بہت اچھی ہوتی ہے۔ بے شک اللہ ہر بات سنتا اور ہر چیز کو دیکھتا ہے۔ اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی بھی اطاعت کرو۔ تم میں سے جو لوگ صاحب اختیار ہوں، ان کی بھی۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی چیز میں اختلاف ہو جائے تو اگر تم واقعی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اسے اللہ اور رسول کے حوالے کر دو۔ یہی طریقہ بہترین ہے اور اس کا انجام بھی سب سے بہتر ہے۔"

(النساء ۵۹-۵۸)

افتخار احمد ۔۔۔ کراچی

لعنت

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ چھ طرح کے لوگ ہیں جن پر میں نے لعنت کی ہے اور اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر لعنت کی ہے اور ہر نبی نے بھی لعنت کی ہے۔

(۱) اللہ کی کتاب میں زیادتی کرنے والا۔

(۲) اللہ کی تقدیر کو جھٹلانے والا۔

(۳) زبردستی مسلط ہونے والا تاکہ جسے اللہ نے ذلیل کیا ہے اسے عزت دے، اور جسے اللہ نے عزت دی ہے اسے ذلیل کرے۔

(۴) اللہ کے حرام کو حلال سمجھنے والا۔

(۵) میری اولاد سے اس چیز کو حلال جاننے والا جسے اللہ نے حرام کیا ہے۔

(۶) میری سنت کو ترک کر دینے والا۔

مرسلہ: اسرار علی ۔۔۔ کراچی

محبت و عشق

کائنات کی ہر ایک چیز محبت کی وجہ سے قائم ہے اگر زمانے میں محبت نہ ہوتی تو شاید آج کوئی چیز اس قابل نہ ہوتی کہ ہم ایک دوسرے کے پاس آتے جاتے بولتے ایک دوسرے کی خوشیوں اور چاہتوں میں شریک ہوتے۔ اس دنیا میں اس کائنات میں نجانے محبت و عشق کی کتنی لازوال داستانیں ہیں جو آج بھی ادھوری ہیں۔ جو کبھی کسی مجبوری یا غربت مفلسی کی وجہ سے کتنی گمنامی کی زندگی گزار رہی ہیں۔ کوئی ایسی داستانوں پہ یقین نہیں کرتا۔ کوئی کرے بھی تو کیسے؟ کیونکہ کوئی بھی تو محبت نہیں کرتا سب ہوس اور لالچ کے مارے لوگ ایک دوسرے سے محبت کا ڈرامہ کرتے ہیں۔ کبھی کسی لڑکی کے سر بے وفائی تو کبھی کسی لڑکے کے ماتھے پہ بے وفائی کا نشان آخر کیوں؟ ہمارے اس معاشرے سے محبت چاہت ختم ہوتی جارہی ہے۔ کیوں محبت پر سے لوگوں کا یقین اٹھ گیا ہے؟ کبھی ہم نے سوچا کہ کس وجہ سے محبت و عشق کو ختم کیا جا رہا ہے۔ کیوں محبت ہم سے روٹھتی جارہی ہے۔ ہم سب محبت کرنے والے محبت محبت کا راگ الاپتے ہیں مگر کبھی عملی طور پر اس کی تکمیل کے لیے کوئی اقدام نہیں کیا۔ محبت و عشق کی دنیا الگ ہے۔ محبت و عشق کے جذبات الگ ہیں۔ محبت و عشق کا مذہب الگ ہے۔ احساسات منفرد ہیں۔ محبت کے نام

ہوتے ہیں دل برداشتہ نہیں ہوتے حوصلوں کو پست نہیں ہونے دیتے۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی برسات نہیں سجاتے بلکہ کوشش کرنی چاہیے کہ وہ محبت جو ہم سے روٹھ کر کہیں بہت دور جارہی ہے اس کو دور نہ جانے دیں اس کا راستہ روک لیں اس کے آگے دیوار بن جائیں۔ اگر ہم اپنی سچی محبت کو بچانا چاہتے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ محبت ہمیشہ ہمارے آس پاس رہے ہمارے دلوں میں بسی رہے تو ہمیں ان لوگوں کے نقش قدم پر چلنا ہوگا جنہوں نے محبت و عشق کے لیے سب کچھ قربان کردیا۔ اپنی زندگی کو محبت و عشق کی نذر کردیا کبھی آپ نے سوچا وہ لوگ کون تھے؟ وہ لوگ ہمارے جیسے ہم میں سے تھے ہماری طرح کھاتے پیتے تھے ہماری طرح چلتے پھرتے تھے مگر ان کے دلوں میں محبت و عشق کا سمندر موجزن تھا۔ اسی لیے آج بھی کائنات میں محبت و عشق کی نجانے کتنی داستانیں موجود ہیں اور موجود رہیں گی۔

کتنے عشق و محبت کرنے والے آئے اور آ کر چلے گئے اور ان کی قبروں کے نشانات بھی مٹ گئے مگر ان کی محبت و عشق کی داستانیں آج بھی لوگوں کے دلوں میں ذہنوں میں اور تاریخ کے اوراق میں زندہ ہیں اور ستاروں کی طرح چمکتی ہیں۔

مجاہدہ عباسی ـــ کھرپہ

انتخاب

زاہد شراب پینے دے مسجد میں بیٹھ کر
یا وہ جگہ بتا جہاں پر خدا نہیں
(غالب)

مسجد خدا کا گھر ہے پینے کی جا نہیں
کافر کے دل میں جا وہاں پر خدا نہیں
(اقبال)

کافر کے دل سے آیا ہوں میں یہ دیکھ کر
خدا موجود ہے وہاں اسے پتا نہیں
(فراز)

ارسلان شیخ ـــ میرپور

تین چیزیں

تین چیزیں خلوص دل سے کرنی چاہئیں۔
رحم، کرم، دعا
تین چیزیں کسی کا انتظار نہیں کرتیں۔
موت، وقت، گاہک
تین چیزیں بھائی کو بھائی کا دشمن بنا دیتی ہیں۔
زن، زر، زمین
تین چیزیں پردہ چاہتی ہیں۔
کھانا، دولت، عورت
تین چیزیں پیار اور لگن ضروری ہیں۔
سچائی، فرائض، موت
تین چیزیں انسان کو ذلیل کرتی ہیں۔
چوری، چغلی، جھوٹ
تین قسم کے لوگ تین چیزوں سے پہچانے جاتے ہیں۔
صابر مصیبت پر، بہادر مقابلے پر، بھائی ضرورت پر

امن مقبول جاوید احمد صدیقی ـــ راولپنڈی

ذرا مسکرائیے

ایک سکھ نے تین سوئمنگ پول بنوائے گرم پانی کا ٹھنڈے پانی کا اور ایک خالی۔

دوسرے سکھ نے گرم پانی اور ٹھنڈے پانی والے سوئمنگ پول بنوانے کی وجہ دریافت کی تو وہ بولا۔

جب سردی لگے گی تو گرم میں نہاؤں گا اور جب گرمی لگے گی تو ٹھنڈے میں۔ دوسرے سکھ نے پھر پوچھا۔

مگر یہ خالی سوئمنگ پول کس لیے ہے۔

وہ بولا۔ یار! کبھی کبھی نہانے کو دل نہیں بھی چاہتا۔

ریاض بٹ ـــ حسن ابدال

دو ہیرو نچی بیٹھے آپس میں باتیں کررہے تھے۔
ایک بولا۔ میں نے کل سمندر سے دو لاکھ ٹن وزنی مچھلی پکڑی۔
دوسرا بولا۔ میں نے کل سمندر میں ڈوبی ہوئی تو جلتی ہوئی لالٹین تھی۔
پہلا بولا۔ نہیں تو جھوٹ کہتا ہے۔
دوسرا بولا۔ تو اپنی مچھلی کا وزن کم کردے میں اپنی لالٹین بجھا دوں گا۔

پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی ـــ ملیر کراچی

تعلیم

ہر ترقی یافتہ ملک میں اس کی اپنی زبان ہی ذریعہ تعلیم ہے۔ مگر پاکستان میں ذریعہ تعلیم اردو نہیں انگریزی ہے۔ جس کی وجہ سے یہاں کا معیار تعلیم پست ہے کیونکہ طالب علم اپنا قیمتی وقت علوم سیکھنے کے بجائے انگریزی سیکھنے میں ضائع کردیتے ہیں۔ کسی غیر زبان کو ذریعہ تعلیم بنانا حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ جاپان میں جاپانی، چین میں چینی، انگلستان میں انگریزی، فرانس میں فرانسیسی، جرمن میں جرمن غرض یہ کہ ہر ملک کے اندر وہی زبان ذریعہ تعلیم ہے جس کو سب بخوبی سمجھتے ہیں سوائے پاکستان کے جہاں سب لوگ سمجھتے تو اردو ہیں لیکن یہاں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے اور اسی وجہ سے ہمارا معیار تعلیم پست ہے۔ تعلیم اسی زبان میں اچھی طرح دی جاتی ہے جس کو طالب علم آسانی سے سمجھ سکیں۔ ہمارے یہاں تعلیم اس زبان میں دی جاتی ہے جس کو سمجھنے میں دس سال کا عرصہ لگ جاتا ہے پھر کہیں جا کر صحیح علم سیکھنے کا آغاز ہوتا ہے۔ ہمارے زوال و پستی اور جہالت کا واحد سبب یہی ہے کہ ہم نے اردو کو ذریعہ تعلیم نہیں بنایا اور ہم اپنا قیمتی وقت علم سیکھنے کے بجائے انگریزی سیکھنے میں گنوا دیتے ہیں۔

سفیان اشرف ـــ اوکاڑہ

جسمانی آرائش

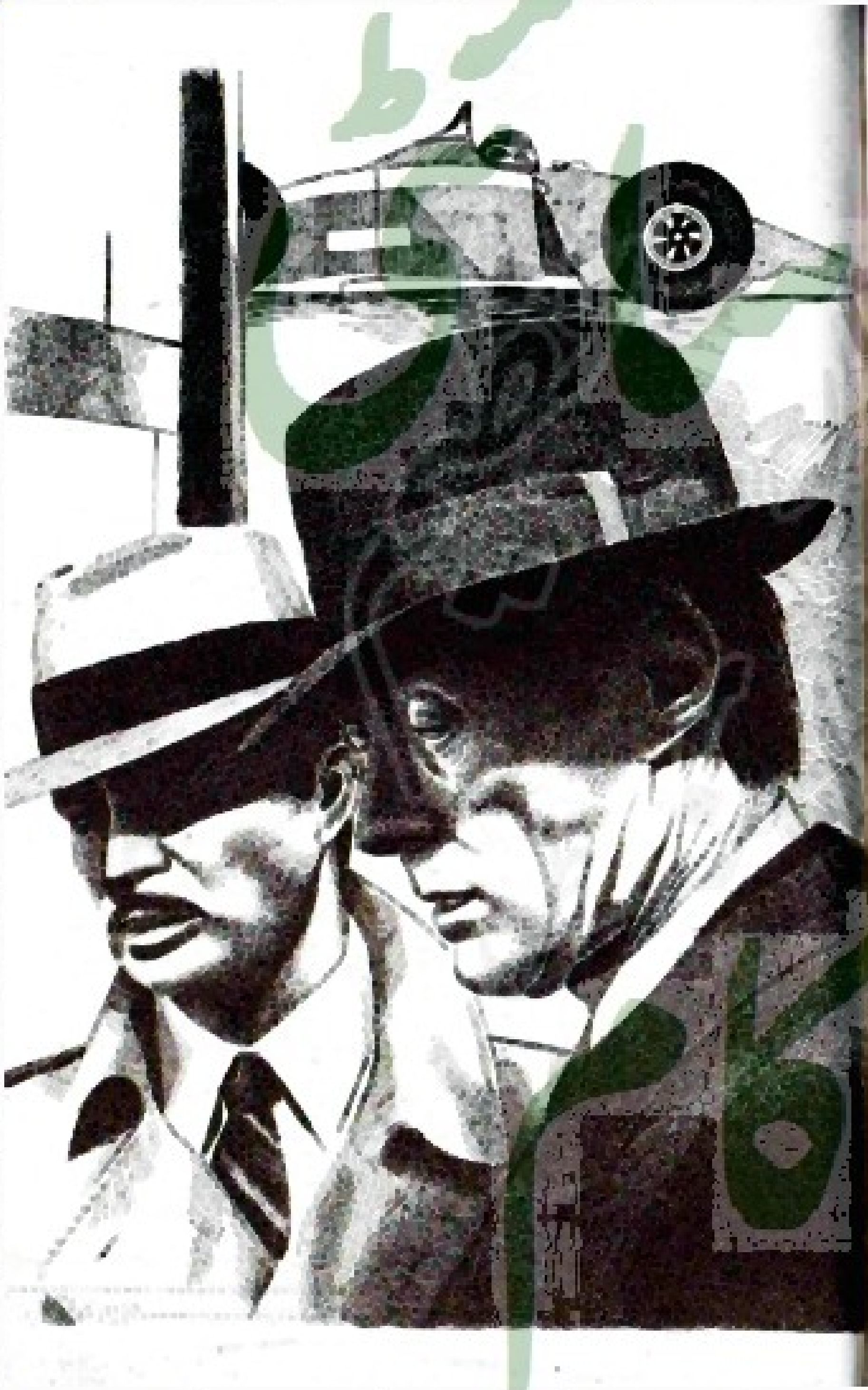
حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ "ہمارے یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ملاقات کی غرض سے تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو دیکھا جو گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس آدمی کے پاس کوئی کنگھا نہیں ہے جس سے یہ اپنے بالوں کو درست کرلیتا؟ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دوسرے آدمی کو دیکھا جس نے میلے کپڑے پہن رکھے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ کیا اس آدمی کے پاس وہ چیز (صابن وغیرہ) نہیں ہے جس سے یہ اپنے کپڑے دھو لیتا۔ (مشکوٰۃ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ "جس شخص کے سر پر بال اور داڑھی کے بال ہوں اس کو چاہیے کہ ان کو اچھی طرح رکھے۔ (ابوداؤد۔ مشکوٰۃ)

مرسلہ شیروز ـــ کراچی

❖

WWW.PAKSOCIETY.COM



خطروں کا کھلاڑی

اے حمید

محترم اے حمید کا دامن نئے افق کے قارئین کے لیے نیا نہیں۔ وہ نئے افق' حجاب اور آنچل کے لیے متعدد سلسلے وار ناول' افسانے اور سفرنامے لکھ چکے ہیں۔ ان کے لکھنے کا ایک منفرد انداز ہے۔ وہ جب لکھتے ہیں تو لفظ بولتے ہیں۔ جب قاری انہیں پڑھنا شروع کرتا ہے تو خود بخود اس ماحول میں پہنچ جاتا ہے بلکہ خود اس کہانی کا کردار بن جاتا ہے۔ منظر کشی میں اے حمید کا کوئی ثانی نہیں۔ جب وہ بارش کی بات میں لکھتے ہیں تو پڑھنے والے کو یہی محسوس ہوتا ہے کہ واقعی کسی میں ... جب وہ خوشی کا تذکرہ کرتے ہیں تو قاری خود کو اس خوشی کی حالت میں محسوس کرتا ہے۔ زیر نظر تحریر ماضی کے ... حال کی ... کا سفرنامہ ہے۔ آج اے حمید ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کی تحریریں انہیں ہمیشہ قارئین کے دلوں میں زندہ رکھیں گی۔ آئیں خطروں کا کھلاڑی پڑھیں بلکہ محسوس کریں۔

میں اٹھا اور واپس چل پڑا۔ چلتے چلتے میں پسینے میں شرابور ہوگیا۔ غار ختم نہیں ہو رہا تھا۔ ایک جگہ غار کی دو شاخیں پھوٹ رہی تھیں۔ اب مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں کس طرف سے آیا تھا۔ بس اللہ توکل ایک طرف مڑ گیا۔ سو ڈیڑھ سو قدم چلا ہوں گا کہ غار بند ہوگیا۔ آگے دیوار آ گئی۔ گھبرا کر واپس مڑا اور جلدی جلدی اسی جگہ واپس آ گیا جہاں سے غار کی دو شاخیں پھوٹتی تھیں۔ اب میں دوسرے غار میں مڑ گیا۔ یہ غار بھی آگے جا کر بند ہو جاتا تھا۔ سخت پریشانی کے عالم میں پھر اسی جگہ پر واپس آ گیا۔ پریشانی مجھے اس بات کی تھی کہ پیچھے جانے کا اب کوئی راستہ نہیں تھا۔ دونوں غار آگے جا کر بند ہو جاتے تھے۔ سخت حیران تھا کہ اگر غار بند ہو جاتے ہیں تو میں کس طرف سے آیا تھا؟

کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ عجیب تذبذب اور حیرانی پریشانی کے عالم میں ایک بار پھر میں سامنے کی طرف غار میں تیز تیز چلنے لگا۔ اندر سے میں گھبرا گیا تھا اور پچھتانے لگا تھا کہ میں نے لڑکی کے پیچھے ٹرین سے اترنے کی حماقت کیوں کی۔ مگر اب پچھتانا بیکار تھا۔

میں ایڈونچر پسند ضرور تھا مگر زمین کے اندر قبر کی طرح بند غار کے ایڈونچر کی میں نے کبھی خواہش نہیں کی تھی۔ یہ تو مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ میں کسی عذاب میں پھنس گیا ہوں۔ میں نے اپنے حواس کو کسی حد تک اپنے قابو میں کر لیا تھا اور سوچ سمجھ کر اور ایک ایک قدم پر دائیں بائیں دیکھ دیکھ کر آگے بڑھ رہا تھا۔

میں نے دیکھا کہ ایک جگہ غار کی دیوار میں ایک طاق سا بنا ہوا تھا۔ یہ طاق لکڑی کا نہیں تھا۔ پتھر کا تھا۔ میں رک کر اسے جھک کر دیکھنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ یہ طاق پتھر میں سے تراش کر بنایا ہوا ہے۔ میں نے اسے ہاتھ لگا کر آگے کو دبایا تو ہلکی سی گڑگڑاہٹ کی آواز کے ساتھ طاق کی پتھر کی سل اپنی جگہ سے ایک طرف گھوم گئی۔ میں نے ذرا آگے ہو کر دیکھا۔ طاق کی دوسری طرف اندھیرے میں پتھر کی سیڑھیاں نظر آ گئیں جو اوپر کو جا رہی تھیں۔ اس خیال سے کہ شاید یہیں سے باہر جانے کا کوئی راستہ مل جائے میں طاق کے اندر داخل ہوگیا اور زینے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

جیسے ہی میں نے زینے پر قدم رکھا طاق کی سل اپنے آپ بند ہوگئی۔ سیڑھیوں میں اندھیرا ہوگیا۔

میں نے جلدی سے پیچھے مڑ کر طاق کی سل کو زور سے دبایا کہ سل اپنی جگہ سے ہٹے اور میں اوپر جانے کی بجائے طاق میں سے نکل کر واپس غاروں میں ہی چلا جاؤں۔ جب دیکھا کہ سل کی طرف سے کھلتی ہی نہیں تو ایک بار تو موت آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ جہاں میں کھڑا تھا وہاں گھپ اندھیرا تھا۔ دیوار کو ٹٹول کر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ دس پندرہ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد زینہ ختم ہو گیا۔ میں نے ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھا آگے دیوار نہیں بلکہ کھڑکی کا دروازہ تھا۔ میں نے اسے باہر کی طرف دھکیلا تو وہ کھل گیا۔

دوسری طرف سے تازہ ہوا کا جھونکا آیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک اونچی چھت والا کافی کشادہ دالان ہے جس میں کئی ستون زمین سے چھت تک چلے گئے ہیں۔ میں دالان میں داخل ہو گیا۔ وہاں ویسی ہی ہلکی ہلکی روشنی تھی جیسی غاروں میں پھیلی ہوئی تھی۔

میں نے دیکھا کہ دالان کی دیواروں میں طاق بنے ہوئے ہیں جن میں عورتوں کی پتھر کی مورتیاں رکھی ہوئی ہیں۔ مورتیوں کی تمام عورتوں کی شکلیں الگ الگ تھیں۔ سب کے بالوں کے جوڑے بنے تھے۔ سب نے ہاتھ جوڑ رکھے تھے اور آنکھیں بند تھیں۔ عجب تماشا تھا۔ میں نے مورتیوں کو وہیں چھوڑا اور وہاں سے نکلنے کا راستہ تلاش کرنے لگا۔

لیکن دالان کی دیواریں چاروں طرف سے بند تھیں۔ کسی جگہ کوئی کھڑکی یا دروازہ نہیں تھا لیکن میں نے مایوس ہونے کی بجائے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ چاہے کچھ ہو جائے میں یہاں سے نکل کر رہوں گا۔ میں جھک کر دیواروں کا جائزہ لینے لگا کہ شاید کسی جگہ باہر نکلنے کا کوئی خفیہ راستہ ہو۔ باہر جانے کا تو کوئی خفیہ راستہ نہ ملا لیکن اوپر جانے کا ایک اور زینہ نکل آیا۔ وہ اس طرح کہ ایک جگہ مورتی کے پیچھے دیوار کے ساتھ پتھر کی ایک سل لگی ہوئی نظر آئی۔

میں نے اسے ایک طرف ہٹایا تو اس کے اندر ایک زینہ اوپر کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے شگاف میں سر ڈال کر اوپر کی جانب دیکھا۔ سب سے اوپر والی سیڑھی پر ہلکی روشنی تھی۔ یہ سوچ کر میں شگاف میں داخل ہو گیا کہ شاید اس زینے سے باہر نکلنے کا کوئی سبب بن جائے۔ یہ ایک اوپر اٹھی ہوئی سرنگ تھی جس کی دیواروں میں سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔

میں دونوں پاؤں ایک جگہ لگا لگا کر زینے پر چڑھنے لگا۔ آخری سیڑھی پر پہنچ کر میں نے سر باہر نکال کر دیکھا تو ایک اور دالان تھا جو پچھلے دالان سے چھوٹا تھا۔ میں شگاف سے باہر نکل آیا اور دالان کا جائزہ لیا۔ دالان میں روشنی نیچے والے دالان سے بہت ہی کم تھی اور اندھیرا اندھیرا سا تھا۔ اس نیم تاریکی میں مجھے دالان کے وسط میں ایک تابوت نما بکس پڑا دکھائی دیا۔ اسے دیکھ کر مجھ پر خوف طاری ہو گیا کہ خدا جانے اس تابوت کے اندر کیا ہے۔

دالان میں صرف وہی ایک تابوت تھا۔ باقی کچھ بھی نہیں تھا۔ چھت قدرے نیچی تھی اور اس میں مکڑی کے جالے نیچے تک لٹکے ہوئے تھے۔ عجب پراسرار اور ڈراؤنا ماحول تھا۔ میں نے سوچا شاید اس تابوت کے اندر سے کوئی راستہ ان منحوس غاروں سے باہر نکلتا ہو۔ میں ڈرتے ڈرتے تابوت کے قریب گیا اور نیم اندھیرے میں جھک کر بڑے غور کے ساتھ تابوت کو دیکھا۔

تابوت کے اوپر بھی ایک عورت کی ابھری ہوئی شکل بنی تھی۔ اس عورت کا بھی جوڑا تھا اور ماتھے پر بندیا بنی تھی۔ میں نے تابوت کو کھولنے کی بہت کوشش کی مگر اس کا ڈھکنا اپنی جگہ سے ذرا بھی نہیں ہلا۔ ایسے لگ رہا تھا کہ ڈھکنا مضبوط کیلوں سے بند

کر دیا گیا ہے۔ تابوت پتھر کا نہیں تھا۔ یہ لکڑی کا تھا۔ مجھے اس قبر کے چھوٹی والے حصے میں کچھ ہوئی مگر بڑی دہشت ناک شکلیں یاد آنے لگیں اور خوف سے میرا حلق خشک ہونا شروع ہو گیا۔

میں نے تابوت سے ہٹ کر دالان کی دیواروں کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھا۔ دیواریں پتھر کی تھیں۔ نہ کہیں کوئی کھڑکی یا طاق تھا اور نہ کوئی روشندان تھا۔ تعجب کی بات ہے کہ تازہ ہوا وہاں بھی محسوس ہو رہی تھی اور سانس لینے میں کوئی تکلیف یا دقت محسوس نہیں ہو رہی تھی لیکن باہر جانے کا راستہ کہیں نہیں مل رہا تھا۔ کسی وقت خیال آتا کہ یہی جگہ میرا مدفن بن جائے گی اور میری لاش تک کسی کو نہیں مل سکے گی۔

ٹرین میں بیٹھی ہوئی اس آنکھوں والی لڑکی پر مجھے کسی چڑیل کا شک ہونے لگا جو مجھے اپنی مسکراہٹ کے جال میں پھنسا کر اس جہنم میں لے آئی تھی۔ کسی وقت سوچتا کہ نہیں اس میں اس لڑکی کا کیا قصور ہے۔ یہ سب تو مجھے میرے گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔ مجھے اپنے آپ کو ہندو ظاہر نہیں کرنا چاہیے تھا۔

اگر میں اپنے آپ کو ہندو ظاہر نہ کرتا تو بڑی آسانی سے واپس آ جاتا کہ ان منحوس غاروں میں آنے سے انکار کر سکتا تھا لیکن مجھے میرا اشتیاق لے ڈوبا تھا کہ دیکھوں ان پراسرار غاروں کی سیر کی جائے۔ اب میں ایک طرف ہٹ کر دیوار کے ساتھ بیٹھ گیا اور خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگا کہ میں مسلمان ہوں اور اپنے آپ کو ہندو ظاہر کر کے میں نے گناہ کیا ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہاں سے نیچے بڑے دالان میں آنے کا بھی کوئی فائدہ نہ تھا۔ میں تھک چکا تھا۔ اوپر سے مایوسی اور بے بسی دل و دماغ پر چھا رہی تھی۔ مجھ پر غنودگی چھانے لگی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔ میں سو گیا تھا۔ پتہ نہیں پانچ

دس منٹ سویا ہوں گا یا ایک گھنٹے تک سوتا رہا تھا کہ اچانک ایک عجیب سی آواز نے مجھے جگا دیا۔

میں آنکھیں کھول کر نیم اندھیرے میں ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ یہ آواز کیسی تھی اور کہاں سے آئی تھی۔ یہ ایسی آواز تھی جیسے کوئی صدیوں سے بند دروازہ کھلتے وقت چرچرایا ہو۔ مگر وہاں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ کچھ بھی نہیں تھا۔ دیواریں اسی طرح اپنی جگہ پر ساکت کھڑی تھیں۔ دالان کے وسط میں تابوت بھی ویسے کا ویسا پڑا تھا۔ وقت کا کچھ اندازہ نہیں تھا کہ دن ہے یا شام ہے یا رات ہے۔ بس ایک پھیکا سا اندھیرا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں اور دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگا کہ شاید اس طرح سے پریشان ذہن کو تھوڑا سا سکون ملے۔ ابھی میں نے آنکھیں بند ہی کی تھیں کہ وہی چرچراہٹ کی آواز پھر سنائی دی۔ میں نے بیٹھے بیٹھے جلدی سے آنکھیں کھول لیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ تابوت کا ڈھکنا آہستہ آہستہ اپنے آپ اوپر اٹھ رہا ہے۔

دہشت کے مارے میرا جسم سرد پڑ گیا۔ میں اٹھ کر وہاں سے بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ حلق خشک ہو کر لکڑ ہو گیا۔ میں ٹکٹکی باندھے تابوت کو دیکھ رہا تھا۔ تابوت کا ڈھکنا آہستہ آہستہ کھلتے کھلتے ایک طرف کو ڈھلک گیا اور چاروں طرف گہرا سناٹا چھا گیا۔ یہ بڑا گہرا سرد اور ڈراؤنا سناٹا تھا۔ میرا دل ایسے دھڑک رہا تھا جیسے ابھی اچھل کر باہر آ جائے گا۔

میری نظریں تابوت پر جمی ہوئی تھیں۔

میرے دیکھتے دیکھتے تابوت میں سے نسواری رنگ کے دھوئیں کا غبار سا نکلنے لگا۔ یہ دھواں مکڑی کے جالے کی طرح کا تھا۔ ہلکا اور ٹھہرا ٹھہرا سا۔

تابوت کے اوپر آ کر وہ مکڑی کے جالے کی طرح تن گیا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ تابوت میں سے ایک انسانی سر آہستہ آہستہ باہر نکل کر اوپر اٹھنا شروع ہو گیا۔

یہ ایک عورت کا سر تھا جس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ عورت کا جسم بہت بڑا تھا۔ یہ اوپر ہی اوپر اٹھتا چلا گیا۔ پھر اس کا سر چھت کے ساتھ لگ گیا۔ وحشت کے مارے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ وہاں سے بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں تابوت سے ہٹ کر دیوار کے ساتھ لگا کھڑا ہوا تھا۔ جہاں ایک تو اندھیرا تھا اور دوسرے میرے آگے ساتھ ساتھ لگے ہوئے دو ستون تھے۔

میں نے سمٹ کر اپنے آپ کو ستونوں کی اوٹ میں کر لیا کہ اس تابوت والی بلا کی مجھ پر نظر نہ پڑے۔ مجھے یقین تھا کہ اگر اس بلا کی مجھ پر نظر پڑ گئی تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی۔

وہ مکروہ عورت ایک بہت بڑے اور لمبے لمبے جن کی طرح تابوت سے آدھی باہر نکلی ہوئی تھی اور اس کا سر چھت کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ گھوم کر میری طرف ہو گئی۔ میں مزید سکڑ کر ستونوں کے پیچھے ہو گیا۔ اس کا چہرہ اب میری طرف تھا۔ مجھے اس کا چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ صرف اس کی آنکھیں نظر آ رہی تھیں جہاں دو سیاہ سوراخ تھے۔ اور اس کے کان اس کے کندھوں تک لٹکے ہوئے تھے۔ منہ کے کونوں میں سے دو نوکیلے دانت نکل کر نیچے کی طرف مڑے ہوئے تھے۔

خوف کے مارے مجھے پسینے آ رہے تھے۔ میں سانس لیتے ہوئے بھی ڈر رہا تھا۔ خدا جانے کیا وجہ تھی کہ ابھی تک اس نے مجھ پر حملہ نہیں کیا تھا۔ شاید میں اسے نظر نہیں آ رہا تھا کیونکہ اس کی آنکھیں نہیں تھیں۔ آنکھوں کی جگہ دو سیاہ گڑھے نظر آ رہے تھے۔ مجھے اس بلا کے سانس لینے کی صرف آواز آ رہی تھی۔ وہ پیچھے ہوئی اور پھر تابوت میں بیٹھ گئی۔

اب اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ تابوت میں سے باہر نکل آئی۔ میں نے دیکھا کہ اس کا نیچے کا دھڑ غائب تھا۔ اس کی دونوں بانہیں لٹک رہی تھیں۔ اس کا اوپر کا دھڑ ہوا میں لٹکا ہوا تھا اور آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میرا خون خشک ہو گیا تھا۔ جسم پر موت کی سی بے حسی طاری ہونے لگی تھی۔ میں نے چیخ مارنی چاہی لیکن میری آواز نہ نکل سکی۔ یہ کوئی چڑیل ہی ہو سکتی تھی۔ وہ میرے بالکل سامنے آ کر رک گئی۔ اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ اس کا اب بھی مجھ سے سات آٹھ فٹ کا فاصلہ تھا۔ اس کا بازو لمبا ہوتا گیا اور پھر اس کا لمبے لمبے ناخنوں والا ہاتھ میری گردن کی طرف بڑھا۔ میں نیم بے ہوش ہو چکا تھا۔

اس عورت نما چڑیل نے مجھے گردن سے پکڑ کر زمین سے اوپر اٹھا لیا تھا۔ اب میں بھی اس کے ساتھ ہوا میں لٹکنے لگا تھا۔ اس کے حلق سے عجیب قسم کی دبی دبی آوازیں نکل رہی تھیں۔ وہ مجھے اسی طرح اٹھائے تابوت کے پاس لے آئی۔ پھر اس نے مجھے تابوت میں پھینک دیا۔ میں چھوٹے چھوٹے پتھروں کے اوپر گرا۔ تابوت کی تہہ میں پتھر بچھے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس بلا کے حلق سے ایک بھیانک چیخ کی آواز نکلی جس کے ساتھ ہی میری بھی چیخ نکل گئی۔

اس بلا نے زور سے تابوت کا ڈھکنا بند کر دیا۔ تابوت کے اندر گھپ اندھیرا ہو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے مجھے قبر میں زندہ دفن کر دیا گیا ہو۔ باہر خاموشی چھا گئی تھی۔ جس بلا نے مجھے تابوت میں بند کیا تھا اس کے سانس لینے کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ تابوت کے اندر میرا دم گھٹنے لگا۔ میں نے دو تین لمبے لمبے سانس

لیے اور تابوت کی چھت پر زور زور سے ہاتھ مارنے لگا۔ میں نے دو تین بار ڈھکنے کو اٹھانے کی کوشش کی مگر وہ اس طرح بند ہو گیا تھا جیسے اب کبھی نہیں کھلے گا۔

میں تابوت کی چھت اور دیواروں پر ہاتھ بھی مار رہا تھا اور چلا بھی رہا تھا کہ مجھے باہر نکالو۔ مجھے باہر نکالو۔ اچانک مجھے کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں خاموش ہو گیا۔ کوئی تابوت کے قریب آ رہا تھا۔ سوائے اس مکروہ بلا کے اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے اپنی حالت پر رونا آ رہا تھا کہ میں خواہ مخواہ کیوں اسٹیشن پر ٹرین سے اتر گیا اور اگر اتر بھی گیا تھا تو مجھے بوڑھے کے ساتھ ان کھنڈروں کو دیکھنے نہیں آنا چاہیے تھا۔ باہر سے کسی عورت کی آواز آئی۔

"گھبراؤ نہیں۔ میں تابوت کھول رہی ہوں۔"

یہ آواز کسی عام عورت کی تھی۔ اس بلا کی آواز نہیں تھی۔ میں کان لگا کر سننے لگا۔ باہر سے تابوت کا ڈھکنا کھل گیا۔ ڈھکن کے اٹھتے ہی ایک دم دن کی روشنی ہو گئی۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دالان میں دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میرے سامنے ایک لڑکی ہاتھ میں چھڑی لیے کھڑی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں نے اسے کہیں دیکھا تھا۔ میں چونک پڑا۔ یہ وہی ٹرین والی اداس آنکھوں والی لڑکی تھی جس کے عشق میں دیوانہ ہو کر میں ٹرین سے اتر کر اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا تھا اور آخر اس مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ لڑکی بھی مجھے حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے بھی مجھے پہچان لیا تھا۔ کہنے لگی۔

"تم ریل گاڑی میں تھے۔ یہاں کیسے آ گئے؟"

میں نے کیا کہنا کہ میں وہاں کیسے آ گیا تھا۔ میں تابوت سے باہر نکل آیا تھا۔ دالان کا سارا ماحول ہی بدل گیا تھا۔ اندھیرا غائب ہو گیا تھا۔ دیواروں کے اوپر قدیم طرز کے روشندان کھل گئے تھے جن میں سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ چھت کے ساتھ پہلے جو جالے لٹک رہے تھے وہ اب غائب ہو گئے تھے۔ میں نے لڑکی سے پوچھا۔

"میں کہاں ہوں؟"

اس نے کہا۔

"تم بوگی مت کی پہاڑی والے پرانے مندر میں ہو۔ میں پہاڑی پر جڑی بوٹیاں اکٹھی کرنے آئی تھی کہ مندر میں سے کسی کے چلانے کی آواز سن کر ادھر آ گئی۔"

میں نے کہا۔

"سب سے پہلے مجھے یہاں سے باہر نکالو۔"

وہ مجھے لے کر دالان کی طرف گئی تو وہاں دروازہ تھا جس کے کواڑ نہیں تھے۔ باہر دن کی روشنی ہی روشنی تھی۔ میں سوچنے لگا یہ سب کچھ جو میرے ساتھ ہوا ہے کہیں میں نے دن کے وقت کوئی ڈراؤنا خواب تو نہیں دیکھا۔ پہاڑی کی ڈھلان اتر کر ہم نیچے آ گئے۔ میں نے لڑکی سے کہا۔

"یہاں جو شمشان بھومی ہے اس کے پاوے کا لڑکا ہے وہ مجھے رام حق کے غار دکھانے لایا تھا۔ وہ غار کس طرف ہیں؟"

لڑکی کہنے لگی۔

"وہ ٹیلے کی دوسری طرف ہیں۔ چلو میں تمہیں وہاں لے چلتی ہوں۔"

میں نے پوچھا۔

"اس مندر میں تابوت کیوں پڑا ہے۔ مندروں میں تو مورتیاں ہوتی ہیں۔ یہ تابوت کہاں سے آ گیا؟"

لڑکی ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر کہنے لگی۔

"تمہیں اس طرف نہیں جانا چاہیے تھا۔"

ہم ٹیلے کی ڈھلان پر اس جگہ آ گئے جہاں سے

غار شروع ہوتے تھے۔ باہر بے دیو کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔

"تم کہاں چلے گئے تھے۔ میں نے تمہیں بڑا تلاش کیا۔"

میں نے کہا۔

"تمہارے غاروں میں بھٹک گیا تھا۔ اس نے مجھے باہر نکالا ہے۔"

"کس نے؟"

بے دیو نے پوچھا۔

□ □ □

میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ آنکھوں والی لڑکی وہاں نہیں تھی۔ وہ تو جیسے کسی چھلاوے کی طرح اچانک غائب ہو گئی تھی۔ بے دیو حیران تھا کہ مجھے کون سی لڑکی غاروں میں سے نکال لائی ہے اور میں حیران ہو رہا تھا کہ وہ آنکھوں والی جو لڑکی مجھے تابوت میں سے نکال کر لائی تھی وہ کہاں غائب ہو گئی ہے۔ بے دیو نے پوچھا۔

"تم کس لڑکی کی بات کر رہے تھے؟"

میں نے اسے اس آنکھوں والی لڑکی کا حلیہ بتایا تو میں نے دیکھا کہ اس لڑکے کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ کہنے لگا۔

"وہ تمہیں کہاں ملی تھی؟"

میں نے اس سے بہت کچھ چھپا لیا۔ صرف اتنا بتایا کہ یہ لڑکی مجھے پوجا مت پہاڑی کی دوسری جانب ملی تھی اور اس نے مجھے یہاں تک کا راستہ بتایا تھا۔ بے دیو خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد کہنے لگا کہ

"میرے ساتھ گھر چلو۔"

وہ مجھے اپنے شمشان بھومی والے وارڈ میں لے گیا۔ اس نے دروازہ بند کر لیا اور کہنے لگا۔

"اس مکان سے باہر مت نکلنا۔ میں پجاری کو بتاتا ہوں۔"

میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"آخر بات کیا ہے۔ مجھے بھی تو بتاؤ۔ تم یہ سب کچھ کس لیے کر رہے ہو؟"

بے دیو بولا۔

"تم بڑے خوش قسمت ہو کہ اس لڑکی نے تمہیں کچھ نہیں کہا اور تم جان بچا کر آ گئے۔"

بے دیو کی باتوں سے اس لڑکی کے بارے میں میری حیرانی اور میرا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔

میں نے پوچھا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

بے دیو بولا۔

"موہن بھیا! وہ لڑکی جو تمہیں غاروں میں سے نکال کر لائی تھی وہ ایک بھٹکی ہوئی آتما ہے۔ اس کا نام ترشنا ہے۔ وہ جس آدمی کو دکھائی دیتی ہے وہ آدمی اگلے روز مر جاتا ہے۔ اگر نہ مرے تو ترشنا کی بھٹکی ہوئی آتما خود آ کر اسے مار ڈالتی ہے۔ اب تم یہاں سے باہر نہ نکلنا۔ میں پجاری جی کو لا کر تم پر ایسا جادو ٹونہ کروں گا کہ ترشنا تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔"

اس سے پہلے کہ میں بے دیو سے کچھ اور پوچھتا وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ میں حیرت میں گم ہو گیا اور سوچنے لگا کہ کیا واقعی یہ لڑکی بھٹکی ہوئی روح ہے؟ اور جس کسی کو ملتی ہے وہ اگلے روز مر جاتا ہے اور اگر نہ مرے تو وہ خود آ کر اسے ہلاک کر دیتی ہے۔ مسلمان ہونے کی وجہ سے یہ ساری کہانی مجھے جھوٹی لگ رہی تھی۔ ہندو لوگوں کا عقیدہ بڑا کمزور ہوتا ہے۔ وہ اس قسم کے توہمات پر بڑی جلدی یقین کر لیتے ہیں۔ مجھے بے دیو کی باتوں پر حیرانی ضرور ہوئی مگر یقین بالکل نہیں آیا تھا۔ یہ کہانی مجھے الف لیلیٰ کی کسی کہانی کی طرح لگی مگر یہ کہانی ہی تھی۔ محض ایک کہانی تھے

لوگوں نے اپنی طرف سے مبالغہ شامل کر کے کچھ کا کچھ بنا دیا تھا۔ اس قسم کی من گھڑت اور مبالغہ آمیز کہانیاں میں پہلے بھی ان علاقوں میں ہندو لوگوں کی زبانی بہت سن چکا تھا۔

اتنے میں بے دیو اپنے بوڑھے باپ کو لے کر آ گیا۔ اس نے اس آنکھوں والی لڑکی ترشنا کے بارے میں جو کہانی سنائی وہ یوں تھی کہ ترشنا کے ماں باپ بچپن میں ہی مر گئے تھے۔ وہ گاؤں کی رہنے والی تھی اور اپنے ماں باپ کی واحد اولاد تھی۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد اس کے دادا نے اس کی پرورش کی۔ جب وہ جوان ہوئی تو دادا نے گاؤں کے ایک لڑکے کے ساتھ اس کا بیاہ کر دیا۔ شادی کی پہلی رات اس کا خاوند مر گیا۔ اس گاؤں کے لوگ پرانی رسومات کے بڑی سختی سے پابند تھے اور ان میں یہ طے تھا کہ اگر کسی عورت کا خاوند شادی کی پہلی رات مر جاتا تھا تو اس کی نوبیاہتا دلہن کو اپنے خاوند کی چتا پر بیٹھ کر ستی ہونا پڑتا تھا۔ یعنی اسے خاوند کے مردے کے ساتھ خود بھی جل جانا پڑتا تھا لیکن ترشنا نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے خاوند کے ساتھ جل کر نہیں مرے گی۔ چنانچہ جب ترشنا کے خاوند کی لاش کو جلانے کے لیے شمشان کی طرف لے جانے لگے تو ترشنا گھر سے بھاگ گئی۔ گاؤں والے اس کے پیچھے ہو گئے۔ وہ سامنے پہاڑی کی گھاٹ پر جا کر رک گئی اور ترشنا چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ میں ستی نہیں ہونا چاہتی۔ مجھے آگ میں مت ڈالو۔ میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ مگر وہاں اس کی فریاد کون سنتا۔ اس کا بوڑھا دادا بھی اسے نہیں بچا سکا تھا۔ چنانچہ لوگوں نے ترشنا کو زبردستی اٹھا کر چتا کی لکڑیوں پر ہاتھ پاؤں باندھ کر اس کے خاوند کی لاش کے ساتھ لٹا دیا اور اس کے اوپر گھی چھڑک کر آگ لگا دی۔ کہتے ہیں کہ آگ لگتے ہی ترشنا کی خوفناک چیخ بلند ہوئی اور وہ تڑپ کر بالکل سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اس کے دونوں ہاتھ پاؤں لوہے کے تار سے بندھے ہوئے تھے۔ اس کے کپڑوں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ شعلے اس کے جسم کو چاٹ رہے تھے۔ لوگوں نے دیکھا کہ ترشنا آگ کے گولے کی طرح چتا کے اوپر گھومنے لگی اور گھومتے گھومتے وہاں کھڑے لوگوں کی طرف بڑھی۔ اس کی چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ لوگ جوتیاں چھوڑ کر بھاگ اٹھے۔ لڑکی ترشنا کے سارے جسم کو آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ گولے کی طرح گھوم رہی تھی۔ گھومتے گھومتے وہ شمشان گھاٹ کے احاطے میں چکر لگانے لگی۔ پھر وہ زمین پر گر پڑی اور جل کر راکھ ہو گئی۔ اس کی راکھ اور ہڈیاں ساری رات وہیں پڑی رہیں۔ صبح اس کا بوڑھا دادا اپنی پوتی کے پھول یعنی ہڈیاں اور راکھ لینے آیا تاکہ وہ انہیں دریا میں بہا سکے۔ اس کے ہاتھ میں مٹی کا چھوٹا سا گھڑا تھا۔ بے دیو کا باپ اسے اس جگہ لے گیا جہاں اس کی پوتی ترشنا آگ کے شعلوں میں لپٹی زمین پر گر کر جل کر راکھ ہو گئی تھی۔ وہاں ترشنا کی ہڈیاں اور راکھ پڑی تھی۔ بے دیو کا باپ شلوک وغیرہ پڑھتے ہوئے ترشنا کے پھول اٹھا کر مٹی کے مٹکے میں ڈالنے لگا۔ بے دیو کے باپ کا کہنا ہے کہ جب وہ ترشنا کی ساری ہڈیاں اور راکھ سمیٹ کر برتن میں ڈال چکا تو اس نے جہاں ترشنا جل مری تھی ترشنا کو زمین پر لیٹے ہوئے دیکھا وہ ڈر کے پیچھے ہٹ گیا۔ ترشنا کے دادا نے پوچھا۔

"کیا ہوا پجاری جی؟"

بے دیو کے پجاری باپ نے اس وقت تو ترشنا کے دادا کو کچھ نہ بتایا صرف اتنا ہی کہا کہ وہ یونہی ڈر گیا تھا لیکن بعد میں اس نے اپنے بیٹے بے دیو کو بتایا کہ اس نے جہاں ترشنا جل کر مری تھی وہاں ترشنا کو

بالکل زندہ حالت میں دیکھا تھا۔ اس کا چہرہ سیاہ تھا اور بال جل چکے تھے۔ اس نے ایک بھیانک چیخ مار کر بے دیو کے باپ سے کہا تھا کہ میں تم لوگوں سے اپنی جان کا بدلہ لوں گی اور پھر غائب ہو گئی۔ بے دیو کے باپ نے بتایا کہ اب بھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ترشنا بالکل زندہ حالت میں اپنے دادا کے ساتھ ٹرین میں بیٹھ کر اپنے گاؤں آتی ہے حالانکہ اس کا دادا بھی مر چکا ہے۔ گاؤں کے اسٹیشن پر اتر کر وہ دادا کے ساتھ ہی سوار ہو کر اپنے گاؤں کی طرف آ جاتی ہے۔ اس دوران اسے کوئی نہیں دیکھتا۔ وہ کسی کو نظر نہیں آتی سوائے اس کے کہ کسی کو نظر آتا ہے۔ جو کوئی اس کو دیکھ لیتا ہے وہ اس کے دوسرے ہی دن مر جاتا ہے۔ اگر زندہ رہے تو ترشنا کی آتما خود آ کر اسے مار ڈالتی ہے۔ بے دیو کا باپ کہنے لگا۔

"اس واقعے کو چار سال بیت گئے ہیں۔ ان چار سالوں میں ترشنا کی بھٹکی ہوئی آتما گاؤں کے صرف تین آدمیوں کو نظر آئی تھی۔ وہ تینوں کے تینوں اگلے روز مر گئے تھے۔"

میں نے بے دیو کے باپ کو بتایا کہ ترشنا کی بھٹکی ہوئی روح مجھے ریل گاڑی میں بھی اپنے دادا کے ساتھ نظر آئی تھی اور میں نے اسے بیل گاڑی میں بھی گاؤں کی طرف جاتے دیکھا تھا۔

بے دیو کے باپ نے پوچھا۔

"ریل گاڑی میں کیا وہ تمہیں دیکھ کر مسکرائی تھی؟"

میں نے کہا۔

"ہاں جب ٹرین اسٹیشن پر رکی تھی اور وہ اپنے دادا کے ساتھ ڈبے سے اترنے لگی تھی تو اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا تھا اور وہ مسکرائی تھی۔"

"اس کے بعد آج جب وہ تمہیں یوگی مت کے غار کے باہر ملی تھی تو اس نے تم سے کوئی بات کی تھی؟"

میں نے کہا۔

"ہاں۔ اس نے کہا تھا کہ میں اوم جڑی بوٹیوں کی تلاش میں آئی ہوں۔ آؤ میں تمہیں راستہ دکھاتی ہوں اور وہ مجھے وہاں لے آئی تھی جہاں بے دیو پہلے سے موجود تھا۔"

بوڑھے پجاری نے گھبرا کر بے دیو سے پوچھا۔

"بے دیو تم نے تو ترشنا کی آتما کو نہیں دیکھا؟"

بے دیو بولا۔

"نہیں پتا جی وہ مجھے نظر نہیں آئی تھی۔"

میں نے بوڑھے سے کہا۔

"بے دیو کے پاس پہنچنے کے بعد جب میں نے اسے بتایا کہ مجھے یہ لڑکی غار سے نکال کر لائی ہے تو بے دیو نے پوچھا تھا کہ کون سی لڑکی؟ میں نے گردن موڑ کر کہا تھا کہ یہ لڑکی اور اس وقت ترشنا کی بھٹکی روح غائب ہو چکی تھی۔"

بوڑھے نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا۔

"بے بھگوان! تیری بڑی کرپا ہے کہ اس منحوس آتما نے میرے بیٹے کو نہیں دیکھا نہیں تو میرا بیٹا بھی موت کے منہ میں چلا جاتا۔"

تب بوڑھے نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"موہن! تم بڑی بھاری مصیبت میں پھنس چکے ہو۔ ترشنا کی آتما نے تمہیں صرف دیکھا ہی نہیں ہے بلکہ تم سے باتیں بھی کی ہیں۔ اب تمہارا زندہ رہنا ناممکن ہے۔"

میں ان کی اس قسم کی باتوں پر دل میں ہنس رہا تھا لیکن میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میرے دل میں اس وقت یہ خوف بھی سر اٹھانے لگا تھا کہ کہیں واقعی ترشنا کی آتما مجھے ہلاک نہ کر دے۔ ایک تو میری عمر چھوٹی تھی، دوسرے میرے ساتھ اس قسم کے واقعات کا کوئی تجربہ ہی نہیں تھا۔ میرا اپنے رب العالمین پر ایمان بھی

پختہ تھا مگر قضائے بشری اور کم عمری کے باعث میں دل میں ڈر بھی رہا تھا کہ کہیں میں ان کفار کے توہمات اور جادو ٹونے کے چکر میں پھنس کر تو نہ مارا جاؤں۔ میرے ضمیر میں یہ کانٹا بھی کھٹک رہا تھا کہ میں نے اپنے آپ کو ہندو ظاہر کر کے بہت بڑا گناہ کیا ہے چنانچہ میں دل میں بار بار خدا سے اپنے گناہ کی معافی مانگ رہا تھا۔ چنانچہ جب بوڑھے پجاری نے کہا۔

"موہن! تم میرے بیٹے کے دوست ہو۔ میں ترشنا کی آتما سے تمہیں بچانے کی پوری پوری کوشش کروں گا۔ میں کچھ منتر پڑھ کر اس کوارٹر کے اردگرد پھونک دوں گا۔ ان منتروں کی طاقت کے اثر سے کل ترشنا کی بدروح اس کوارٹر میں داخل نہ ہو سکے گی اور تم پر حملہ نہیں کر سکے گی۔"

میں بھی ان لوگوں کی مشرکانہ باتوں سے متاثر ہو گیا تھا۔ میں نے کہا۔

"لیکن اس کے بعد بھی وہ مجھے ہلاک کر سکتی ہے۔ میں کہاں کہاں اس بدروح سے اپنے آپ کو بچاتا پھروں گا۔"

بے دیو کے باپ نے کہا۔

"اس کا علاج اس کا اپائے بھی میرے پاس ہے۔ میں تمہیں منتر پھونک کر ایک مہرہ دے دوں گا۔ وہ مہرہ تم اپنی جیب میں بڑی حفاظت سے رکھنا۔ جب تک یہ مہرہ تمہارے پاس رہے گا ترشنا کی آتما تمہارا بال بھی بیکا نہ کر سکے گی۔ بس تم صرف کل کی طرح آج کی رات اس کمرے میں بند رہو۔"

اس کے بعد بے دیو کا باپ منتر پڑھتے ہوئے کوارٹر کے گرد چکر لگانے لگا۔ بے دیو نے مجھے بتایا کہ پتا جی نے منتر اور اشلوک پڑھتے ہوئے کوارٹر کے چار چکر لگانے ہیں۔ چکر پورے کرنے کے بعد وہ میرے کمرے میں آ کر بولا۔

"موہن! میں نے اپنا منتر پورا کر لیا ہے۔ اب تم کل سارا دن اس کمرے میں بند رہو گے۔ ایک پل کے لیے بھی باہر قدم نہیں رکھو گے۔ بے دیو تمہارے بھوجن پانی کا پربندھ کیا کرے گا۔"

اور ایسا ہی ہوا۔ میں نے دوسرے دن اپنے آپ کو کوارٹر کے اس بوسیدہ کمرے میں بند کر لیا۔ کسی وقت مجھے لگتا کہ میں خواہ مخواہ ان توہم پرست لوگوں کی باتوں میں آ گیا ہوں۔ مجھے یہاں سے بھاگ جانا چاہیے۔ پھر خیال آتا کہ کہیں ان لوگوں کی باتیں سچ نہ نکل آئیں اور ترشنا کی بدروح سچ مچ گلا گھونٹ کر مجھے مار نہ ڈالے۔ ایک دو دفعہ میرے دل میں یہ خیال بھی آیا کہ میں کیوں ان لوگوں کی باتوں میں آ کر کمرے میں قید ہو گیا ہوں۔ مجھے یہاں سے بھاگ کر سیدھا اسٹیشن پر چلے جانا چاہیے۔ وہاں سے دلی جانے والی کوئی گاڑی مجھے مل ہی جائے گی لیکن میں کمرے سے باہر قدم نہ رکھ سکا۔ بے دیو مجھے آ کر دوپہر اور رات کا کھانا پہنچا گیا تھا۔

دن گزر گیا۔ رات بھی گزر گئی۔ اگلا دن طلوع ہوا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میرے سر سے بلا ٹل گئی۔ اب آگے جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ میں اس علاقے میں رہوں گا ہی نہیں تو ترشنا کی بدروح کہاں آئے گی۔ صبح کے وقت بے دیو کا باپ آ گیا۔ کہنے لگا۔

"موہن! بھگوان کی تم پر بڑی کرپا ہوئی ہے کہ میرے منتروں نے تمہیں ترشنا کی بلا سے بچا لیا ہے۔ یہ بتاؤ کہ رات کو وہ آئی تو نہیں تھی؟ تمہیں کچھ نظر تو نہیں آیا؟ تمہارے سینے پر آ کر تمہارا گلا دبانے کی کوشش تو نہیں کی؟"

میرے ساتھ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ ترشنا کی بدروح خواب میں بھی مجھے نظر نہیں آئی تھی۔ میں

نے بے دیو کے باپ کو بتا دیا کہ کچھ نہیں ہوا۔ اس نے کہا۔

"میں نے اپنے گوروجہان گورو گورکھ ناتھ کے منتروں کا جاپ کیا تھا۔ ترشنا کی بدروح آ کر تمہیں کیسے تنگ کر سکتی تھی۔"

میں نے کہا۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ۔ اب میں یہاں سے چلے جانا چاہتا ہوں۔"

"تم کہاں جاؤ گے؟" بے دیو کے باپ نے پوچھا۔

میں نے کہا۔

"میں دلی جاؤں گا۔ دلی میں میرے ماتا پتا رہتے ہیں۔"

وہ کہنے لگا۔

"میں کم از کم تین چار دن سے پہلے یہاں سے جانے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ بہتر ہوگا کہ تم کم از کم تین دن ہمارے پاس اس کوارٹر میں ہی رہو۔ میں منتر پھونک کر میرو اپنے ساتھ لایا ہوں۔ یہ تم اپنے پاس رکھو گے۔ تمہیں کوارٹر میں بند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم کوارٹر سے نکل کر ادھر ادھر چل پھر سکتے ہو لیکن میں کم از کم تین دن تمہیں اپنی نگرانی میں رکھنا چاہتا ہوں۔"

میں نے یونہی کہہ دیا۔

"لیکن میرا دلی جانا بہت ضروری ہے۔ مجھے گھر سے نکلے کئی روز ہو گئے ہیں۔ میرے ماتا پتا میرے لیے پریشان ہو رہے ہوں گے۔"

بوڑھے پجاری نے سوچ کر کہا۔

"موہن بیٹا میری ایک بات مان لو۔ گورو کے منتر کا میرو میں تمہیں دے رہا ہوں۔ اس کی طاقت ترشنا کی آتما کو تمہارے پاس نہیں آنے دے گی لیکن میں چاہتا ہوں کہ کم از کم تم تین دن اور میرے پاس رہ جاؤ۔ اس کے بعد بے شک بے فکر ہو کر چلے جاؤ۔"

بت پرستوں کے ماحول میں رہنے کی وجہ سے ان کے توہمات کا مجھ پر بھی کچھ اثر ہو چکا تھا۔ یہ قدرتی بات تھی اور میں کوئی پختہ عمر کا آدمی بھی نہیں تھا۔ چودہ پندرہ سال کی میری عمر تھی۔ میں نے سوچا کہ چلو تین دن اور رہ لیتا ہوں۔ ہو سکتا ہے میں آنے والی کسی بلا سے بچ جاؤں کیونکہ یوگی مت کے پجاری مندر میں میں ایک بلا کے نرغے میں آ چکا تھا اور خدا نے مجھے وہاں سے نکالا تھا۔ اگر خدا میری مدد نہ فرماتا تو پتہ نہیں پھر اس تابوت کے اندر میرا کیا حال ہوتا۔ میں زندہ بھی رہتا یا نہ رہتا لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ جس لڑکی ترشنا کی بدروح کے بارے میں یہ لوگ مجھے ایسی خوفناک باتیں بتا رہے تھے اس نے مندر میں آ کر مجھے تابوت سے باہر نکالا تھا۔ اگر بے دیو کے باپ کے قول کے مطابق وہ میری جان کی دشمن تھی اور مجھے ہلاک کرنا چاہتی تھی تو مجھے بند تابوت سے کیوں نکالتی؟ وہیں مجھے مرنے کے لیے چھوڑ دیتی۔ اگر وہ لڑکی ترشنا زندہ انسانی حالت میں نہیں تھی اور اس کی بدروح تھی تو وہ مجھے بڑی آسانی سے وہیں ہلاک کر سکتی تھی۔ جب ان باتوں کا خیال آتا تو مجھے بے دیو کے باپ کی ساری باتیں جھوٹی لگتیں اور میرے دل سے ترشنا کی بدروح کا خوف کچھ دیر کے لیے نکل جاتا لیکن پھر کفر غالب آ جاتا اور میرا ذہن توہمات کا شکار ہو جاتا کہ کیا پتا ترشنا کی روح واقعی کسی وقت اچانک نمودار ہو کر میرا گلا دبا دے۔

عجیب کشمکش کی حالت تھی میری لیکن میں نے وہاں مزید دو دن ٹھہرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اب اداس آنکھوں والی لڑکی جو مجھے ریل گاڑی میں ملی تھی اور جس سے مجھے محبت ہو گئی تھی میرے دل و دماغ

سے غائب ہو گئی تھی اور اس کی جگہ ایک ڈراؤنی چڑیل نمودار ہوئی تھی جو مجھے ہلاک کرنے کے لیے میرا پیچھا کر رہی تھی۔ یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ میں نے ان لوگوں کی باتوں کو سچ مان لیا تھا ورنہ کسی بھی وقت جب مجھ پر خالص محبت اور صرف محبت کا غلبہ ہوتا تو اس لڑکی کی معصوم مسکراہٹ والا بھولا بھالا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آ جاتا اور مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ لڑکی کوئی چڑیل بھی ہو سکتی ہے۔

□—□—□

اس کے بعد جو بھی مت کے ٹیلے کے مندر والی چڑیل کا ڈراؤنا مسئلہ اپنی جگہ پر قائم تھا۔ ابھی تک میں اس نتیجے پر نہیں پہنچا تھا کہ وہ حقیقت تھی یا میں نے دیکھا ہوا کوئی ڈراؤنا خواب تھا۔ بجے دیو کے چاچی نے مجھے منتروں والا مہرہ دے دیا تھا۔ یہ کالے رنگ کا خوبانی کی گٹھلی کے برابر تھا میں اس مصیبت کو اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا تھا لیکن مجبور ہو کر رکھ لیا تھا کہ جہاں اور سب کچھ ہو رہا ہے وہاں یہ بھی سہی۔

مزید ایک دن گزر گیا۔ کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔ میں کوارٹر سے نکل کر ٹہلنے کے لیے کھیتوں میں یا ندی کی طرف نکل جاتا تھا۔ اس روز کا ذکر ہے کہ شام کے قریب کچھ لوگ مرگھٹ میں جلانے کے واسطے ایک مردہ لے کر آئے۔ بجے دیو نے بتایا کہ یہ شہر کی ایک گانے بجانے والی طوائف کی لاش ہے جو اسی گاؤں کی رہنے والی تھی اور اس نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ میری لاش کو میرے گاؤں والے مرگھٹ میں نذر آتش کیا جائے۔ لاش کے ساتھ چھ سات آدمی بھی تھے۔ بجے دیو کے باپ نے چتا پر لکڑیاں چن دی تھیں۔ عورت کی لاش کو لکڑیوں کے اوپر لٹا کر اس کے اوپر لکڑیوں کی ایک اور تہہ لگا دی۔ ایک آدمی نے لکڑیوں پر مشعل کی کٹوری میں سے گھی انڈیل دیا۔

ان کے ساتھ آخری رسومات کے وقت اشلوک پڑھنے والا کوئی برہمن وغیرہ نہیں تھا۔ یہ کام بجے دیو کے باپ نے ہی انجام دیا۔ تین چار آدمی جو عورت کا مردہ لے کر شہر سے آئے تھے ان میں سے ایک نے چتا کو آگ دکھائی۔ تھوڑی دیر بعد لکڑیوں سے آگ بھڑکی اور شعلے بلند ہونے لگے۔ اس کے ساتھ ہی مردے کو لانے والے آدمی بجے دیو کے باپ کو کچھ پیسے وغیرہ دے کر واپس چلے گئے۔ میں اور بجے دیو جلتی ہوئی چتا سے کچھ فاصلے پر ایک درخت کے نیچے بیٹھے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ اس کا باپ چتا کو آگ لگا کر کچھ دور ایک تخت پوش پر بیٹھا ناریل پی رہا تھا۔ میں نے بجے دیو سے پوچھا۔

"آگ لگنے سے مردے کو تو کوئی تکلیف نہیں ہوتی ہوگی۔"

وہ بولا۔

"آدمی جب مر جاتا ہے تو اس کو کوئی خبر نہیں ہوتی۔ وہ تو پتھر ہو جاتا ہے۔ اس کو چاہے زمین میں دبا دو چاہے آگ میں جلا دو سب ایک برابر ہے۔"

میں نے کہا۔

"لیکن آدمی کو آگ لگانا مجھے اچھا نہیں لگا۔"

بجے دیو بولا۔

"یہ تو دھرم کی بات ہے۔ ہماری ماتا جی کہا کرتی تھیں کہ جب ہم مردے کے جسم کو آگ لگاتے ہیں تو اگنی دیوی اسے اٹھا کر لے جاتی ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"یہ اگنی دیوی کون ہے۔ کہاں سے آ کر مردے کو اٹھا کر لے جاتی ہے؟"

بجے دیو نے مجھے حیرانی سے دیکھا اور بولا۔

"تم ہندو ہو کر اگنی دیوی کو نہیں جانتے؟ اگنی دیوی آگ کی دیوی ہے۔ وہ آکاش سے آتی ہے اور مردے

کے جسم کو اٹھا کر آکاش کی طرف لوٹ جاتی ہے۔"

مجھے فوراً خیال آ گیا کہ میں نے تو بجے دیو کے آگے چتا پر خود کو ہندو ظاہر کیا ہوا ہے۔ میں نے کہا۔

"اچھا اچھا... ہاں اب میں سمجھ گیا میں بھول گیا تھا۔"

اتنے میں بجے دیو کا باپ تخت پوش سے اٹھ کر ناریل ہاتھ میں لیے آیا اور بجے دیو سے کہنے لگا۔

"ان لوگوں میں سے عورت کے پھول اکٹھے کرنے کوئی نہیں آئے گا۔ وہ کہہ گئے ہیں کہ آپ خود ہی پھول اٹھا کر ندی میں بہا دینا۔ تمہیں جلدی شہر پہنچنا ہے۔ میں رات کو مردے کے پھول ایک کوزے میں ڈال کر رکھ دوں گا۔ تم صبح صبح ندی پر اشنان کرنے جاتے ہوئے ساتھ لے جانا اور ندی میں بہا دینا۔ میں سونے جا رہا ہوں۔ تم بھی جا کر آرام کرو۔"

بجے دیو کا باپ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد بجے دیو کہنے لگا۔

"صبح ایک کام کرتے ہیں۔ میں صبح صبح اشنان کرنے کے لیے نہیں اٹھ سکتا۔ مردہ تھوڑی دیر کے بعد جل کر راکھ ہو جائے گا۔ میں راکھ ہو جانے کے بعد چتا میں سے مردے کی ہڈیاں اور بچی ہوئی راکھ مٹی کے مرتبان میں ڈال کر تمہیں دے دوں گا۔ تم اسے اپنے کمرے کے کونے میں رکھ دینا کل دوپہر کو میں اسے جا کر ندی میں بہا دوں گا۔ پتاجی نے پوچھا تو میں کہہ دوں گا کہ میں نے صبح صبح ہی پھول ندی میں بہا دیے تھے۔"

ہندو لوگ اپنے مردوں کی راکھ اور ہڈیوں کو پھول کہتے ہیں۔ امیر ہندو تو اپنے عزیزوں کے پھول گنگا دریا میں لے جا کر بہاتے ہیں۔ غریب لوگ وہیں کسی ندی دریا میں بہا دیتے ہیں۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تم مٹی کا کوزہ کمرے میں رکھ دینا۔"

ہم دونوں وہیں بیٹھے رہے۔ چتا کی آگ آہستہ آہستہ مدھم ہوتی گئی پھر شعلے غائب ہو گئے اور صرف انگارے باقی رہ گئے۔ رات ساڑھے نو بجے کا وقت ہوگا۔ بجے دیو اٹھ کر چتا کے قریب گیا۔ لوہے کی ایک لمبی کنڈے والی سلاخ سے اس نے لکڑی کے بڑے بڑے انگاروں کو ایک طرف ہٹا دیا۔ پھر ایک بہت لمبے چمچے سے اس نے چتا میں سے جلی ہوئی ہڈیاں اور تھوڑی سی راکھ نکال کر مرتبان میں ڈالی اور اسے اٹھا کر میرے کمرے میں آ گیا۔ اس نے مردے کے پھول یعنی مردے کی ہڈیوں اور راکھ والا مرتبان کونے میں رکھ دیا اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ کل کسی وقت اسے ندی میں بہا دیں گے۔ اس کے جانے کے بعد میں نے کمرے کا دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ مجھے بڑی سخت نیند آ رہی تھی۔ میں چارپائی پر لیٹ گیا تھوڑی دیر بعد میں سو گیا۔ معلوم نہیں کتنی دیر سویا ہوں گا کہ کھٹ کھٹ کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ دروازے پر کوئی آہستہ آہستہ دستک دے رہا تھا۔ میں یہ سمجھا کہ صبح ہو گئی ہے اور بجے دیو نے وہ پھول کا مرتبان بھول دیا ہے اور مردے کی ہڈیوں والا مرتبان لینے آیا ہے۔ میں چارپائی سے اٹھ کر دروازے کے پاس گیا۔ میں نے احتیاطاً پوچھا۔

"کون ہے؟"

دوسری طرف سے ایک عورت کی آواز آئی۔

"میں بھاگی کی گلی کی طوائف ہوں۔ اپنے پھول لینے آئی ہوں۔"

دہشت کے مارے میرے جسم پر لرزہ سا طاری ہو گیا۔ یہ اس عورت کی آواز تھی جس کے مردہ جسم کو شام کے وقت جلا کر راکھ کر چکے تھے۔

باہر سے اس عورت کی ایک بار پھر آواز آئی۔

"دروازہ کھولو میں جھانسی کی لکشمی ہوں۔ میں اپنے پھول لینے آئی ہوں۔"

میں ایک بھٹکتی بدروح کے لیے کیسے دروازہ کھول سکتا تھا۔ میں وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا مگر بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کمرے کی صرف ایک ہی کھڑکی تھی جس میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ دہشت کی وجہ سے میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ میں نے سونے سے پہلے بتی بجھا دی تھی۔ اتنے میں دروازہ اپنے آپ کھل گیا۔ میں ڈر کر چارپائی کے پیچھے چھپ گیا۔ میری آنکھیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ اتنے میں ایک عورت کا ہیولا سا اندر داخل ہوا۔ میرے دل کی دھڑکن خوف کے مارے ڈوب رہی تھی۔ عورت اندھیرے میں ہلکی ہلکی نظر آ رہی تھی۔ اس نے ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ وہ سیدھی اسی طرف آ گئی جہاں پر جے دیو نے جھانسی کی طوائف لکشمی کی چوڑیاں اور راکھ مرتبان میں رکھی ہوئی تھیں۔ عورت کا ہیولا مرتبان کے پاس آ کر رک گیا۔ مجھے عورت کے سرد آہ بھرنے کی آواز آئی۔ وہ مرتبان پر جھک گئی۔ پھر اس نے مرتبان کو اٹھایا اور دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازے سے چند گز کے فاصلے پر رک گئی۔ اس نے گردن موڑ کر اس جانب دیکھا جہاں میں چارپائی کے پیچھے چھپ کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔

"میرے ساتھ چلو گے۔ میں جھانسی کی رانی کے محل میں رہتی ہوں۔"

مجھ پر لرزہ طاری تھا۔ میں اسے کیا جواب دیتا۔ خوف سے میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ عورت نہیں ہے بلکہ لکشمی کی بدروح ہے جو مرنے کے بعد اسی دنیا میں بھٹکنے لگی ہے۔ جب میں نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ بھٹکتی بدروح بولی۔

"تمہاری آتما بڑی اچھی ہے یہاں سے چلے جاؤ۔"

اور وہ دروازے میں سے نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد دروازہ اپنے آپ بند ہو گیا۔ باقی ساری رات تک میں اسی طرح بت بنا چارپائی کے پیچھے چھپ کر بیٹھا رہا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ روح مرے سے چارپائی سے اور دوبارہ نہیں آئے گی تو میں اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ نیند مجھے کہاں آ سکتی تھی۔ باقی ساری رات چارپائی پر کبھی بیٹھ کر اور کبھی لیٹ کر پہلو بدلتے گزار دی۔ دن نکل آیا میں نے دیکھا کہ کونے میں لکشمی طوائف کی راکھ اور چوڑیوں والا مرتبان نہیں تھا۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ رات کو میں نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔ جب مرتبان غائب پایا تو مجھے یقین کرنا پڑا کہ رات واقعی لکشمی کی بدروح آئی تھی اور اپنے پھول لے گئی ہے۔

دن کافی نکل آیا تھا کہ جے دیو آ گیا۔ کہنے لگا۔

"میں مردے کے پھول ندی میں بہا آؤں پھر اکٹھے بیٹھ کر ناشتہ کریں گے۔"

میں خاموش رہا۔ جے دیو میرا ہم عمر لڑکا سا ہی تھا۔ وہ اس کونے کی طرف گیا جہاں اس نے شام کو خود مرتبان رکھا تھا مگر مرتبان وہاں نہیں تھا۔ اس نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا کہنے لگا۔

"مرتبان کہاں گیا؟"

میں پھر بھی خاموش رہا تو وہ بولا۔

"کیا بات ہے موہن! تم خاموش کیوں ہو؟ اگر صبح صبح تم نے مرتبان کی راکھ اور چوڑیاں ندی میں بہا دی ہیں تو یہ بڑی اچھی بات کی ہے تم نے۔"

میں نے کہا۔

"میں نے مردے کے پھول ندی میں نہیں

بہائے۔"

جے دیو اور زیادہ حیران ہو کر بولا۔

"تو پھر مرتبان کہاں چلا گیا؟"

میں نے کہا۔

"مرتبان میں جس مردہ عورت کی راکھ اور چوڑیاں تھیں وہ خود اسے لے گئی ہے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔"

جے دیو میرے پاس آ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ جب میں نے اسے رات والا واقعہ سنایا تو میرا منہ تکنے لگا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے فوراً جا کر اپنے باپ کو یہ واقعہ سنا دیا۔ اس کا بوڑھا باپ میرے پاس آ کر کہنے لگا۔

"کیا تم پورے وشواس کے ساتھ کہتے ہو کہ رات جو عورت اپنے پھول لینے آئی تھی اس نے اپنا نام لکشمی بتایا تھا؟"

میں نے کہا۔

"بالکل میں پورے یقین کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔ اگر یہ کوئی سپنا ہوتا تو مرتبان کو تو یہاں موجود ہونا چاہیے تھا۔"

"اس عورت نے کیا کہا تھا؟" بوڑھے نے پوچھا

میں نے کہا۔

"اس نے دروازے پر دستک دی۔ میں جاگ رہا تھا۔ میں نے پوچھا کون ہے؟ دوسری طرف سے اس نے کہا۔ میں جھانسی کی لکشمی ہوں میں اپنے پھول لینے آئی ہوں۔ میں ڈر کر چارپائی کے پیچھے چھپ گیا کیونکہ جھانسی کی لکشمی کو تو آپ شام کو جلا چکے ہیں۔ عورت نے دوبارہ کہا دروازہ کھولو۔ میں جھانسی کی لکشمی ہوں میں اپنے پھول لینے آئی ہوں۔ میں ڈر کے مارے کانپ رہا تھا۔ اتنے میں دروازہ اپنے آپ کھل گیا اور میں نے ایک عورت کے ہیولے کو دیکھا۔ وہ اندر آئی اور سیدھی کمرے کے اس کونے کی طرف گئی جہاں اس کی راکھ اور چوڑیوں والا مرتبان پڑا تھا۔ اس نے مرتبان اٹھایا اور واپس چل پڑی۔ دروازے کے پاس آ کر اس نے میری طرف گردن موڑ کر دیکھا اور کہنے لگی۔ میرے ساتھ چلو گے؟ میں جھانسی کی رانی کے محل میں رہتی ہوں۔ اس کے بعد وہ دروازے میں سے باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد دروازہ اپنے آپ بند ہو گیا۔"

جے دیو اور اس کا بوڑھا باپ دونوں بڑی حیرت سے میری بات سن رہے تھے۔ جب میں نے بات ختم کی تو بوڑھا بولا۔

"تم خوش قسمت ہو کہ اس کے ساتھ نہیں گئے۔ اس نے ٹھیک کہا تھا کہ میں جھانسی کی رانی کے محل میں رہتی ہوں۔ اس عورت کو جو جھانسی کی مشہور طوائف تھی جھانسی کی رانی کے محل کے کھنڈر میں لے جا کر گلا دبا کر مار دیا گیا تھا۔ پولیس اس کے قاتل کو تلاش کر رہی ہے۔"

میں نے جے دیو کے باپ سے کہا۔

"اب میرا دل یہاں سے گھبرا گیا ہے۔ ڈرتا ہوں کہیں کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں اور کوئی بدروح مجھے نہ چمٹ جائے۔ اس لیے میں آج یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

بوڑھا کہنے لگا۔

"ابھی ترشنا کی بھٹکتی روح کے چلے کے دو دن باقی ہیں۔ میرا چلہ پورا نہ ہوا تو ترشنا کی بدروح تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گی۔ اس لیے میری مانو دو دن اور رک جاؤ اور مجھے چلہ پورا کر لینے دو۔"

مگر میں نے دل میں وہاں سے فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے اور جے دیو نے ناشتہ کیا اس کے بعد میں وہاں سے بھاگنے کی

ترکیبیں سوچنے لگا؟ بہرحال کچھ دیر کے بعد چلا گیا۔ اس کے باپ نے مجھے گھر سے باہر نکلنے سے سختی سے منع کیا تھا لیکن مجھے اب اس کے مشوروں اور اس کے چلنے وغیرہ کی کوئی پروا نہیں تھی۔ مجھے یہی ڈر لگا ہوا تھا کہ یہ جو بھی سوچوں کا مسکن بن گئی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی باہر سے پیچھے ہی لگ جائے۔ میری جیب خالی تھی۔ مگر مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ مجھے ٹرین میں بغیر ٹکٹ سفر کرنا تھا۔ میں بغیر ٹکٹ سفر کرنے کا عادی تھا۔ مجھے صرف اتنا ہی کرنا تھا کہ وہاں سے بھاگ کر ریلوے اسٹیشن پر پہنچوں اور جو پہلی گاڑی دلی کی طرف جا رہی ہو اس میں بیٹھ جاؤں۔ میں گھر سے نکل آیا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ وہاں نہ تو بچہ تھا اور نہ اس کا باپ ہی۔ مجھے کوئی دیکھ رہا ہے تو میں بہت اچھا تھا۔ میں کھیتوں کی طرف چل دیا۔ اسٹیشن کا راستہ مجھے معلوم تھا۔ میں جلدی جلدی چل رہا تھا لیکن میں نے طے کر رکھا تھا کہ اگر یہ بچہ یا اس کا باپ آ بھی گیا تو میں واپس جانے سے صاف انکار کر دوں گا۔

مگر میرے پیچھے کوئی نہ آیا۔ کھیتوں سے نکل کر میں چھوٹی پکی سڑک پر ہو گیا جو سیدھی ریلوے اسٹیشن کو جاتی تھی۔ ریلوے اسٹیشن پہنچ کر میں نے ایک آدمی سے پوچھا کہ دلی جانے والی گاڑی کب آئے گی۔ اس نے بتایا کہ ایک گاڑی ابھی ابھی نکل گئی ہے۔ اب ڈیڑھ گھنٹے کے بعد دوسری گاڑی آئے گی۔ میں پلیٹ فارم پر ہی بیٹھ گیا۔ ٹکٹ میرے پاس نہیں تھا۔ مگر میں بے فکر ہو کر بیٹھا تھا۔ ٹکٹ چیکر نے آ کر ٹکٹ چیک بھی کیا تو زیادہ سے زیادہ یہی کرے گا کہ مجھے اسٹیشن سے باہر نکال دے گا۔ میں کچھ دیر بعد دوبارہ آ جاؤں گا۔ ان سارے چکروں سے میں اس کم عمری میں ہی گزر چکا تھا۔ مشکل صرف اس وقت پیش آتی تھی جب ٹرین میں ٹی ٹی ٹکٹ چیک کرتا تھا۔ میری کم عمری کی وجہ سے آج تک کسی ٹکٹ چیکر نے مجھے ریلوے پولیس کے حوالے نہیں کیا تھا۔ بس وہ مجھے ٹرین سے اتار دیتا تھا۔ اگر اس وقت ٹرین کسی اسٹیشن پر کھڑی ہوتی تھی تو میں پلیٹ فارم پر اتر کر ادھر ادھر ہو جاتا۔ ٹرین چلتی تو دوڑ کر اس کے آخری ڈبے میں سوار ہو جاتا تھا۔ چنانچہ اس طرح بغیر ٹکٹ سفر کرتے ہوئے میں نے اس قسم کے بیسیوں چکر کئی بار کیے تھے۔ مصیبت اس وقت پڑ جاتی تھی جب ٹکٹ چیکر مجھے رات کے وقت کسی ویران اسٹیشن پر اتار دیتا تھا۔

اس وقت چونکہ دن تھا اس لیے مجھے کوئی فکر نہیں تھی۔ چنانچہ میں پلیٹ فارم پر ادھر ادھر گھومتا پھرتا رہا۔ میں نے کرتا پاجامہ اور چپل پہن رکھی تھی اور کوئی سامان میرے ساتھ نہیں تھا۔ پندرہ سولہ سال کی عمر تھی۔ اس عمر میں میں کہاں سامان لے کر سفر کرتا پھرتا۔ سامان کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اب ان دنوں کا تصور جب میں لاتا ہوں تو بڑا حیران ہوتا ہوں کہ میں اتنے لمبے لمبے سفر بغیر ساز و سامان کے اور وہ بھی بغیر ٹکٹ کیسے کر لیا کرتا تھا۔ گاڑی آ کر پلیٹ فارم پر رکی تو میں تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں چڑھ گیا۔ یہ گاڑی دلی جا رہی تھی۔ اس کی ایک بوگی کے اوپر بمبئی جھانسی دلی کی تختی لگی ہوئی تھی۔ گاڑی تھوڑی دیر کے لیے ہی رکی اور پھر چل پڑی۔ میری اس زمانے میں ایک عادت ہوتی تھی کہ میں کسی ایک ڈبے میں ٹک کر نہیں بیٹھتا تھا۔ دو تین اسٹیشن گزر جاتے تو میں کسی دوسرے ڈبے میں چلا جاتا۔ یہ ضرور دیکھ لیتا تھا کہ یہ ڈبہ تھرڈ کلاس کا ہی ہے۔ یہاں سے گاڑی چلی تو دو چار اسٹیشن گزر جانے کے بعد میں تھرڈ کلاس کے ایک اور ڈبے میں آ گیا۔ یہاں بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی۔ میں دروازے کے پاس

کھڑا ہو گیا اور باہر کا نظارہ کرتا اور کھیتوں، درختوں اور پہاڑوں ٹیلوں کو پیچھے کی طرف جاتے دیکھتا رہا۔ وہاں سے دلی کافی دور تھی۔ کوئی بڑا اسٹیشن آتا تو میں پلیٹ فارم پر اتر کر تھوڑا بہت چلنا پھرنا شروع کر دیتا۔

□□□

کتابوں رسالوں کے اسٹال پر جا کر رسالوں کی تصویریں دیکھتا۔ فرسٹ کلاس کے ریفریشمنٹ روم کے سامنے سے ضرور گزرتا کیونکہ وہاں سے انگریزی چائے کی خوشبو آیا کرتی تھی جو مجھے بڑی پسند تھی۔ چائے آج کل بھی پاکستان میں بڑی معیاری ملتی ہے مگر اس زمانے میں لپٹن کے کئی برانڈ ہوتے تھے۔ ایک اورنج پیکو چائے ہوا کرتی تھی۔ اس کی خوشبو مجھے اپنے ساتھ اڑا کر جنگلوں، سمندروں اور چائے کے ان دیکھے باغات کی طرف لے جاتی تھی۔

بڑے اسٹیشنوں کے پلیٹ فارموں پر ان دنوں انتشار نہیں ہوا کرتا تھا۔ یہ میں ۱۹۴۲،۴۳ء کی بات کر رہا ہوں۔ حیرت کی بات ہے اور اس کا میں نے کافی مشاہدہ کیا ہے کہ اس زمانے میں ہر بڑے ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم کی فضا الگ ہوتی تھی۔ مثال کے طور پر جیسے ہی ہردوئی نام کا ایک اسٹیشن آتا تھا۔ یہ چھوٹا سا شہر ہوا کرتا تھا اور یہاں کے لڈو بڑے مشہور تھے۔ اس اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر بوندی والے لڈوؤں کی ہلکی ہلکی خوشبو پھیلی ہوتی تھی۔ اس خوشبو میں گلاب کے عرق کی ویسی ہی مہک بھی ہوتی تھی۔ جو ہردوئی کے لڈوؤں میں ڈالا جاتا تھا۔

یہاں پھیری والے ہردوئی کے لڈو، ہردوئی کے لڈو لے لو کی آوازیں لگاتے پھرتے تھے۔ ان کے پاس مٹی کے کوزے ہوتے۔ ہر کوزے میں مالٹے کی سائز کے دو لڈو ہوتے تھے۔ لڈوؤں پر سفید بوندی کی بڑی باریک سی تہہ جمی ہوتی تھی جس میں بیسن کی بوندیاں زرد موتیوں کی طرح چمکتی تھیں۔ اسی طرح بھوپال کے اسٹیشن پر گاڑی ٹھہرتی تو مجھے اس کے پلیٹ فارم پر ہمیشہ ہری چنبیلی کے پھولوں کی ہلکی ہلکی مہک آیا کرتی تھی۔ یہاں کے ہری چنبیلی کے پھول بڑے مشہور تھے۔

ان پر سوئی وغیرہ کے نشان بالکل نہیں ہوتے تھے۔ بالکل سرسبز ہوتے تھے مگر اندر سے بے حد ملائم نرم اور خوشبودار ہوتے تھے۔ اسی طرح لکھنؤ کے اسٹیشن پر مختلف عطریات اور پان کے قسم قسم کے قواموں کی خوشبوئیں پھیلی ہوتی تھیں۔ لکھنؤ کا ریلوے اسٹیشن اپنی نفاست نزاکت اور خوب صورتی کی وجہ سے سارے ہندوستان میں مشہور تھا۔

اس کی عمارت لاہور کے ریلوے اسٹیشن کی عمارت کی طرح کی ہوا کرتی تھی۔ اس کے پلیٹ فارم پر پان سگریٹ کے اسٹال بھی ہوا کرتے تھے۔ پتا نہیں اب ہوتے ہیں کہ نہیں۔ یہ اسٹال بڑے سجے سنورے ہوتے تھے۔ یہاں ایک بہت بڑا آئینہ ضرور لگا ہوتا تھا۔ جس کے سامنے کھڑے ہو کر لوگ اپنے بال وغیرہ درست کیا کرتے تھے۔ پان سگریٹ کے اسٹالوں پر اتنی خوشبوئیں اڑتی تھیں کہ آدمی کو محسوس ہونے لگتا کہ یہ پان سگریٹ کا نہیں بلکہ لکھنؤ کے مشہور عطر سازوں اصغر علی محمد علی کے عطریات کا اسٹال ہے۔

گھومتے جاتے ہوئے جھریا کا اسٹیشن آتا تو اس کے پلیٹ فارم پر اترتے وقت مجھے پتھر کے کوئلوں کی ہلکی ہلکی بو ضرور محسوس ہوتی۔ جھریا میں کوئلے کی کانیں تھیں اور یہاں انجن پر پتھر کا کوئلہ لادا جاتا تھا۔ بمبئی کے اسٹیشن پر مجھے ہمیشہ ایرانی ہوٹلوں میں پی جانے والی چائے اور بارش کی خوشبو آتی تھی۔

ایک چائے اور اوپر سے بارش۔ بارش میں

جائے۔ جائے میں بارش۔ پہلی بار جب میں
آٹھویں جماعت سے بھاگ کر بمبئی سینٹرل کے
اسٹیشن پر پہنچا تو مجھے بارش اور جائے کی اس خوشبو
نے ریلوے اسٹیشن سے باہر نہیں نکلنے دیا تھا۔ اسی
طرح سری لنکا کے دارالحکومت کولمبو کی طرف سفر
کرتے ہوئے راستے میں ایک چھوٹے سے جنگلی
ریلوے اسٹیشن پہ گاڑی رکی تو اس وقت بارش ہو رہی
تھی اور اسٹیشن کے سرخ مٹی والے پلیٹ فارم سے
مٹی اور اناس کی خوشبو آ رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد
وہاں اناس بیچنے والی سیلونی لڑکیاں آ گئی تھیں۔
انہوں نے کیلے کے سبز پتوں پر کٹے ہوئے اناس
کے قتلے رکھے ہوئے تھے اور آوازیں لگا رہی تھیں۔ پائن ایپل
سر! آئیو بہت سرا ویری سویٹ سر!

یہ میرے ماضی کی آوازیں اور میرے ماضی کی
خوشبوئیں ہیں جو میرے حال کے ساتھ ساتھ سفر
کر رہی ہیں۔ ایک دن یہ ساری آوازیں یہ ساری
خوشبوئیں یہ سارے معصوم خوب صورت چہرے مجھے
اور میرے ماضی اور میرے حال کو لے کر مستقبل کی
نورانی روشنیوں کی وادیوں میں اتر جائیں گے۔

ابھی تک میں یہ بیان کر رہا تھا کہ میں بغیر ٹکٹ
کے تھا اور ایک ریل گاڑی کے تھرڈ کلاس کے ڈبے
میں بیٹھا بمبئی سے دلی کی جانب سفر کر رہا تھا اور سوچ
رہا تھا کہ ڈبے میں ٹی ٹی نہ آئے تو اچھا ہے۔ خواہ
مخواہ کسی مشکل میں پھنس جاؤں گا۔

لیکن قدرت کو یہ منظور نہیں تھا۔ آدھا دن ٹرین
میں سفر کرتے گزر گیا۔ رات ہو گئی ایک اسٹیشن سے
گاڑی چلی تو ٹی ٹی صاحب دوسرے ڈبے میں دوڑ کر
چڑھ گئے۔ ٹی ٹی ہمیشہ دوڑ کر اسی وقت ڈبے میں
چڑھتے تھے جب ٹرین چل پڑتی تھی۔ شاید اس خیال
سے کہ بغیر ٹکٹ کا کوئی مسافر اگر ڈبے میں موجود ہو تو
وہ ڈبے سے اتر نہ جائے۔

میں نے ٹی ٹی کو ڈبے میں چڑھتے دیکھ لیا تھا۔
آگے کوئی بڑا اسٹیشن آنے والا تھا اب یہ اندازہ نہیں رہا کہ
وہ کون سا اسٹیشن تھا۔ بہرحال ٹی ٹی کو دیکھ کر میرا دل
ایک دو بار زور سے دھڑکا پھر میں سنبھل گیا۔ ٹرین کی
رفتار تیز ہو چکی تھی ورنہ میں کھڑکی میں سے باہر
چھلانگ لگا دیتا۔ مسافروں کے ٹکٹ چیک کرتے
کرتے وہ میرے پاس آ گیا۔ بولا۔

"چلو بھئی ٹکٹ دکھاؤ۔"

میں نے اداکاری شروع کر دی۔ کبھی کرتے کی
جیب میں ہاتھ ڈالتا۔ کبھی پاجامے کی جیبوں
کو ٹٹولتا۔ اس زمانے میں ایسے پتلون نما پاجامے ہوا
کرتے تھے جن میں دو جیبیں لگی ہوتی تھیں۔ ٹی ٹی
فوراً سمجھ گیا کہ میں بغیر ٹکٹ کے سفر کر رہا ہوں۔ میں
نے کہا۔

"پتہ نہیں کہاں چلا گیا۔ میں نے اسی جیب میں
رکھا تھا۔"

ٹی ٹی نے مجھے کان سے پکڑ کر کھڑا کیا اور بولا۔

"میں سب سمجھتا ہوں۔ جی تو چاہتا ہے اگلے
اسٹیشن پر تمہیں ریلوے پولیس کے حوالے کر دوں مگر
تمہاری عمر پر ترس آتا ہے۔ بس یہی کر سکتا ہوں کہ
جہاں گاڑی رکے وہاں تمہیں نیچے اتار دوں گا۔"

اتفاق سے گاڑی کی رفتار ہلکی ہونے لگی اور تھوڑی
دیر بعد گاڑی رات کے اندھیرے میں ایک ویران
جنگل میں رک گئی۔ شاید آگے کوئی سگنل نہیں گرا تھا یا
لائن کی مرمت ہو رہی تھی۔

ٹی ٹی مجھے اٹھا کر ڈبے کے دروازے پر لے آیا۔
گاڑی نے سیٹی دی اور دوبارہ چل پڑی۔ ٹی ٹی نے
مجھے آہستہ چلتی ہوئی ٹرین سے نیچے اتار دیا۔ میں ریلوے لائن
کے پتھروں پر سے پھسل کر دور جا گرا۔ اگر میں کسی

ہموار پلیٹ فارم پر ہوتا تو دوڑ کر ٹرین کے کسی ڈبے
کے دروازے پر لٹک کر ٹرین میں سوار ہو سکتا تھا۔ دو تین
بار میں نے ایسا کر بھی لیا تھا۔ مگر وہاں کوئی پلیٹ فارم نہیں تھا
اور میں ریلوے لائن سے بھی نیچے ڈھلان پر تھا۔

رات کے اندھیرے میں آخری ڈبے کے دروازے
کی آہنی بتی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میرے پیچھے
دیکھتے دیکھتے ٹرین گزر گئی اور میں اس کے سب سے پچھلے
ڈبے کی سرخ بتی ہی دیکھتا رہ گیا جو رات کے
اندھیرے میں آہستہ آہستہ گم ہو رہی تھی۔

کچھ دیر تو میں حسرت و یاس کے عالم میں ریلوے
لائن کے پاس کھڑا ٹرین کی سرخ بتی کو نگاہوں سے
اوجھل ہوتے دیکھتا رہا پھر ریلوے لائن کے ساتھ
ساتھ اسی طرف چل پڑا جس طرف ٹرین گئی تھی۔

یہ مجھے علم ہو گیا تھا کہ آگے کوئی بڑا شہر کا اسٹیشن
آ رہا تھا۔ میں دل میں یہ امید لیے چلا جا رہا تھا کہ
آگے جو بڑا شہر ہے وہاں پہنچ جاؤں گا۔ ہر طرف
رات کا سناٹا تھا۔ کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

پہلے تو گھپ اندھیرے میں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا
تھا۔ پھر اندھیرے میں درختوں اور ریلوے لائن کے
دھندلے دھندلے خاکے نظر آنے لگے اور میں آہستہ
آہستہ چلتا رہا۔ وہاں نہ تو کہیں ریلوے لائن کی
مرمت ہو رہی تھی اور نہ کوئی سگنل کی بتی ہی نظر آ رہی
تھی۔ پھر خدا جانے ٹرین کیوں رک گئی تھی۔ شاید وہ
صرف مجھے نیچے اتارنے کے لیے ہی رکی تھی۔ مجھے نیچے
اتار دیا اور آگے چل دی۔

خدا جانے میں کتنی دیر چلا ہوں گا کہ ایک ندی کا
پل آ گیا۔ میں پل پر سے گزر گیا۔ سانپوں کا بھی مجھے
ڈر لگا ہوا تھا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ سانپ ریل گاڑی
کے پہیوں کی آواز کے عاشق ہوتے ہیں اور برسات
کی راتوں میں ریل کی پٹڑی پر لیٹ کر دور سے آتی
ہوئی گاڑیوں کے پہیوں کی تھرتھراہٹ کو محسوس کر کے
مست ہو جاتے ہیں۔ میرے قدموں کی آواز سے
کوئی بھی سانپ ٹھہر کر مجھے ڈس سکتا تھا مگر خدا کا شکر
ہی رہا۔ اگر اندھیرے میں کوئی سانپ ریلوے لائن پر
بیٹھا بھی ہوا تھا تو اس نے میری طرف توجہ نہ کی لیکن
ایک آدمی نے مجھے دیکھ لیا تھا۔

ریل کی پٹڑی زمین سے چھ سات فٹ کی بلندی
پر بنی ہوئی تھی۔ یہ آدمی نیچے چلا آ رہا تھا اس کے ہاتھ
میں لالٹین تھی جو جل رہی تھی۔ وہ جھاڑیوں میں سے
نکلا تو مجھے نظر آیا۔ وہ سامنے کی جانب سے میری
طرف آ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ وہیں رک گیا تھا۔ جب
میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے مجھے آواز دی۔

"کون ہو؟"

میں رک گیا۔ میں نے کہا۔

"گاڑی چھوٹ گئی تھی۔ پیدل اگلے اسٹیشن
پر جا رہا ہوں۔"

وہ آدمی لالٹین ہاتھ میں لیے اوپر میرے پاس
آ گیا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں لمبا بانس تھا۔
دیہاتی آدمی تھا کہنے لگا۔

"اگلا اسٹیشن تو کوسوں دور ہے۔ راستے میں کوئی
شیر چیتا مل گیا تو زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

میں پریشان ہو گیا۔ میں نے پوچھا۔

"پھر میں کیا کروں؟"

کہنے لگا۔ "میرے ساتھ آؤ۔ گاؤں قریب ہی
ہے۔ وہاں رات گزار کر صبح چلے جانا۔"

اس کے لہجے میں بڑی شفقت تھی۔ میں اس کے
ساتھ چل پڑا۔ ہم کھیتوں میں سے گزر رہے تھے۔
شاید دیہات کے کھیت تھے کیونکہ پودوں کی دھیمی
دھیمی خوشبو کسی وقت آ جاتی تھی۔ ایک دو میل جانے
کے بعد ایک گاؤں کی دو تین بتیاں دکھائی دیں۔ یہ

ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس کے مکانوں پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ وہ آدمی مجھے ایک پرانی حویلی میں لے آیا۔ یہاں اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک عورت نے دروازہ کھول کر نیند بھری آواز میں پوچھا۔

"کون ہو تم؟"

اس آدمی نے اپنا حوالہ نام بتایا جو میں بھول گیا ہوں۔ کہنے لگا۔

"چوہدری والے نے اس کو مہمان بنایا ہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی اس نے لالٹین میرے چہرے کے قریب کردی۔ عورت نے مجھے گھور کر دیکھا اور بولی۔

"اسے اندر لے آؤ۔"

دیہاتی بولا۔

"تم اسے اندر لے جاکر سلادو۔ میں صبح چوہدری والے سے مل لوں گا۔"

عورت نے مجھ سے کہا۔

"آجاؤ اندر آجاؤ۔"

مجھے ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ میں کسی مصیبت میں گرفتار ہوچکا ہوں۔ مجھے علم بھی کیسے ہوسکتا تھا۔ عورت نے ڈیوڑھی کا دروازہ بند کردیا۔ ڈیوڑھی میں ویسی روشنی والی لالٹین روشن تھی۔ لالٹین کی روشنی میں عورت کی آگے کو مڑی ہوئی ناک سے مجھے اس پر کسی چڑیل کا گمان ہونے لگا تھا مگر اس کا لہجہ بڑا شفقت بھرا تھا۔ کہنے لگی۔

"میرے ساتھ آؤ۔ اندر والے صحن میں چارپائی پر سو جاؤ۔ تم کہاں سے آرہے ہو؟"

وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر حویلی کے اندر والے صحن میں لے آئی جو چاروں طرف سے اونچی اونچی کچی دیواروں سے گھرا ہوا تھا۔ وہاں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ میں اس پر بیٹھ گیا۔ میں نے اسے بتایا کہ بستی سے دلی جارہا تھا کہ راستے میں ایک جگہ گاڑی رکی۔ میں نیچے اتر کر ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے ذرا دور چلا گیا تو گاڑی چل پڑی۔ دوڑ کر گاڑی کو پکڑنا چاہا مگر اس کی رفتار تیز ہوچکی تھی۔ میں اسے نہ پکڑ سکا۔

عورت بولی۔

"کوئی بات نہیں۔ چوہدری والے کی لاریاں چلتی ہیں۔ وہ تمہیں صبح کی لاری میں بٹھا دے گا۔ تم دلی چلے جانا۔"

میں نے پوچھا۔

"دلی یہاں سے کتنی دور ہے؟"

عورت نے کہا۔

"زیادہ دور نہیں ہے۔ اب تم سو جاؤ۔ مجھے بھی نیند آرہی ہے۔"

وہ عورت چلی گئی۔ میں چارپائی پر لیٹ گیا۔ بہت تھکا ہوا تھا۔ فوراً ہی سو گیا۔ صبح صبح اس عورت نے مجھے جگا کر کہا۔

"اٹھو۔۔۔۔ منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کرو۔"

غسل خانہ کونے میں بنا ہوا تھا۔ میں نے منہ ہاتھ دھولیا۔ عورت مجھے رسوئی میں لے گئی۔ وہاں چائے پک رہی تھی۔ ساتھ رات کی بچی ہوئی روٹیاں اور مکھن تھا۔ مجھے بہت بھوک لگ رہی تھی۔ خوب ناشتہ کیا۔ عورت مجھے تھوڑی دیر بعد گھور کر دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"چوہدری والے کی لاریاں کہاں سے چلتی ہیں؟ مجھے وہاں چھوڑ آؤ۔ میرے پاس ٹکٹ کے پیسے ہیں۔"

عورت کے چہرے پر ایک پراسرار سا تبسم نمودار ہوا اور فوراً ہی غائب ہوگیا۔ وہ تازہ روٹیاں پکارہی تھی۔ کہنے لگی۔

"صحن والی چارپائی پر جاکر بیٹھ جاؤ۔ چوہدری والے کا آدمی تھوڑی دیر میں آئے گا۔ اس کے ساتھ چلے جانا۔"

میں چارپائی پر آکر بیٹھ گیا۔ حویلی کا ماحول بڑا پراسرار سا تھا۔ وہاں سوائے اس عورت کے مجھے کوئی دوسرا انسان ابھی تک نظر نہیں آیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ایک کالے رنگ کا دبلا پتلا آدمی جس نے سر پر نیلا رومال باندھ رکھا تھا صرف ایک صدری اور دھوتی پہنی ہوئی تھی۔ عورت کے ساتھ میرے سامنے آکر کھڑا ہوگیا اور میرا جائزہ لینے لگا۔ میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ عورت نے کہا۔

"یہ شامو ہے۔ اس کے ساتھ چلے جاؤ۔ یہ تمہیں دلی جانے والی لاری پر بٹھا دے گا۔ جاؤ۔"

شامو کی سانولی رنگت کی آنکھوں میں ایک چمک تھی جیسے اس کا شکار آگیا ہو۔ کہنے لگا۔

"آجاؤ بابو آجاؤ۔ تمہیں دلی پہنچائے دیتا ہوں۔"

میں اس کے ساتھ ہولیا۔ دن کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ حویلی کے باہر ایک خستہ سی پرانی جیپ کھڑی تھی۔ جس کی چھت ترپال کی تھی۔ شامو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ مجھے اپنے ساتھ بٹھالیا۔ کہنے لگا۔

"بابو جی کہاں سے آئے ہو؟"

میں نے کہا۔

"بہار شریف سے۔"

"ہوں۔" شامو بولا۔

"کوئی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

جیپ کھیتوں کے درمیان بنے ہوئے کچے راستے پر دوڑتی چلی جارہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ جیپ گاؤں کی طرف جانے کی بجائے اسے ایک طرف چھوڑ کر اس سے آگے نکل گئی ہے۔ میں نے جھجکتے ہوئے شامو سے پوچھا کہ لاری اڈا گاؤں میں نہیں ہے؟ اس نے کہا۔

"چوہدری والا کا لاری اڈا گاؤں سے پرے دور واقع ہے۔ ابھی پہنچ جائیں گے وہاں۔"

جیپ کھیتوں سے نکلی تو چھوٹے بڑے ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ میں نے سوچا کہ چوہدری والا کو گاؤں سے باہر لاری اڈا بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس وقت آسمان پر بادل جمع ہونا شروع ہوگئے تھے۔ ٹیلوں کا سلسلہ ختم ہوا تو درختوں اور جنگلی جھاڑیوں والا ایک جنگل شروع ہوگیا۔

اس جنگل کے وسط میں کھلی جگہ تھی جہاں میں نے دیکھا کہ پندرہ بیس میری عمر کے لڑکے کلہاڑوں سے درخت کاٹ رہے تھے۔ چھ سات آدمی بندوقیں اٹھائے ان کی نگرانی کررہے تھے۔ ابھی تک مجھے ان لڑکوں کے پاؤں میں پڑے ہوئے لوہے کے کڑے نظر نہیں آئے تھے۔ میں یہی سمجھا کہ ارد گرد کے قصبوں کے لڑکے ہیں جو یہاں محنت مزدوری کررہے ہیں۔ شامو نے جیپ سے اترتے ہوئے کہا۔

"آجاؤ۔ تمہیں دلی جانے والی لاری پر سوار کرادوں۔"

وہاں درختوں کے پیچھے کھپریل کی تین چار چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ ان میں ایک کوٹھڑی کی اور فوجی چوکی کی طرح کی تھی۔ ایک موٹا چوڑا چکلا بھاری مونچھوں والا کالے رنگ کا آدمی مونڈھے پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ ایک آدمی اس کے پاؤں میں بیٹھا اس کی پنڈلیاں دبا رہا تھا۔ سامنے تپائی پر کچھ پھل وغیرہ پڑے تھے۔ شامو نے مجھ سے کہا۔

"یہ چوہدری والا ہے۔ یہ تمہیں دلی پہنچا دے گا۔"

اس وقت میری چھٹی حس نے مجھے خبردار کردیا۔ کم بخت چھٹی حس نے مجھے خبردار کرتے ہوئے بڑی دیر کردی تھی۔ اگر ایک روز پہلے یہ چھٹی حس مجھے خبردار کردیتی تو میں اس آدمی کے ساتھ کبھی نہ جاتا جو ایک رات پہلے مجھے ریلوے لائن پر ملا تھا لیکن اب دیر

ہو چکی تھی اور جو کچھ میرے مقدر میں لکھ دیا گیا تھا وہ ہونے والا تھا۔

مجھے شامو نے چوہب والے کے سامنے پیش کر دیا۔ چوہب والے کی آنکھیں سوالی تھیں۔ چوہب والے نے مجھے سر سے پاؤں تک گھور کر دیکھا اور پوچھا۔

”کہیں سے اکیلا ہاتھ آیا ہے؟“

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ”جناب۔“

چوہب والے نے شامو کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ارے شامو اسے کام پر لگا دے جا۔“

میں نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا کہ میں دلی جانا چاہتا ہوں۔ مجھے کام کی ضرورت نہیں ہے۔ اس پر چوہب والے نے مجھے اردو میں ایک موٹی سی گالی دی اور کہا۔

”اے تمہیں کام کی ضرورت نہیں ہے تو کیا ہوا ہمیں تو کام کی ضرورت ہے۔“

اس سے پیشتر کہ میں کوئی جواب دیتا شامو مجھے بازو سے پکڑ کر ایک کوٹھڑی میں لے آیا جہاں ایک آدمی چارپائی ڈالے بیٹھا تھا۔ شامو نے اس آدمی سے کہا۔

”دادے کہا ہے اس کا بھی بندوبست کر دو۔“

☆☆☆

میں نے دیکھا کہ دیواروں پر لوہے کی زنجیریں اور مختلف سائز کے پاؤں میں ڈالنے والے آہنی کڑے یا بیڑیاں لٹک رہی تھیں۔ میں گھبرا گیا اور وہاں سے بھاگنے کی تدبیریں سوچنے لگا۔ میری عقل کہہ رہی تھی کہ تم پھنس گئے ہو۔ تمہیں رات کے وقت لالٹین والے آدمی کے ساتھ نہیں جانا چاہیے تھا۔ اب تم بری طرح پھنس چکے ہو۔ اس آدمی نے چارپائی سے اٹھ کر میری ایک پنڈلی کو ہاتھ لگا کر دیکھا اور پھر دیوار پر لٹکے ہوئے لوہے کے دو کڑے اتار کر لے آیا۔ میں نے کچھ گھبراہٹ اور کچھ غصے کے ساتھ کہا۔

”یہ تم کیا کر رہے ہو؟“

شامو نے کہا۔

”ارے بھولے گھوڑا ہے۔ تمہارے پاؤں میں کڑا ڈال کر تمہارا ہی بندوبست کر رہا ہے۔ تھوڑا چین کرو بیٹھے۔“

جونہی وہ آدمی میری طرف بڑھا میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا اور اونچی آواز میں کہا۔

”خبردار جو میرے پاؤں میں کڑا ڈالنے کی کوشش کی۔“

اس کے ساتھ ہی شامو نے اتنی زور سے مجھے ایک تھپڑ مارا کہ میں پیچھے گر پڑا اور میرے ہونٹوں کے کنارے سے خون بہنے لگا۔ شامو مجھے گالیاں دینے لگا اس نے اپنے آدمی سے کہا۔

”اسے پکڑ کر ڈالو اس کے پاؤں میں بیڑیاں۔“

میں چکرا گیا تھا۔ سہم گیا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ لوگ بڑے ظالم جابر قسم کے لوگ ہیں اور مجھے قید کر رہے ہیں۔ اب میں ان کے قبضے میں ہوں۔ میرے پاؤں میں لوہے کے دو کڑے ڈال دیے گئے۔ ان کڑوں کے ساتھ گز ڈیڑھ گز کی ایک زنجیر بھی بندھی ہوئی تھی جس کی وجہ سے میں قدم قدم چل تو سکتا تھا مگر بھاگ نہیں سکتا تھا۔ شامو نے اس کوٹھڑی میں سے ایک کلہاڑی اٹھا کر مجھے دی اور کہا۔

”چل بے میرے ساتھ۔“

شامو مجھے کوٹھڑی سے نکال کر اس طرف بڑھا جہاں اس کے بندے والے درختوں کی کٹائی کر رہے تھے۔ میں ٹھیک طرح سے چل نہیں سکتا تھا مگر چلنے پر مجبور تھا۔ لوہے کے کڑے میرے پاؤں کو تکلیف دے

رہے تھے۔ وہاں جو مسلح پہرے دار لڑکوں کی نگرانی کر رہے تھے ان کے حوالے کر دیا گیا۔ انہوں نے مجھے بھی کام پر لگا دیا۔ میں نے ادھر ادھر لکڑی کے جال پر مزدوروں کو لکڑیاں کاٹتے دیکھا تو تھا مگر خود کبھی کسی درخت پر کلہاڑی نہیں چلائی تھی لیکن یہاں میں قیدی تھا۔ میں نے ذرا دیر کر دی تو ایک پہرے دار نے مجھے گالی دے کر ایک تھپڑ مارا اور کہا۔

”دیکھتا کیا ہے بے کام شروع کر۔“

میں نے مجبوراً درخت کاٹنا شروع کر دیا۔ دوسرے لڑکوں نے ایک نظر مجھے دیکھا اور پھر اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔ ان کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ جسم کمزور ہو گئے تھے۔ چہروں پر خوف کی سی کیفیت تھی۔

دوپہر تک میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ مشقت کرتا رہا۔ کسی لڑکے کو ایک دوسرے سے بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اگر غلطی سے کوئی لڑکا کسی لڑکے سے کوئی بات کرتا تو پہرے دار اسے مار مار کر اس کا برا حال کر دیتے۔ دوپہر کو ہمیں کھانے کے لیے دال اور باسی روٹی دی گئی۔ اس کے بعد پھر ہمیں کام پر لگا دیا۔

شام تک ہم مشقت کرتے رہے۔ میرا برا حال تھا۔ سارا جسم تھکاوٹ سے چور چور ہو گیا تھا۔ رات کو ہمیں ایک لمبی بیرک میں گھاس پھوس پر ڈال دیا گیا۔ بیرک میں صرف ایک لالٹین روشن تھی۔ دو پہرے دار بندوقیں لیے بیرک کے دونوں دروازوں پر بیٹھے پہرہ دے رہے تھے۔ تمام لڑکے اس قدر تھکن سے چور تھے کہ کسی کو ایک دوسرے سے بات کرنے کا ہوش نہیں تھا۔ سب گھاس پھوس پر گرنے کے تھوڑی دیر بعد ہی سو گئے۔

مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ سارا بدن درد کر رہا تھا۔ ہونٹ جہاں سے پھٹ گیا تھا وہاں ابھی زخم میں درد ہو رہا تھا۔ میں اپنے آپ کو کوس رہا تھا کہ میں کیوں اس آدمی کے ساتھ چل پڑا تھا۔ مگر اب پچھتانے سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ صرف وہاں سے فرار کی ترکیبیں ہی سوچ سکتا تھا جو بظاہر بہت مشکل دکھائی دیتا تھا۔

ایک تو یہاں آس پاس کوئی آبادی نہیں تھی۔ سارا علاقہ ویران جنگلاتی تھا۔ ہمیں روز صبح اٹھا دیا جاتا۔ ایک ایک گلاس چائے کا ایک باسی روٹی کے ساتھ دیا جاتا۔ اس کے بعد ہمیں جانوروں کی طرح ہانک کر جہاں کٹائی ہو رہی تھی وہاں پہنچا دیا جاتا اور ہم درخت کاٹنے کی مشقت میں لگ جاتے۔ مسلح پہرے دار ہر وقت ہماری نگرانی کرتے رہتے۔

اسی طرح جب ایک ہفتہ گزر گیا تو ایک دن ہم سب کے پاؤں میں سے لوہے کے کڑے اتار دیے گئے۔ جنگل کے اس علاقے کے تقریباً سارے سوکھے درخت ہم نے کاٹ ڈالے تھے۔ اس کے بعد ہمارے پاؤں میں بیڑیاں باندھ دی گئیں۔ بیڑیاں اس طرح باندھی گئی تھیں کہ ہم چل تو سکتے تھے مگر بھاگ نہیں سکتے تھے۔

دو دن تک ہم سے کوئی کام نہیں لیا گیا۔ ہمیں ندی پر لے جا کر نہلایا گیا۔ پھر سب لڑکوں کو جن کی مشقت اور کم خوراک سے پسلیاں نظر آنے لگی تھیں ایک ایک کرتا اور ایک ایک نیکر پہننے کو دی گئی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے ہمیں کسی اور مہم کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔

آخر یہ راز بھی کھل گیا۔

معلوم ہوا کہ ہمیں وہاں سے ایک بڑے ٹرک میں ڈال کر بمبئی لے جایا جا رہا ہے جہاں ہمیں ایک اور ایجنٹ کے ہاتھوں فروخت کر دیا جائے گا اور وہ ایجنٹ ہمیں کسی طریقے سے بحری جہاز میں سوار کرا کر ناجائز طریقے سے لے جائے گا جہاں ہمیں کسی گھنے جنگل کی کٹائی پر لگا دیا جائے گا۔ یہ بات مجھے ایک

لڑکے نے سرگوشیوں میں بتائی تھی۔ اتفاق سے ہمیں ایک دوسرے سے بات کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ اس لڑکے نے پہرے داروں سے یہ بات سنی تھی۔

میں اس انکشاف پر بڑا پریشان ہوا۔ میں کنویں سے نکل کر کھائی میں گرنے والا تھا۔ اگر ایک بار جنوبی افریقہ کے جنگلوں میں پہنچا دیا گیا تو پھر ساری زندگی وہاں سے رہائی نصیب نہیں ہوگی۔ سخت مشکل میں پھنس گیا تھا کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا مگر بھاگنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔

پاؤں میں زنجیر بندھی ہوئی ہونے کی وجہ سے میں بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ تیسرے دن رات کے وقت وہاں ایک بہت بڑا ٹرک آ کر کھڑا ہو گیا۔ ہمیں بیرک سے نکال کر اس ٹرک میں جانوروں کی طرح ٹھونس دیا گیا۔ ٹرک کے اندر دونوں جانب دیوار کے ساتھ لوہے کی کنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔

ہمارے پاؤں کی بیڑیاں کھول کر ہمارے پاؤں میں لوہے کی زنجیریں ڈال کر زنجیروں کے کنڈے ٹرک کے کنڈوں میں پھنسا دیے گئے۔ ٹرک چاروں طرف سے بند تھا۔ صرف دیواروں کے اوپر کچھ سوراخ رکھے گئے تھے جن میں سے تازہ ہوا اندر آ رہی تھی۔ ٹرک کے اندر اس قدر حبس تھا کہ ہم سب قیدی لڑکوں کا برا حال ہو رہا تھا۔

آخر ٹرک چل پڑا۔ ٹرک کے چلنے سے اندر تازہ ہوا آئی تو ہم سب کی جان میں جان آئی۔ ڈرائیور کی سیٹ کے عقب میں ایک چھوٹی کھڑکی تھی جس میں سے وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد جھانک کر قیدی لڑکوں کو دیکھ لیتا تھا۔ ساری رات ٹرک چلتا رہا۔ دن نکلا تو ٹرک سڑک سے ہٹ کر جنگل میں کسی جگہ کھڑا کر دیا گیا۔ یہاں ہمیں ٹرک سے نکال کر ایک جگہ درختوں کے درمیان تھوڑا بہت چلایا پھرایا گیا۔

چار مسلح پہرے دار ہمارے آگے پیچھے تھے۔ اس وقت ہمارے پاؤں کھلے تھے۔ مگر کسی میں اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ وہ بھاگ سکتا۔ یہاں ہمیں چنے اور باسی روٹی کھانے کو دی گئی۔ ایک بار پھر ہمیں سخت پہرے میں نہلایا گیا۔ اس کے بعد ہم سب قیدی لڑکوں کے ایک ایک پاؤں میں رسی باندھ کر ایک دوسرے سے اس طرح باندھ دیا گیا کہ ہم چل پھر تو سکتے تھے مگر بھاگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بندوق لیے ایک پہرے دار ہر وقت ہمارے سر پر موجود ہوتا تھا۔

دوپہر کو ہمیں پتلی دال کے ساتھ دو دو روٹیاں کھانے کو دی گئیں۔ اسی طرح رات کو بھی ہمیں یہی کھانا دیا گیا جب رات کا اندھیرا چھانے لگا تو ہمیں واپس ٹرک میں مال مویشیوں کی طرح دھکیل کر زنجیروں کے ساتھ باندھ دیا گیا اور ٹرک چل پڑا۔

تین راتوں کے سفر کے بعد ہم ممبئی پہنچ گئے۔

ان لوگوں نے ٹرک ممبئی کے ساحل سمندر سے ہٹ کر ایک ویران جگہ پر کھڑا کیا تھا۔ یہاں دو آدمی آئے۔ انہوں نے ہمارا معائنہ کیا اور چلے گئے۔ یہاں ہمیں بتایا گیا کہ ہم جنوبی افریقہ جا رہے ہیں جہاں ہم محنت مزدوری کریں گے اور ہمیں نئے کپڑے بھی ملیں گے اور ہر مہینے اتنی تنخواہ دی جائے گی کہ ہم اپنے گھر والوں کو بھی پیسے بھیج سکیں گے۔ ہمیں وہاں پوری آزادی ہوگی اور ہم شہر کی سیر بھی کر سکیں گے۔ یہ سب جھوٹے دلاسے دینے والی باتیں تھیں۔ ہم سب لڑکوں کو معلوم تھا کہ ہم ایک کنویں سے نکل کر دوسرے کنویں میں گر رہے ہیں۔

میرا دل یہ سوچ سوچ کر بیٹھا جا رہا تھا کہ اگر میں بھی ان کے ساتھ جنوبی افریقہ چلا گیا تو پیچھے میرے

ماں باپ بہن بھائیوں کا تو برا حال ہو جائے گا۔ میں تو انہیں یہ بھی نہیں لکھ سکوں گا کہ میں کہاں ہوں اور کس حال میں ہوں۔ وہ تو یہی سمجھیں گے کہ میں کسی حادثے میں ہلاک ہو چکا ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔ میرا کیا حشر ہونے والا ہے۔ اس سے پہلے مجھے اس قسم کی سنگین صورت حال کا کبھی سامنا نہیں ہوا تھا۔ ہمیں سمندر کے کنارے ایک ویران بیرک میں بند کر دیا گیا۔ ہمیں دوسرے ایجنٹ کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ یہاں ہماری نگرانی کرنے والے نئے لوگ تھے۔ ان کے پاس رائفلیں تھیں۔ بڑے ایجنٹ نے ہم سب کو ایک قطار میں کھڑے کر کے خبردار کر دیا تھا کہ اگر کسی نے بھاگنے کی کوشش کی تو اسے وہیں گولی مار دی جائے گی۔

بیرک میں ہمارے پاؤں میں زنجیریں ڈال دی گئی تھیں۔ کسی لڑکے کے فرار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ معلوم ہوا کہ آدھی رات کے بعد سمندر کے کنارے ایک اسٹیمر آئے گا جو ہمیں لے کر روانہ ہو جائے گا۔

میرے سامنے فرار ہونے کا صرف یہی ایک موقع تھا کہ جب تک اسٹیمر میں سوار نہیں ہوتا یہاں سے کسی طرح فرار ہو جاؤں۔ ایک بار دوسرے لڑکوں کے ساتھ اسٹیمر میں ٹھونس دیا گیا تو پھر ساری زندگی اس عذاب سے نجات حاصل نہ کر سکوں گا مگر مجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ فرار کس طرح ہوا جائے۔ دونوں پاؤں لوہے کی زنجیر سے بندھے ہوئے تھے۔ زنجیر کے ساتھ چلنا مشکل تھا۔ بھاگ کیسے جاتا۔ اس وقت ابھی رات کا پہلا پہر تھا۔ باقی جتنے بھی لڑکے تھے سب ان لوگوں نے اپنے علاقے کے دور دراز کے دیہات سے پکڑے ہوئے تھے۔ کچھ غریب کسانوں اور محنت مزدوری کرنے والوں کے کم عمر لڑکے تھے۔ ان میں صرف میں ہی ایک پڑھا لکھا تھا۔

ان سب کے رویے سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہوں نے اپنی اس مصیبت کو قبول کر لیا تھا اور ان میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ فرار ہوں۔ لیکن میں ہر حالت میں فرار ہونا چاہتا تھا لیکن فرار کی کوئی کارگر تدبیر سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ میرے پاس صرف چار پانچ گھنٹے ہی باقی تھے۔ اگر ان چار پانچ گھنٹوں میں یہاں سے بھاگنے میں کامیاب نہیں ہوتا تو پھر سمندر پار جنوبی افریقہ کے جنگلوں سے نکل کر اپنے وطن واپس آ جانا مجھے ناممکن لگتا تھا۔

میں سخت ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا اور مجھے بالکل نیند نہیں آ رہی تھی۔ رات آہستہ آہستہ گزرتی جا رہی تھی۔ باہر بھی خاموشی تھی۔ اس خاموشی میں صرف کبھی کبھی سمندر کی لہروں کی آواز آ جاتی تھی۔ سارے لڑکے سو گئے تھے۔

مجھے ان کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ میں جاگ رہا تھا اور بھاگ جانے کو بے چین تھا مگر میرے پاؤں میں زنجیر بندھی ہوئی تھی۔ میں نے ہاتھ سے زنجیر کو ٹٹول کر دیکھا۔ یہ بڑی مضبوط زنجیر تھی اور اس ایک زنجیر کو تمام لڑکوں کے پاؤں میں سے گزار کر باندھ دیا گیا تھا۔ میں نے بیرک کے دروازے کی طرف دیکھا۔ مسلح پہرے دار لالٹین کی روشنی میں صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ اسٹول پر بالکل سیدھا ہو کر بیٹھا ہوا تھا اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد سوئے ہوئے لڑکوں پر نظر ڈال لیتا تھا۔ میں نے خدا سے دعا مانگی کہ یا اللہ پاک میرے یہاں سے فرار ہونے کا غیب سے کوئی سبب پیدا کر دے۔

یہ دعا مانگنے کے چند لمحوں کے بعد مجھے اپنے کانوں میں کسی کی دھیمی سی آواز سنائی دی۔ پہلے میں

سمجھا کہ میرے آس پاس سوئے ہوئے لڑکوں میں سے کوئی آپس میں سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ میں نے ان پر توجہ نہ دی۔ سب سو رہے تھے۔ دوسری بار پھر وہی چیخ سی آواز سنائی دی۔ یہ کسی عورت کی آواز تھی۔ میں سنبھل گیا۔ میں لیٹا ہوا تھا مگر جاگ رہا تھا۔ تیسری بار عورت کی دھیمی آواز کے ساتھ مجھے اس کے الفاظ بھی صاف سنائی دیئے۔ اس نے کہا۔

"اٹھو، باہر نکل آؤ۔ میں کھڑی ہوں۔"

میں بالکل مبہوت رہ گیا۔ پھر کچھ کر گیا کہ یہ کسی بھوت پریت کی آواز ہے۔ چوتھی بار پھر وہی مدھم آواز آئی۔

"ڈرو نہیں۔ میں کوئی چڑیل نہیں ہوں۔ میں ترشا ہوں۔ تم نے میری آواز نہیں پہچانی؟ میں تمہیں یہاں سے نکالنے آئی ہوں۔"

میں بے اختیار ہو کر اٹھ بیٹھا۔ پھر فوراً خیال آیا کہ پہرے دار نے دیکھ لیا تو وہ مجھے گولیوں سے بھون دے گا۔ ترشا نے کان میں کہا۔

"پہرے دار کا خیال نہ کرو۔ میں نے اسے گہری نیند سلا دیا ہے۔"

میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ لالٹین کی روشنی میں پنچ پہرے دار سر نیچے ڈالے سو رہا تھا۔ زنجیر کھل گئی تھی میں آہستہ سے اٹھا اور سوئے ہوئے لڑکوں کے درمیان احتیاط سے پاؤں اٹھاتا دروازے کی طرف بڑھا۔ پہرے دار پنچ سچ بڑی گہری نیند سو رہا تھا اور خراٹے بھی لے رہا تھا۔

میں اس کے قریب سے ہو کر بارک سے باہر نکل آیا۔ باہر آسمان پر چاند نکلا ہوا تھا۔ چاندنی رات میں مجھے بارک کی دیوار کے پاس ایک لڑکی کھڑی نظر آئی۔ میں اس کی طرف جاتے ڈر رہا تھا کیونکہ اب یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ ترشا ایک نارمل لڑکی نہیں ہے بلکہ واقعی ایک بدروح ہے۔ ترشا نے مجھے بچپاتے دیکھا تو خود چل کر میرے پاس آ گئی۔ اس نے نیلے رنگ کی بڑی خوب صورت ریشمی ساڑھی پہن رکھی تھی اور بالوں میں سفید پھول سجے ہوئے تھے۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کے لباس سے ایسے پھولوں کی خوشبو آ رہی تھی جو میں نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔

"میرے ساتھ آ جاؤ۔"

□□□

ترشا میرا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف چل پڑی۔ مجھے وہاں چار آدمی چاندنی رات میں نظر آئے جو رائفلیں لیے گشت کر رہے تھے۔ میں نے ترشا کو اس طرف متوجہ کیا۔ اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"گھبراؤ نہیں۔ ہم انہیں نظر نہیں آئیں گے۔"

اور واقعی ہم انہیں نظر نہ آئے۔ ہم ان کے درمیان سے ہو کر گزر گئے اور کسی نے ہماری طرف توجہ نہ کی۔ ترشا نے کہا۔

"جب تک میں نے تمہارا ہاتھ پکڑ رکھا ہے تم کسی کو نظر نہیں آؤ گے۔ ہاتھ چھوڑ دوں گی تو تم سب کو نظر آنے لگو گے۔"

میں نے پوچھا۔

"ترشا! تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں سخت مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔"

بھٹکی ہوئی بدروح ترشا نے کہا۔

"جس دنیا میں ہم بھٹکی ہوئی بدروحیں رہتی ہیں اس دنیا کا اپنا ایک نظام ہے۔ اپنے کچھ اصول ہیں۔ کچھ قانون ہیں۔ جب ہمیں اجازت مل جاتی ہے ہم انسانوں کی دنیا میں آ جاتی ہیں۔ مجھے اچانک تمہارا خیال آ گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ تم بہت بڑی مصیبت میں ہو۔ بس میں اجازت لے کر تمہاری مدد کرنے آ گئی۔"

میں نے ترشا سے کہا۔

"تم جب پہلی بار مجھے ریل گاڑی میں اپنے دادا کے ساتھ ملی تھیں تو مجھے خیال بھی نہیں آیا تھا کہ تم کوئی بھٹکی ہوئی روح ہو۔ تم نے بھی مجھ پر ظاہر نہیں کیا تھا۔ جب تم نے مجھے جوگی کی پہاڑی والے مندر کی چڑیل سے بچایا تھا تو اس وقت بھی تم نے مجھ پر ظاہر نہیں کیا تھا کہ تم کوئی بھٹکی ہوئی روح ہو۔ اب تم نے مجھے یہ سب کیسے بتا دیا؟"

ترشا کہنے لگی۔

"اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ تمہیں شمشان گھاٹ کے بڈھے نے میرے بارے میں بہت سی من گھڑت باتیں بتائی تھیں۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ میں جس کسی کو نظر آ جاؤں پھر میں اسے دوسرے دن آ کر مار ڈالتی ہوں کیونکہ میں بھوت ہے۔ میں ایسا نہیں کرتی۔ بس میں نے دل میں سوچ لیا تھا کہ اب تم سے جب بھی ملاقات ہو گی تو تم پر اپنی اصلیت ظاہر کر دوں گی۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں ایک بھٹکی ہوئی بد روح ہوں مجھے بھٹکنے اور سکون نصیب نہیں ہے لیکن میں شیطانی بدروح نہیں ہوں کیونکہ میں نے زندگی میں کسی کو قتل نہیں کیا تھا بلکہ مجھے میرے گاؤں کے لوگوں نے پکڑ کر چتا پر بٹھا کر جلا دیا تھا اور میں مر گئی تھی۔ میں نے کسی سے انتقام بھی نہیں لیا۔ میں مصیبت زدہ انسانوں کی مدد کر کے اپنے پاپوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتی ہوں تاکہ میرے پاپوں کی سزا کم ہو جائے۔ میں نے بھی زندگی میں بڑے پاپ کیے ہیں اور پردو جو کوئی چھوٹے سے چھوٹا پاپ بھی کرتا ہے اسے اس کی سزا مرنے کے بعد بھگتنی پڑتی ہے اور جب تک ایک پاپی روح اپنے پاپوں کی سزا بھگت کر پاک صاف نہ ہو جائے وہ آسمانوں کی پاکیزہ دنیا میں داخل نہیں ہو سکتی اور اس دنیا کی فضاؤں میں ہی بھٹکتی رہتی ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"تمہیں میرا خیال کیوں آ گیا تھا؟"

ترشا نے کہا۔

"اس لیے کہ تم مجھے اچھے لگے تھے۔ میں نے جب پہلی بار تمہیں ریل گاڑی میں دیکھا تھا تو تم پہلی نظر میں ہی مجھے اچھے لگے تھے۔ بس پھر تمہارا خیال مجھے کیوں نہ آتا۔"

مجھے ترشا کی زبانی یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ اگر میں اسے چاہتا تھا تو وہ بھی مجھ سے محبت کرتی تھی۔ اگر وہ کوئی بھٹکی ہوئی روح ہے تو کیا ہوا، محبت بھی

چوہدری محمد ارشد ---- کمالیہ
پرورده طوفان کو کشتی کی نہیں حاجت
موجوں کے تلاطم میں ساحل نظر آتا ہے

خرم حمید چوہدری ---- ٹوبہ ٹیک سنگھ
واعظ نظر ہے عشق تو ہرگز نہ دعا مانگ
قربان ہو کے حسن پہ اور قول بہانہ مانگ

سید حشمت ---- کبیر اشریف
بچھڑے ہوئے ہوا ہے مگر آج بھی رہا
وہ رابطہ قدیم جو شاخ و شجر میں تھا

جاوید اختر ---- کمالیہ
پھیلا ہوا ہے رنگ فضاؤں میں نور کا
آنچل میں چاندنی ہے کہ چہرہ حضور کا

رانا اسرار احمد خان ---- کمالیہ
پھیلا تو میری ذات کا عنواں وہ شخص
سمٹا تو ایک نام میں تکمیل ہو گیا

قمر الدین انصاری ---- کمالیہ
پاس تھا ناکامی صیاد کا اے ہم سفر
ورنہ میں اور اڑ کے آتا دانے کے لیے

ایک روحانی جذبہ بیدار ہو جاتا ہے اور میں اپنی نو عمری کے جس حصے میں سے گزر رہا تھا اس وقت انسان کی روح پوری طرح بیدار ہوتی ہے۔

ترشنا مجھے ساتھ لے کر اس علاقے سے کافی دور نکل آئی تھی۔ جنگل اور سمندر ہمارے پیچھے رہ گیا تھا اور دور بہت فاصلے پر بمبئی شہر کی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے ترشنا سے کہا۔

"مجھے اپنے بہن بھائی اور ماں باپ بہت یاد آ رہے ہیں۔ میں ان کے پاس واپس جانا چاہتا ہوں مگر میرے پاس ریل گاڑی کا ٹکٹ خریدنے کے پیسے نہیں ہیں اور میں اس دفعہ بغیر ٹکٹ سفر کرنے سے ڈرتا ہوں کہ کہیں پھر کوئی ٹی ٹی مجھے راستے میں نہ اتار دے۔"

ترشنا مسکرا رہی تھی۔ چاندنی رات میں اس کا چہرہ بڑا خوب صورت لگ رہا تھا۔ کہنے لگی۔

"میں تمہیں ٹکٹ لے دوں گی۔ اس کی تم فکر نہ کرو۔" میں نے اس سے کہا۔

"ابھی ساری رات پڑی ہے۔ دلی امرتسر کی طرف دن کے وقت ہی بمبئی سے گاڑی چلتی ہے۔ تم ایسا کرو مجھے ریلوے اسٹیشن کا راستہ بتا دو۔"

وہ کہنے لگی۔

"میں تمہارے ساتھ ریلوے اسٹیشن پر جاؤں گی۔ مجھے تمہیں ٹکٹ لے کر بھی تو دینا ہے۔"

میں نے کہا۔ "بمبئی کا اسٹیشن تو یہاں سے کافی دور ہوگا۔"

وہ بولی۔ "ہمارے لیے کوئی شے دور یا نزدیک نہیں ہوتی۔ ہم تھوڑی دیر میں اسٹیشن پہنچ جائیں گے۔"

باتیں کرتے ہوئے اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ اس نے دوبارہ میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگی۔

"اب ہم بہت جلد اسٹیشن پر پہنچ جائیں گے۔"

مجھے نہیں پتا کہ پھر کیا ہوا۔ ہم نے ایک بڑی سڑک عبور کی۔ اس کے بعد سامنے والے میدان میں داخل ہو گئے۔ اس میدان میں سے گزرے تو ہم بمبئی شہر کے روشنیوں سے جگمگاتے علاقے میں آ گئے تھے۔ ترشنا نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ کہنے لگی۔

"اب لوگوں کو تم نظر آنے لگے ہو۔ میں نظر نہیں آ رہی۔ صرف تم مجھے دیکھ سکتے ہو۔ وہ سامنے بوری بندر کا اسٹیشن ہے۔"

میں نے نگاہیں اٹھا کر سامنے دیکھا۔ واقعی کچھ فاصلے پر بمبئی کا عظیم الشان عمارت والا بوری بندر اسٹیشن موجود تھا۔ اگرچہ اس وقت رات کے دس گیارہ بجے کا وقت ہوگا لیکن سڑکوں پر گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ صرف بسیں نہیں چل رہی تھیں۔ ہم بہت بڑے چوراہے کو پار کر کے اسٹیشن کے بڑے دروازے کے سامنے آ گئے۔ ترشنا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ کہنے لگی۔

"اب تم کسی کو نظر نہیں آ رہے۔ ہم بڑی آسانی سے گیٹ میں سے گزر جائیں گے۔"

گیٹ میں سے گزرنے کے بعد ہم پلیٹ فارم پر آ گئے۔ ترشنا نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ کہنے لگی۔

"تمہاری گاڑی اسی پلیٹ فارم پر سے جائے گی۔ تم یہاں بنچ پر بیٹھو میں تمہارے لیے ٹکٹ لے کر ابھی آتی ہوں۔"

ترشنا کی بھٹکی ہوئی روح مجھے ایک بنچ پر بٹھا کر چلی گئی۔

میں اسے پلیٹ فارم کی روشنیوں میں گیٹ کی طرف جاتے دیکھ رہا تھا۔ عجیب بات تھی میں اسے دیکھ رہا تھا لیکن دوسرا کوئی انسان اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ پھر وہ میری نظروں سے بھی اوجھل ہو گئی۔ میرا خیال ہے بمشکل تین منٹ گزرے ہوں گے کہ مجھے دور سے ترشنا آتی نظر آئی۔ وہ میرے پاس

آ کر بنچ پر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ میں ریلوے کا ٹکٹ تھا۔ کہنے لگی۔

"میں فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لائی ہوں۔ یہ بمبئی سے امرتسر تک کا ٹکٹ ہے۔" میں نے کہا۔

"تم فرسٹ کلاس کا ٹکٹ خواہ مخواہ لے آئی ہو میں تو ہمیشہ تھرڈ کلاس میں سفر کرتا ہوں۔"

وہ بولی۔

"لیکن میں چاہتی ہوں کہ تم اس دفعہ فرسٹ کلاس میں سفر کرو۔"

میں نے کہا۔

"میرا حلیہ اور میرا لباس تو بالکل تھرڈ کلاس کے مسافروں جیسا ہے۔ فرسٹ کلاس کے ڈبے میں بالکل اجنبی لگوں گا۔ کہیں ٹی ٹی مجھے پکڑ نہ لے کہ میں نے یہ ٹکٹ کہاں سے چرایا ہے۔"

ترشنا نے ذرا تیکھی آواز میں کہا۔

"میں اس ٹی ٹی کو ایسا مزا چکھاؤں گی کہ ساری زندگی یاد رکھے گا۔"

میں نے کہا۔

"لیکن تم تو مجھ سے جدا ہو جاؤ گی۔"

وہ بولی۔

"اب میں تم سے جدا نہیں ہو سکتی۔ تم سے الگ ضرور ہو جایا کروں گی۔ مگر تم سے جدا نہیں ہوں گی۔ مجھے تمہارا ہر وقت خیال رہے گا۔ تم جب بھی مجھے یاد کرو گے میں تم سے ملنے آ جاؤں گی۔"

پھر اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولی۔

"تم مجھے یاد کرو گے نا؟"

میری عمر ہی جذبات کے شباب کی عمر تھی۔ میں اس کی محبت میں سرشار ہو رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"میں تمہیں ہر وقت یاد کروں گا ترشنا۔"

وہ بڑی خوش ہوئی کہنے لگی۔

"میں تمہیں ایک بات بتاتی ہوں۔ تم امرتسر میں رہتے ہو۔ مجھے معلوم ہے۔ امرتسر شہر میں سیتلا مندر کے پیچھے ایک مرگھٹ یعنی شمشان گھاٹ ہے یعنی وہ جگہ جہاں ہندو لوگ اپنے مردوں کو جلاتے ہیں۔ جب بھی تمہیں میری یاد آئے اور تم مجھے ملنا چاہو تو اس مرگھٹ میں سورج غروب ہونے کے بعد آ جانا اور مجھے آہستہ سے تین بار آواز دینا۔ میں آ جاؤں گی۔"

ہم باتیں کرتے رہے۔ اتنے میں ٹرین پلیٹ فارم پر آ کر لگ گئی۔ ترشنا نے ٹرین کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"تمہاری گاڑی آ گئی ہے۔ میرے ساتھ آؤ میں تمہیں خود فرسٹ کلاس میں بٹھاتی ہوں۔"

تھرڈ اور انٹر کلاس کے مسافر اپنا سامان لیے ٹرین میں سوار ہونے لگے تھے۔ فرسٹ کلاس کا ایک ڈبہ خالی پڑا تھا۔ ہم اس ڈبے میں جا کر بیٹھ گئے۔ میں نے کہا۔

"اس سے پہلے میں نے فرسٹ کلاس میں کبھی سفر نہیں کیا۔"

ترشنا بولی۔

"تم آرام سے اپنے گھر پہنچو گے تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔"

پھر اچانک اس نے میری طرف دیکھا اور کہا۔

"تمہارے پاس تو پیسے بھی نہیں ہوں گے۔"

میں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔"

وہ بولی۔

"نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کیا راستے میں تم بھوکے رہو گے؟"

اس نے اپنے ہاتھ کی ایک مٹھی میرے سامنے بند

کی اور جب کھولی تو اس میں سو سو کے دو نوٹ تھے کہنے لگی۔
"یہ تم اپنے پاس رکھو۔"
دو سو روپے اس زمانے میں بہت بڑی رقم ہوا کرتی تھی۔ ایک آدمی اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ ہمارے ڈبے میں سوار ہوا تو ترشنا نے میرے کان کے قریب ہو کر کہا۔
"اچھا اب میں چلتی ہوں۔ پھر ملیں گے۔"
یہ کہہ کر وہ ڈبے سے اتر گئی۔ میں نے کھڑکی میں سے سر نکال کر باہر دیکھا۔ ترشنا پلیٹ فارم پر کہیں بھی نظر نہ آئی۔ وہ جا چکی تھی۔ پتہ نہیں کیوں اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ میں تنہا رہ گیا ہوں۔ ترشنا سے واقعی مجھے محبت ہو گئی تھی۔
میں اسے محبت ہی کہوں گا اور کیا کہہ سکتا ہوں۔
میں فرسٹ کلاس میں سفر کرتے ہوئے اپنے شہر امرتسر پہنچ گیا۔ والد صاحب نے تھوڑی بہت پٹائی کی اور مجھے نویں جماعت میں داخل کرا دیا۔ مگر اسکول میں میرا دل بالکل نہیں لگتا تھا۔
ایک بار پھر مجھے محسوس ہونے لگا کہ مجھے زنجیریں ڈال دی گئی ہیں۔ میں ان زنجیروں کو توڑ کر ایک بار پھر فرار ہونے کے بارے میں سوچنے لگا۔
ترشنا نے مجھے جو دو سو روپے دیے تھے ان میں سے صرف بیس روپے ہی خرچ ہوئے تھے۔ باقی سارے پیسے میرے پاس ہی تھے۔ جو میں نے اپنی چھوٹی سی الماری میں کتابوں کے نیچے چھپا کر رکھ دیے تھے۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس دفعہ بغیر ٹکٹ سفر نہیں کرنا چاہتا تھا۔
مجھے بنگال کے جنگل اور کلکتے کی بارشیں بہت یاد آ رہی تھیں۔ چنانچہ میں نے کلکتے کی طرف فرار ہونے کا پروگرام بنانا شروع کر دیا۔ تیاریاں تو مجھے کوئی کرنی نہیں تھیں۔ جو کپڑے پہنے ہوئے تھا ان ہی کپڑوں میں نکل جانا تھا۔ زیادہ سے زیادہ دانت صاف کرنے کے لیے ایک ٹوتھ برش جیب میں رکھ لینا تھا۔ نیو تھیٹرز کی فلموں میں ایک ہیروئن آیا کرتی تھی جو مجھے بے حد اچھی لگتی تھی۔
اس کا فلمی نام جمنا دیوی تھا۔ بہت بے قدری دبلی پتلی لڑکی تھی جو اکثر خاموش رہتی تھی۔ کسی بھی فلم میں میں نے اسے زیادہ باتیں کرتے نہیں دیکھا تھا۔ نیو تھیٹرز کی فلم "زندگی" تازہ تازہ ریلیز ہوئی تھی جس میں جمنا نے سہگل کے ساتھ ہیروئن کا کردار ادا کیا تھا۔ اس فلم میں جمنا کے پراسرار خاموش کردار نے میرے جذبۂ عشق کے لیے جلتی پر تیل کا کام کیا۔
میں نے سوچ رکھا تھا کہ کلکتے جا کر پہلا کام یہ کروں گا کہ جمنا دیوی کے درشن کروں گا۔ "زندگی" فلم کا آخری سین ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہتا تھا۔ جب جمنا جنگل میں دریا کے کنارے ایک جھونپڑی میں آخری سانس لے رہی ہوتی ہے اور سہگل اس کے سرہانے بیٹھا لوری سناتا ہے۔
سو جا راج کماری سو جا۔ جب وہ لوری گا چکتا ہے تو جمنا کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں اور سہگل دل گداز لہجے میں اسے مخاطب کر کے کہتا ہے۔
"سو گئیں راج کماری ہمیشہ کے لیے سو گئیں۔"
اور خاموشی سے اٹھ کر ناریل کے درختوں میں سے گزرتا دریا کی طرف چلا جاتا ہے۔ میں نے ریلوے اسٹیشن پر جا کر پتا کیا کہ کلکتے کون کون سی گاڑیاں کس کس وقت جاتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ ایک تو ہوڑہ ایکسپریس ہے جو صبح کے ساڑھے نو بجے چلتی ہے۔ دوسری گاڑی کلکتہ میل ہے جو رات کے وقت آٹھ بجے پشاور سے آتی ہے اور ساڑھے آٹھ بجے امرتسر سے روانہ ہو جاتی ہے۔

میرے لیے رات کے آٹھ بجے والی گاڑی زیادہ موزوں اور محفوظ تھی کیونکہ اس وقت والد صاحب کے جاسوس مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ والد صاحب کے یہ جاسوس کوئی پیشہ ور جاسوس نہیں تھے اور میرے پیچھے ہر وقت میری جاسوسی نہیں کرتے تھے۔ اصل میں والد صاحب کے جاننے والوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ ان میں ہر قسم کے لوگ شامل تھے۔ چنانچہ ریلوے اسٹیشن پر بھی والد صاحب کے دوست موجود تھے۔ یہ لوگ مجھے دیکھتے ہی سمجھ جاتے کہ میں گھر سے فرار ہو رہا ہوں۔ میری شہرت ہی ایسی تھی چنانچہ وہ مجھے اسٹیشن پر ہی روک لیتے تھے۔ رات کے وقت ریلوے اسٹیشن پر ان لوگوں سے بچ کر نکلا جا سکتا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے رات کی گاڑی پر فرار ہونے کا پروگرام طے کر لیا۔
ایک دن پہلے میں نے اپنے جوتوں کو پالش کیا۔ اپنا رومال بھی دھو کر استری کر لیا۔ دوسرے دن مجھے امرتسر سے بھاگ جانا تھا۔ مجھے بڑی خوشی ہو رہی تھی کہ کل میں اسکول نہیں جاؤں گا اور حساب کے ماسٹر صاحب میرا کان نہیں مروڑیں گے۔ حساب میں میں بے حد کمزور تھا۔ حساب کبھی میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔
حساب کے پیریڈ میں ماسٹر صاحب بغیر یہ سوچے کہ اس طالب علم پر میری عمر سے بڑی موٹی اور تنگ آمیز سرزنش کا کیا اثر پڑے گا۔ سب طالب علموں کے سامنے میری بے عزتی کر دیا کرتے تھے۔ اور مجھے میرے نام سے نہیں بلکہ کھوتے کہہ کر بلاتے تھے جو مجھے سخت ناگوار گزرتا تھا۔ گھر سے بھاگنے کا میں نے سوائے اپنے چھوٹے آرشت بھائی مقصود کے اور کسی سے ذکر نہیں کیا۔ اس کو میں نے اس لیے راز دار بنایا تھا کہ وہ بھی اسکول اور گھر سے بھاگ جانے کے پروگرام بنایا کرتا تھا۔ مگر بھاگا کبھی نہیں تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں اس بار کلکتے جا رہا ہوں اور نیو تھیٹرز کی ہیروئن جمنا دیوی سے بھی ملوں گا تو وہ بڑا خوش ہوا کہنے لگا۔
"تمہارے پاس ریل گاڑی کا کرایہ ہے؟"
میں نے اسے بتایا کہ میرے پاس ڈیڑھ سو سے زیادہ روپے موجود ہیں۔ اس نے مشتبہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ "تم نے کہیں چوری تو نہیں کی۔"
میں نے کہا۔ "بالکل نہیں۔ یہ میرے اپنے پیسے ہیں۔"
وہ بولا۔
"تمہارے پاس یہ پیسے کہاں سے آ گئے ہیں؟"
میں نے کہا۔
"پرسوں میں کمپنی باغ کی سیر کر رہا تھا کہ ایک جگہ گھاس میں کالا بٹوہ گرا ہوا دیکھا۔ اٹھا کر کھولا تو اس میں ایک سو اسی روپے تھے۔ میں نے بٹوہ وہیں پھینک دیا اور پیسے اپنے پاس رکھ لیے۔"

□ □ □

میں آرشت بھائی کو ترشنا کے بارے میں نہیں بتانا چاہتا تھا۔ آرشت بھائی مجھ سے دو ڈھائی سال ہی چھوٹا تھا اور ہماری آپس میں بڑی دوستی تھی۔ ہم دونوں کا مزاج بھی ایک ہی تھا۔ بارش اور نیو تھیٹرز کے گانے اور فلم چترلیکھا کے گیت میری طرح اسے بھی بہت پسند تھے۔ وہ واٹر کلر میں جنگلوں اور سمندروں کی تصویریں بھی بنایا کرتا تھا۔ تصویر بنا کر انہیں لپیٹ کر اپنے لکڑی کے صندوق میں رکھ دیتا تھا۔ سوائے میرے کسی کو دکھاتا نہیں تھا۔ کسی کے سامنے تصویر بھی نہیں بناتا تھا۔ تصویر بناتے وقت اگر کوئی اس کے پاس آ کر تصویر دیکھنے لگتا تو آرشت بھائی کا چہرہ غصے میں لال ہو جاتا تھا اور وہ سخت لہجے

میں تصویر دیکھنے والے کو جھڑک دیتا تھا کہ تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟" کہنے لگا۔

"یار پچھلے کئی فلمیں بھی کلکتے میں ہی بنی تھیں۔ اس فلم میں راموداری نے بڑے زبردست گانے گائے ہیں۔ اگر ہو سکے تو کلکتے میں راموداری کو ضرور ملنا۔"

میں نے کہا۔

"سب سے پہلے تو میں جمنا دیوی سے ملوں گا۔ اس کے بعد کوئی دوسرا کام کروں گا۔"

آرشت بھوئی نے کہا۔

"میں اسٹیشن پر تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

میں نے انکار کیا۔

"اگر ہم دونوں ساتھ ساتھ ریلوے اسٹیشن پر گئے تو کوئی نہ کوئی جاسوس ضرور ہمارے پیچھے لگ جائے گا اور پھر والد صاحب کو خبر کر دے گا اور میں کلکتے نہیں جا سکوں گا۔"

آرشت بھوئی بولا۔

"ٹھیک ہے پھر تم اکیلے ہی چلے جانا۔"

میں نے قمیص پاجامہ پہن رکھا تھا۔ پاجامہ پٹھان ٹائپ کا تھا جس کی دو جیبیں تھیں۔ ایک جیب میں میں نے ٹوتھ برش رکھا اور قمیص کی جیب میں ایک سو اسی روپے کاغذ میں لپیٹ کر رکھ لیے۔

گاڑی یعنی کلکتہ ایکسپریس رات کے ساڑھے آٹھ بجے چھوٹتی تھی۔ میں ساڑھے سات بجے ہی گھر سے نکل کر کچھ دیر تک کمپنی باغ میں پھرتا رہا۔ پھر اسٹیشن پہنچ گیا۔ اسٹیشن کی ایک جانب کھڑے ہو کر میں نے بڑی ہوشیاری سے جائزہ لیا کہ وہاں کوئی اپنا محلے دار یا واقف تو نہیں ہے۔ مجھے کوئی ایسا آدمی دکھائی نہ دیا۔ میں اوپر سے ہو کر بکنگ دفتر پہنچ گیا۔ امرتسر سے کلکتے تک کا تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لیا اور تیز تیز چلتا گیٹ میں سے گزر کر پلیٹ فارم پر آ گیا۔ پلیٹ فارم پر آتے ہی میں آخری سرے پر جا کر ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ وہاں اردگرد کوئی آدمی نہیں تھا۔ جب گاڑی کے آنے میں پانچ سات منٹ رہ گئے تو میں اٹھ کر وہیں بنچ کے پیچھے ٹہلنے لگا۔

پلیٹ فارم پر بہت بڑی گھڑی لگی ہوئی تھی۔ میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسے دیکھ لیتا تھا۔

لاہور کی طرف سے جب کلکتہ ایکسپریس شور مچاتی پلیٹ فارم میں داخل ہوئی تو میں پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ٹرین رکی تو میں تھرڈ کلاس کا ڈبہ تلاش کرنے لگا۔ مسافروں کا کافی رش تھا۔ آخر میں تھرڈ کلاس کا ایک ڈبہ نظر آ گیا اور سیٹ پر بیٹھنے کے بجائے ڈبے کے دوسرے دروازے کے پاس جا کر فرش پر ہی بیٹھ گیا اور ٹرین کے چلنے کی دعا مانگنے لگا۔ میں نے اپنا چہرہ دروازے کی طرف کر رکھا تھا تاکہ اگر کوئی کھڑکی میں سے جھانک کر اندر دیکھے تو میں اسے نظر نہ آؤں۔ یہی دھڑکا لگا تھا کہ پیچھے سے کوئی آواز نہ دے کہ کہاں جا رہے ہو تم؟

خدا خدا کر کے انجن نے سیٹی دی۔ گارڈ نے سیٹی بجائی اور گاڑی پلیٹ فارم سے کھسکنا شروع ہو گئی۔ جب ٹرین امرتسر کے ریلوے یارڈ سے بھی گزر گئی اور شریف پورے اور رام باغ والے پھاٹک بھی نکل گئے اور ٹرین نے بھی تھوڑی اسپیڈ پکڑ لی تو میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ڈبے کا جائزہ لیا۔ ڈبہ مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک ایک سیٹ پر دو دو مسافر بیٹھے ہوئے تھے۔ اوپر برتھ پر بھی مسافر لیٹے ہوئے تھے۔ جب ٹرین رات کے اندھیرے میں کمپنی باغ اور چالیس کھوئیں والے پھاٹک سے بھی آگے نکل گئی تو مجھے یقین ہو گیا کہ اب میں کلکتے کی بارشیں، کلکتے کے جنگل اور جمنا دیوی کو دیکھ سکوں گا۔

میں کلکتے پہنچ گیا۔

اس وقت کلکتے میں بوندا باندی ہو رہی تھی۔ اسٹیشن پر اترتے ہی مجھے فضا میں ناریل اور چائے کی خوشبو آئی۔ میں اسٹیشن سے باہر نکل کر ایک جگہ سائبان کے نیچے کھڑا ہو گیا اور سوچنے لگا کہ مجھے کہاں جانا چاہیے۔ یہ میرا کلکتے میں پہلا پھیرا تھا۔ شہر کی سڑکیں میرے لیے اجنبی نہیں تھیں۔ زکریا اسٹریٹ میں میرے والد کے [illegible] والے بچوں کے پیچھے [illegible] قالین بنی اور شالوں کو چڑھانے کی دکان تھی۔ اس کے پاس جاتے ہوئے میں اس لیے گھبراتا تھا کہ وہ پیچھے گھر والوں کو خبر کر دے گا اور گھر والوں میں سے کوئی نہ کوئی آ کر مجھے پکڑ کر لے جائے گا۔ میرا دوسرا ٹھکانہ امرتسر کے اپنے ایک دوست [illegible] کا فلیٹ تھا۔ [illegible] کے والد صاحب [illegible] کا بزنس کرتے تھے۔ [illegible] میرے ساتھ آٹھویں جماعت میں پڑھا کرتا تھا۔ پھر اس کے والد صاحب اسے کلکتے لے گئے اور وہیں کسی اسکول میں اسے داخل کرا دیا۔ [illegible] بڑا اچھا گورے رنگ کا شرمیلا سا لڑکا تھا۔ پڑھائی میں بہت تیز ہوا کرتا تھا۔ گھر میں ہر وقت کتابیں پڑھتا رہتا تھا۔ میں نے سوچا کہ پہلے [illegible] کے فلیٹ پر ہی جانا چاہیے۔

میں نے ایک رکشہ پکڑا اور کلکتے کی بارش میں بھیگتے بازاروں میں سے گزرتا ہوا [illegible] کے فلیٹ والی بلڈنگ کے باہر پہنچ گیا۔ [illegible] گھر پر ہی تھا۔ مجھے دیکھ کر حیران بھی ہوا اور خوش بھی ہوا۔

مجھے دیکھتے ہی بولا۔

"گھر سے بھاگ کر آئے ہو؟"

میں نے کہا۔ "ہاں۔"

کہنے لگا۔ "میرے ابو کو نہ بتانا۔ کہہ دینا کہ میں زکریا اسٹریٹ والے رشتے داروں کے ساتھ آیا ہوں۔"

چنانچہ جب بے بے کے والد صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے انہیں یہی بتایا۔ وہ اس سے پہلے بھی مجھے ذکریا اسٹریٹ میں اپنے پھوپھا زاد کی دکان پر دیکھ چکے تھے۔ ویسے بھی بے بے کے والد صاحب اپنے کاروبار میں اس قدر الجھے رہتے تھے کہ انہیں کاروبار کے سوا کسی دوسری بات کا کم ہی ہوش ہوتا تھا۔ شام کو میں اور بے بے تال جھیل کی طرف سیر کرنے نکل گئے۔ بے بے نے پوچھا۔

"اسکول سے چھٹی لے کر آئے ہو کیا؟"

میں نے کہا۔ "یہی سمجھو۔"

کہنے لگا۔ "تمہیں اپنی پڑھائی کا حرج نہیں کرنا چاہیے۔"

میں نے کہا۔ "یار تم تو مجھے نصیحتیں نہ کرو۔"

بولا۔ "میں تمہارا خیرخواہ ہوں۔ اس لیے تمہیں کہہ رہا تھا آگے تمہاری مرضی ہے۔ اس بار کب تک آوارہ گردی کا ارادہ ہے؟"

میں نے کہا۔

"اس دفعہ میں چٹا گانگ کے سمندری جنگلوں کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔"

بے بے بولا۔

"اس طرف مت جانا۔ ابو کا ایک دوست کہہ رہا تھا کہ ادھر جادو ٹونہ کرنے والے بیراگی ہوتے ہیں اور جنگلوں میں ایسے ایسے زہریلے سانپ ہوتے ہیں جو اچھل کر آدمی کے ماتھے پر ڈستے ہیں۔"

میں ہنسنے لگا۔ "ایسے سانپ تو ہر جنگل میں ہوتے ہیں بلکہ شہروں میں بھی ہوتے ہیں۔ باقی رہی جادو ٹونے والی بات۔ تو میں جادو ٹونے کو نہیں مانتا۔"

بے بے نے کہا۔ "پھر بھی میں تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ چٹا گانگ کے جنگلوں کی طرف نہ جانا۔"

میں نے بے بے کو بتایا کہ میں تو وہاں جانے کا پکا ارادہ کر چکا ہوں۔ وہ خاموش ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ میں ضد کا پکا ہوں اور ایک بار میرے دل میں کسی طرف جانے کا خیال آ جائے تو میں اس کی طرف ضرور جاتا ہوں۔ اپنی اسی ضد کی وجہ سے مجھے زندگی میں فائدہ بھی بڑا ہوا اور نقصان بھی بہت پہنچا ہے۔

بے بے نے پوچھا۔

"چٹا گانگ جا کر رہو گے کہاں؟"

میں نے کہا۔

"کسی چھوٹے سے ہوٹل میں دو ایک روز کے لیے ٹھہر جاؤں گا۔ میرے پاس اس بار تھوڑے پیسے ہیں۔ اس کے بعد وہاں کے جنگلوں کی طرف نکل جاؤں گا۔"

بے بے نے میری طرف حیرت سے دیکھا۔ کہنے لگا۔

"معلوم نہیں تمہارے اندر کس خانہ بدوش کی روح حلول ہو گئی ہے۔"

تین دن کلکتے میں بے بے کے پاس رہنے کے بعد ایک روز میں ریل گاڑی میں سوار ہو کر چٹا گانگ روانہ ہو گیا۔ کافی لمبا سفر تھا۔ چٹا گانگ پہنچا تو شام ہو چکی تھی۔ اس زمانے میں چٹا گانگ اتنا ترقی یافتہ شہر نہیں تھا۔ سڑکیں صاف ستھری اور اونچی نیچی تھیں۔ کلکتے کے مقابلے میں یہاں ٹریفک کا رش بالکل نہیں تھا۔ بازار کشادہ تھے اور سڑکوں کی دونوں جانب فٹ پاتھوں پر ناریل اور سنبل کے گھنے درخت جھکے ہوئے تھے۔

میں نے ریلوے اسٹیشن ہی سے ایک درمیانے درجے کے ہوٹل کا پتہ معلوم کر لیا تھا۔ چنانچہ اسی ہوٹل میں ایک کمرہ لے لیا۔ رات کا کھانا کھا کر بازار کی سیر کرنے نکل آیا۔ بارش بند ہو چکی تھی۔ موسم بڑا خوشگوار تھا۔ ریستورانوں میں بنگالی گانوں کی ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔ کچھ دیر گھومنے پھرنے کے بعد میں ہوٹل میں واپس آ گیا۔ رات کو جلدی سو گیا۔ صبح کافی دن چڑھے آنکھ کھلی۔ نیچے آ کر چائے وغیرہ پی۔ ہوٹل کا مالک ایک سکھ سردار جی تھا۔ میں اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے پوچھا۔

"کہاں سے آئے ہو لڑکے؟"

میں نے جب امرتسر کا بتایا تو خوش ہو گیا۔

"تم تو ہمارے گورو جی کی نگری کے رہنے والے ہو۔ ادھر کیا لینے آئے ہو؟"

میں نے اسے صاف صاف بتا دیا کہ مجھے اس طرف کے جنگلات دیکھنے کا بہت شوق ہے اور یہی شوق مجھے یہاں کھینچ لایا۔

سردار بڑا حیران ہوا۔ کہنے لگا۔

"او تمہاری ابھی عمر ہی کتنی ہے اور تم جنگلوں کی سیر کرنے جا رہے ہو۔ تمہیں معلوم ہے یہاں کے جنگل کتنے خطرناک ہیں؟"

میں نے کہا۔

"جی سردار جی! آپ بے فکر رہیں۔ میں گھر سے یہی ارادہ لے کر نکلا ہوں اور اس علاقے کے جنگل دیکھ کر ہی واپس جاؤں گا۔"

جب سردار کو یقین ہو گیا کہ میں پیچھے ہٹنے والا نہیں ہوں اور ہر حالت میں اپنی ضد پوری کر کے رہوں گا تو کہنے لگا۔

"تم ہمارے گورو جی کی نگری کے رہنے والے ہو۔ میں نہیں چاہوں گا کہ تمہیں کوئی نقصان پہنچے۔ ٹھیک ہے۔ کاکس بازار کے اندرونی جنگل میں میرا ایک دوست بشن سنگھ ٹھیکیدار رہتا ہے۔ وہ درختوں کی کٹائی اور چیرائی کا کاروبار کرتا ہے۔ یہ درختوں کی کٹائی کا سیزن ہے۔ آج کل وہ وہیں پر ہے۔ میں تمہیں اس کے نام خط لکھ دوں گا۔ تم اس کے پاس چلے جاؤ۔ وہاں رہ کر تم ادھر کے جنگلوں کی سیر کر سکو گے۔"

سردار جی نے مجھے بڑا اچھا موقع بہم پہنچا دیا تھا۔ میں بھی یہی چاہتا تھا۔ چنانچہ چٹا گانگ میں دو دن سیر کرنے کے بعد میں کاکس بازار کی طرف روانہ ہو گیا۔ سردار جی نے مجھے اپنے دوست بشن سنگھ کے نام ایک خط لکھ کر دے دیا تھا۔ کاکس بازار وہاں سے کافی دور واقع تھا۔ ایک چھوٹے سے جنکشن اسٹیشن تک میں نے چھوٹی لائن کی ریل گاڑی میں سفر کیا۔ اس کے بعد ایک کھڑکھڑاتی ہوئی مسافروں سے بھری بس میں بیٹھ کر کاکس بازار پہنچا۔ سردار جی نے مجھے پورا نقشہ بنا کر دے دیا تھا کہ کہاں کہاں سے مجھے جانا ہوگا۔ میں نقشے کے مطابق ایک بیل گاڑی پر سفر کرتا جنگل میں اس جگہ پہنچ گیا جہاں بشن سنگھ ٹھیکیدار کی آرا مشینیں کٹائی کا کام کر رہی تھیں۔ علاقے کے مزدور بھی کام میں لگے تھے۔ میں نے ایک مزدور سے بشن سنگھ کا پوچھا تو اس نے لکڑی اور بانس سے بنے ہوئے ایک کوارٹر کی طرف اشارہ کیا۔ لکڑی اور بانس کا یہ کاٹیج نما کوارٹر زمین سے کوئی چار فٹ بلند ایک چٹان پر بنا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں کوارٹر کے برآمدے میں سردار بشن سنگھ کے سامنے بانس کے صوفے پر بیٹھا تھا اور بشن سنگھ وہ خط پڑھ رہا تھا جو مجھے چٹا گانگ والے سردار جی نے دیا تھا۔ خط پڑھ کر بشن سنگھ نے اوپر سے نیچے تک میرا جائزہ لیا اور بولا۔

"کیا تم جنگل میں شکار کرنا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا۔

"جی نہیں! میں صرف جنگلوں کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔"

بشن سنگھ کہنے لگا۔

"بھئی واہ۔ یہ جنگل کوئی لاہور کا چڑیا گھر نہیں ہے

کر تم اس کی سیر کرتے پھرو گے۔ یہ تو سندر بن کے جنوبی جنگل ہیں۔ یہاں دنیا کے سب سے زیادہ خونخوار شیر چیتے اور زہریلے سانپ رہتے ہیں۔ میری مانو اور ایک دو دن یہاں رہ کر واپس چلے جاؤ۔"

میں نے کہا۔

"سردار جی آپ میں اتنی دور سے یہاں آیا ہوں۔ کم از کم ایک آدھ دن تو مجھے جنگل کی سیر کر لینے دیں۔ پھر واپس چلا جاؤں گا۔"

بشن سنگھ کچھ سوچ کر کہنے لگا۔

"اس وقت تو دن ڈھل رہا ہے۔ کل صبح تمہیں ایک آدمی کے حوالے کر دوں گا۔ وہ تمہیں جنگل کی سیر کرا دے گا۔"

شام ہوئی تو سردار بشن سنگھ دو جنگلی مرغیاں شکار کر کے لے آیا۔ نوکر نے انہیں پکایا۔ ساتھ چاول اور ساگ تھا۔ کھانے کے بعد میری چارپائی بانس کے بنے ہوئے ایک جھونپڑے کے باہر برآمدے میں ڈال دی گئی۔ کچھ فاصلے پر درختوں کے نیچے الاؤ روشن کر دیا گیا۔ سردار بشن سنگھ نے بتایا کہ یہ آگ رات کو اس لیے روشن رکھی جاتی ہے کہ کوئی درندہ ادھر کا رخ نہ کرے۔

رات ہوئی تو جنگل میں گہری خاموشی چھا گئی۔ آدھی رات کے وقت جبکہ میں ابھی جاگ رہا تھا دور سے شیر کی دہاڑ سنائی دی۔ بنگالی نوکر نے مجھے آ کر کہا۔

"باؤ شیر بول رہا ہے۔ کوئی پتہ نہیں ادھر آ جائے۔ چارپائی اندر کر لو۔"

میں چارپائی جھونپڑی کے اندر لے گیا اور دروازہ بند کر لیا۔ کچھ دیر تک شیر کے گرجنے کی گونج سنائی دیتی رہی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ جانے کس وقت میں سو گیا۔ صبح اٹھا تو کافی دن نکل آیا تھا۔ میں اٹھ کر درختوں کے نیچے پھرنے لگا۔ جہاں گھاس اور جھاڑیوں کے اوپر درختوں کی چھاؤں نہیں تھی وہاں جھاڑیوں کے پتے اور گھاس شبنم میں تر ہو رہی تھی۔ گھاس میں قسم قسم کے چھوٹے بڑے پھول کھلے ہوئے تھے۔ دھوپ کی سنہری کرنیں درختوں کی شاخوں میں سے ترچھی ہو کر آ رہی تھیں۔ کئی درختوں پر ابھی تک چڑیاں اور پرندے بول رہے تھے۔ فضا پاکیزہ اور شفاف تھی۔ ہوا ابھی شبنم میں بھیگی ہوئی تھی۔ بعض درخت اتنے اونچے تھے کہ سر اٹھا کر دیکھنے سے بھی چوٹیاں نظر نہیں آتے تھے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد سردار جی نے ایک دبلا پتلا بنگالی میرے ساتھ کر دیا کہنے لگے۔

"یہ بھولا ہے۔ یہ تمہیں اپنے ساتھ لے کر جنگل کی سیر کرائے گا۔ میں نے اسے سب کچھ سمجھا دیا ہے۔ تم بھی جنگل میں زیادہ دور جانے کی کوشش نہ کرنا۔"

بنگالی ملازم جس کا نام بھولا تھا میرے آگے آگے چل پڑا۔ اس کے ہاتھ میں ایک نیزہ تھا۔ جب ہم کٹائی کے علاقے سے نکل کر ایک دوسرے جنگل میں داخل ہوئے تو میں نے بھولا سے پوچھا۔

"بھولا میں نے سنا ہے بنگال میں جادو ٹونہ کرنے والے بیراگی سادھو بھی ہوتے ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟" بھولا بولا۔

"بیراگی لوگ بہت کم جادو ٹونہ کرتے ہیں لیکن یہاں کے سپیرے بڑے زبردست جادو ٹونہ کرتے ہیں۔ بعض سپیروں کے پاس ایسی ناگنیں ہیں جو دن کے وقت سانپ کی شکل میں پٹاری میں بند رہتی ہیں اور رات کو عورت بن جاتی ہیں۔"

(باقی آئندہ)